TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224375
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. سبرس / ۸۹۱۵۴۳۰ ص Accession No. ۲۲ جلد

Author ۱۹۵۸ء

Title سبرس

This book should be returned on or before the date last marked below.

OCT 1963

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدر آباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش

جنوری ۱۹۵۸ء

جلد (۲۲)۔ شمارہ (۱)

نگران

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

جانکی پرشاد

قیمت
پچاس پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے سکۂ ہند
ششماہی " تین " "

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے "نیشنل فائن پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

ادارۂ ادبیات اردو سے متعلق دوسرے معلوماتی کتابچے

(۱) سرگذشت ادارہ (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء)
(۲) ادارہ ۱۹۴۱ء
(۳) " ۱۹۴۲ء
(۴) " ۱۹۴۳ء
(۵) " ۱۹۴۴ء
(۶) " ۱۹۴۵ء و ۱۹۴۶ء
(۷) " ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء
(۸) ادارۂ ادبیات اردو کے گذشتہ تیئیس ۲۳ سال (بزبان اردو)
(۹) " " " (بزبان انگریزی)
(۱۰) ادارہ، اس کے مقاصد اور مصروفیات (" ")
(۱۱) کتابچۂ معلومات اردو انسائیکلو پیڈیا
(۱۲) قواعد و ضوابط و نصاب نامہ اردو امتحانات
(۱۳) قواعد و ضوابط شعبہ طلباء
(۱۴) تبصرہ ۱۹۴۳ء کی مصروفیات ادارہ پر از معتمد عمومی ادارہ
(۱۵) روئیداد اردو امتحانات بابت ۱۹۴۰ء از صدر مجلس اردو امتحانات
(۱۶) " " " ۱۹۴۱ء
(۱۷) " " " ۱۹۴۲ء
(۱۸) " " " ۱۹۴۴ء
(۱۹) ادارہ ادبیات اردو ۱۹۵۵ء میں
(۲۰) " " ۱۹۵۶ء میں

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر
خیرت آباد۔ حیدر آباد دکن

فہرست

۱۔ خلاصہ	مہتمم ادارہ	۴
۲۔ گورنر آندھرا پردیش ادارہ میں		۵
۳۔ تعارف ادارہ	نواب لیاقت جنگ بہادر صدر ادارہ	۶
۴۔ تقریر	ہز اکسلنسی شری بھیم سین سچر گورنر آندھرا	۹
۵۔ وزیر فینانس ادارہ میں		۱۰
۶۔ تقریر استقبالیہ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معتمد عمومی	۱۱
۷۔ تاثرات	ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی وزیر فینانس آندھرا	۱۴
۸۔ محفل شعر و سخن (باعزاز خواجہ غلام السیدین صاحب۔ معتمد تعلیم حکومت ہند)		۱۶
۹۔ ادارے کی خدمات	رسالہ پی۔ ای۔ این بمبئی	۱۷
۱۰۔ علمی و ادبی کلچرل مصروفیات		۱۸
۱۱۔ ریسرچ فیلو شپ		۲۸
۱۲۔ دفاتر آندھرا میں اردو کی مفت تعلیم		۲۹
۱۳۔ علمی و ادبی تعاون		۳۳
۱۴۔ معاصرین کے تاثرات ادارے کے بارے میں		۳۸
۱۵۔ ادارے کی مطبوعات		۳۹
۱۶۔ کتب خانہ اور دارالمطالعہ	مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب معتمد کتب خانہ	۴۶
۱۷۔ امداد و اعانت		۴۹
۱۸۔ نتائج اردو امتحانات	مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد معتمد اردو امتحانات	۵۲
۱۹۔ تنقیح شدہ حسابات		۵۴
۲۰۔ ادارے کی مجلس انتظامی اور شعبوں کے معتمدین		۵۵
۲۱۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے انتظامات		۵۶

خلاصہ

ادارۂ ادبیات اردو نے ۱۹۵۷ء میں اپنے محدود وسائل سے اردو زبان اور ادب کی جو خدمات انجام دیں ان کا اندازہ آئندہ صفحات کے ملاحظہ سے ہوسکے گا۔ ذیل میں بطور خلاصہ چند اہم امور درج ہیں۔

(۱) اس سال ادارے کی عمارت کی تعمیر کا کام تیزی سے انجام پاتا رہا اور ختم سال سے قبل یہ عمارت پوری ہو گئی اور سب چھتیں پڑ گئیں۔ اب مینار کا گنبد، استرکاری، فرش اور دروازوں کی تکمیل ہو رہی ہے۔

(۲) آندھرا کے دفاتر کرنول سے حیدرآباد منتقل ہوئے تو غیر اردو داں ملازمین سرکاری کو اردو پڑھانے کا مفت انتظام کیا گیا۔

(۳) تعلیم بالغان کا کام جاری رہا اور اردو عالم، اردو زباندانی اور اردو دانی کے امتحانات حسب سابق لئے گئے۔

(۴) ادارے نے ۱۹۵۷ء میں حسب ذیل کتابیں شائع کیں:۔

۱۔ حیدرآباد کے بڑے لوگ — از غلام پنجتن صاحب شمشاد
۲۔ میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام — از ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی
۳۔ سروجنی نائیڈو — از وزیر حسن صاحب
۴۔ مہاتما گاندھی — از خورشید احمد جامی صاحب
۵۔ تذکرہ مخطوطات (جلد سوم) — از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور
۶۔ اردو میں سائنسی ادب (قدیم ترین کارنامے) — از خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
۷۔ طالب و موہنی از سید محمد والہ موسوی — مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب
۸۔ اردو دانی۔ حصہ اول (طبع ثانی) — از مولوی اظہر الدین صاحب

(۵) ادارے کا ترجمان سب رس پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

(۶) ادارے کی ریسرچ فیلو رشیدہ موسوی صاحبہ نے اپنے مقالے کی تکمیل کی۔

(۷) ادارے میں متعدد علمی و ادبی اجتماع ہوئے اور شعر و سخن کی محفلیں منعقد کی گئیں۔ ان کے علاوہ حسب معمول انتظامی اور کاروباری کمیٹیاں بھی ہوتی رہیں۔

(۸) ادارے کی طرف سے یوم محمد قلی قطب شاہ منانے کے انتظامات اعلیٰ پیمانے پر شروع کئے گئے۔

(۹) ادارے کے کتب خانہ میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا خاطر خواہ اضافہ ہوا اور دارالمطالعہ سے استفادہ کرنے والوں میں بھی اضافہ رہا۔

مہتمم ادارہ

شری بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش ادارہ ادبیات اردو میں

تقریر فرما رہے ہیں

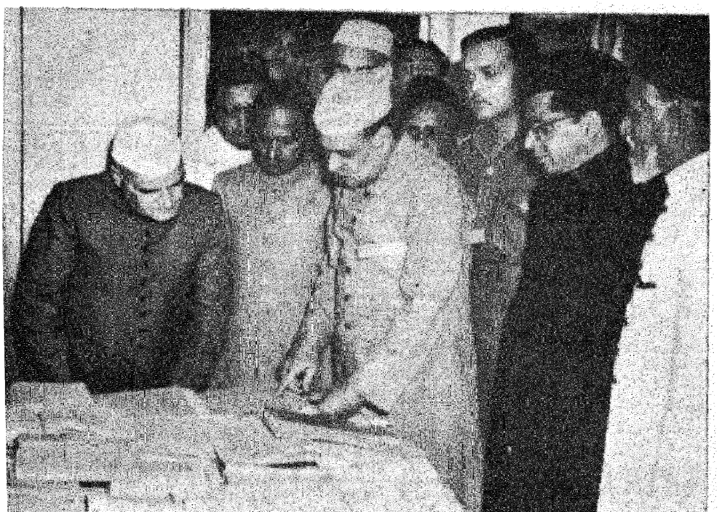

مخطوطات کا معاینہ فرما رہے ہیں

گورنر آندھرا پردیش ادارے میں

چہارشنبہ ۲۵ر ڈسمبر شام کے چار بجے ہز اکسلنسی شری بھیم سین سچر صاحب گورنر آندھرا پردیش ادارہ ادبیات اردو کے معائنہ کے لئے تشریف لائے۔ اس موقع پر ادارے کے جملہ ارباب کار اور حیدرآباد کے اکثر ادیب اور شاعر ادارے میں مدعو تھے۔ جن میں مولوی حبیب الرحمن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو، جانکی پرشاد صاحب معتمد انڈین کانفرنس آف سوشیل ورکس، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، نواب ناظر یار جنگ بہادر سابق چیف جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ، رائے دیویال صاحب، محمد حسین خاں صاحب انجنیر عمارت ادارہ، رمن راج سکسینہ صاحب ایڈوکیٹ، مرزا ضامن علی صاحب غازی، حفیظ صدیقی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری محکمہ قانون، مولانا علی اصغر بلگرامی صاحب سابق صوبہ دار اورنگ آباد، پروفیسر مجید صدیقی، مولوی محمد عبدالوہاب صاحب معتمد سالار جنگ اسٹیٹ کمیٹی، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، قاضی داور حسین صاحب صدر چیمبر آف کامرس، رام دین دیال صاحب، زین العابدین رضوی صاحب مہتمم سالار جنگ میوزیم، مسز عاصمہ کمال لکچرار ٹیچرس ٹریننگ کالج، نواب میر باسط علی خاں صاحب سابق جج ہائی کورٹ، مولوی انوار اللہ صاحب سابق چیف انجنیر، مس شمیت ریسیرچ اسکالر مدراس، مسعود احمد رضوی صاحب سالار جنگ میوزیم، شیخ محمد صاحب ایڈیٹر بھارت نیوز، مولانا حافظ محمد حامد صاحب لکچرار اردو نظام کالج، اکبرالدین صدیقی صاحب لکچرار اردو سٹی کالج، خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد لکچرار اردو چادر گھاٹ کالج، مرزا دوست علی اشرف صاحب لکچرار سیف آباد کالج، میر حسن صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو گولکنڈہ، مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب، میر اقبال علی خاں صاحب ناظم تعمیرات، مسٹر انوراللہ سابق چیف سکریٹری تعمیرات، خیرات ندیم صاحب، اقبال متین صاحب، مرزا حامد علی آغا صاحب، نواب ناصرالدین صاحب ڈپٹی کلکٹر تلنگسگور، میر معظم علی خاں صاحب، میر رضا علی خاں صاحب، سردار احمد علی صاحب، حبیب ابراہیم صاحب، محمد عبدالجبار صاحب، مختار حسین خاں صاحب، غلام دستگیر صاحب سکندرآباد، محمد علی خاں صاحب، سید محی الدین صاحب، میر اعظم علی خاں صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

گورنر صاحب نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور حیدرآباد میں اردو بولنے والوں کے تناسب، اردو کے آغاز و ارتقاء، دنیا کی زبانوں سے اردو کا تعلق اور ادارہ کی شاخوں سے متعلق نقشوں کو دلچسپی سے دیکھا۔ ادارے میں پنجابی زبان کے جو مخطوطات ہیں ان کو دیر تک پڑھا اور مرزا داغ کی اصلاحیں اور علامہ اقبال کے خطوط غور سے دیکھے۔ ادارے کی زیر تعمیر عمارت کا بھی معائنہ فرمایا۔ جس کے بعد جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ جملہ حاضرین کا تعارف کرایا گیا۔ گورنر صاحب نے ہر ایک سے خندہ پیشانی سے گفتگو فرمائی۔ شہ نشین پر تشریف رکھنے کے بعد نواب لیاقت جنگ بہادر (سابق وزیر فینانس) صدر ادارۂ ادبیات اردو نے گورنر صاحب کو پھول پہنائے اور اس کے بعد ایک تعارفی تقریر کی۔ گورنر صاحب نے اس کا جواب دیا جس کے بعد حاضرین کی چائے سے تواضع کی گئی۔ اس اثناء میں گورنر صاحب نے بچوں کو بلاکر ان سے گفتگو کی عصرانہ کے بعد گورنر صاحب ہر ایک کا سلام لیتے اور سلام کرتے ہوئے واپس تشریف لے گئے۔

تعارف ادارہ

فضیلت مآب جناب گورنر صاحب ۔ خواتین و حضرات!

ادارہ ادبیات اردو کے صدر کی حیثیت سے میں جملہ کارکنان ادارہ کی طرف سے جناب والا کا اس ادارے میں دلی خیرمقدم کرتا ہوں اور شکرگزار ہوں کہ جناب نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس ادارے کا معائنہ فرمانے کی دعوت کو شرف قبولیت بخشا اور ہم سبھوں کی عزت افزائی فرمائی۔

ادارہ ادبیات اردو ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب نے کسی سرکاری یا درباری امداد سے مستغنی رہ کر یہ ادارہ قائم کیا اور بہت جلد چند ایسے ہم خیال پیدا کرلئے جن کی تائید اور جدوجہد کی وجہ سے یہ ادارہ رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا اور حیدرآباد کے عوام اور علم دوست اصحاب اس کے قدرداں بن گئے۔ اس کے پہلے صدر اور میرے پیشرو ڈاکٹر سر مہدی یار جنگ مرحوم نے سالہا سال تک ذاتی دلچسپی لے کر اس کو بہت کچھ پروان چڑھایا۔ سر اکبر حیدری نے اس کی خاطر خواہ مدد کی اور وزیر فینانس غلام محمد مرحوم نے معائنہ کے بعد اس کو دس ہزار سالانہ کی سرکاری امداد بھی جاری کی جو پولیس ایکشن کے بعد بھی کسی قدر کمی کے ساتھ جاری رہی لیکن آندھرا پردیش کے قیام کے بعد سے یہ امداد بند ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ادارہ کچھ نہ کچھ کام کئے جارہا ہے اور توقع ہے کہ جناب والا کے قدوم میمنت لزوم کے باعث اس کی سرگرمیوں میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکے گا۔

جناب والا! جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا اس ادارے نے گذشتہ ربع صدی میں حیدرآباد کے شعراء و مولفین کی ایسی ہمت افزائی کی ہے اور علم و فضل اور شعر و سخن کی ایسی فضا قائم کردی ہے کہ یہ شہر اب اپنے ایک جداگانہ دبستان ادب پر ناز کرسکتا ہے۔ مختلف موضوعوں پر ۲۵۰ کتابیں چھپوانا، مسلسل بیس سال تک ایک علمی و ادبی رسالہ سب رس جاری رکھنا، مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالروں کو پچاس روپے ماہانہ کے وظائف دینا، ایک وسیع مرکزی دارالمطالعہ

چلانا اور تقریباً پچاس شاخیں قائم کرنا جن میں سے ہر ایک ریڈنگ روم اور اردو کی تعلیم کا مرکز ثابت ہوئی ہے۔ تعلیم بالغان کا انتظام کرنا اور ہزاروں اَن پڑھوں کو پڑھا لکھا بناکر قومی بیداری میں اضافہ کرنا ایسے کام ہیں جن کے ذریعہ سے اس خطۂ ملک کی ادارے نے بڑی خدمت کی ہے۔

اردو زبان کے لئے خوشگوار پس منظر تیار کرنے کے لئے ادارے نے حیدرآباد میں کئی کل ہند کانفرنسیں بھی منعقد کیں جن میں ۱۹۴۴ء کی آل انڈیا اردو کانگریس اس زبان کی اور شہر حیدرآباد کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس میں شرکت کے لئے الہ آباد سے سر تیج بہادر سپرو، دلی سے مولوی عبدالحق، لاہور سے سر شیخ عبدالقادر، بھاولپور سے وزیر تعلیم میجر شمس الدین، بمبئی سے مسٹر عبداللہ بریلوی اور اردو دنیا کے دیگر مشاہیر مثلاً جگر مرادآبادی، سجاد ظہیر، قاضی عبدالغفار، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی وغیرہ تشریف لے آئے۔

اسی طرح تاریخ دکن کانفرنس بھی اسی ادارے نے پہلی بار منعقد کی جو بعد کو ایک علیحدہ مستقل صورت میں قائم ہوگئی۔ دکن کی تاریخ اور تمدن پر اس ادارے کی کتابیں سند کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کے ترجمے انگریزی، تلگو اور ہندی میں ہوئے اور ہوتے جارہے ہیں۔

اس ادارے کا کتب خانہ اپنے قلمی و مطبوعہ نوادر کے باعث اپنی آپ نظیر ہے۔ اس میں پانچ ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں محفوظ ہیں جن میں اردو کی قدیم ترین کتابوں کے علاوہ پنجابی، سندھی، ہندی اور فارسی و عربی کے بیش بہا مخطوطات بھی شامل ہیں۔ ان قلمی کتابوں کے تین تفصیلی تذکرے چھپ چکے ہیں۔ تیسری جلد کے لئے ہندوستان کی مرکزی ساہتیہ اکاڈیمی نے رقمی مدد دی تھی اور ابھی ہر نومبر کے اجلاس انتظامی میں جس کی صدارت ہمارے ملک کے ہردلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کی تھی چوتھی جلد کی طباعت کے لئے بھی ساہتیہ اکاڈیمی سے رقمی منظوری مل چکی ہے۔

اس کتب خانہ میں مخطوطات کے علاوہ نادر مطبوعہ کتب تقریباً پندرہ ہزار جمع ہو چکی ہیں اور ان میں سے پانچ ہزار کتابوں کی ایک تفصیلی فہرست بھی جدید طرز کے فن دار اصولوں کے مطابق شائع کی جاچکی ہے۔

اس کتب خانہ کے علمی نوادر، تاریخی کاغذات، مشاہیر کی اصلی تحریروں اور خطوط کی نقلوں اور تصویروں کی فراہمی کے لئے تمام اردو دنیا سے مانگ ہوتی ہے اور ادب اور تاریخ کے طالب علم ان کے مطالعہ اور نقل کے لئے برابر آتے رہتے ہیں۔

آندھرا پردیش کے قیام کے بعد جب حیدرآباد پایہ تخت قرار پایا اور آندھرا کے عہدہ دار اور ملازمین اس شہر میں منتقل ہوئے تو ادارے نے ان سب کو اردو کی مفت تعلیم دینے کا پیش کش کیا جس کو قبول کر کے چیف سکریٹری نے بھی تمام دفاتر میں گشتی جاری کی اور کئی محکموں سے اردو پڑھانے کے انتظام کی مانگ کی گئی چنانچہ اس وقت متعدد دفتروں میں ادارہ کے کارکن اعزازی

طور پر جاتے ہیں اور سینکڑوں اصحاب کو اوقات دفتر کے بعد اردو لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں۔

ادارے کی زیر تعمیر عمارت کا بھی جناب والا نے معائنہ فرمایا ہے۔ اس کا سنگ بنیاد ڈاکٹر بی۔رام کرشنا راؤ چیف منسٹر حیدرآباد نے ۲ر نومبر ۱۹۵۵ء کو رکھا تھا۔ رقمی دشواریوں کے باعث یہ اب تک مکمل نہ ہوسکی ہے۔ حکومت ہند نے بھی اس کی تعمیر میں ۲۵ ہزار کی امداد دی تھی اور اس سے دوگنی رقم خود ادارے نے دیگر ذرائع سے جمع کر کے صرف کی ہے۔ حکومت آندھرا پردیش کی امداد ابھی وصول نہیں ہوئی ہے۔ توقع ہے کہ اس کے حصول کے ساتھ ہی یہ عمارت اس قابل ہو جائے گی کہ اس میں ادارہ منتقل ہو سکے۔

ادارہ کا شعبہ تاریخ و تمدن، دکن کی تاریخ اور آثار کی حفاظت اور تحقیق و تشہیر کا جو کام ربع صدی سے کرتا آیا ہے اس کے سلسلہ میں قیام آندھرا کے بعد ضروری معلوم ہوا کہ شہر حیدرآباد کے بانی اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی یاد منائی جائے جس نے پورے علاقہ آندھرا کے فارسی، اردو اور تلگو شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی تھی اور اپنی رعایا سے قریب ہونے اور ایک مشترکہ تمدن قائم کرنے کے لئے اپنی وضع قطع اور لباس ایسا اختیار کیا تھا جو یہاں کے ماحول کے مناسب تھا۔ وہ صحیح معنوں میں پہلا آندھرائی حکمران تھا جس نے اس ہندو مسلم ایکتا کو پروان چڑھایا جو صدیوں تک اس ملک میں باقی رہی اور حالات حاضرہ کے تحت ضروری تھا کہ اس کا احیا کیا جائے۔ ادارہ کو توقع ہے کہ اس قومی تہوار کے ذریعہ سے اہل آندھرا کو محسوس ہوگا کہ ان کے پایۂ تخت حیدرآباد کی بنیادیں کس روا دارانہ اور خوشگوار ماحول میں رکھی گئی تھیں۔

ہم سب جناب والا کے شکرگزار ہیں کہ اس تقریب کا افتتاح کرنے کی درخواست قبول فرمائی۔ ہمیں فخر ہے کہ جناب والا کی ذات میں رواداری، خدمت خلق اور تہذیب و شائستگی کی وہ جملہ صفات موجود ہیں جن پر ہندوستان فخر کرسکتا ہے اور جن کی بقا اور استحکام کے لئے یہ ادارہ اپنی بساط کے مطابق برسوں سے جد و جہد کرتا آیا ہے۔

(نواب) **لیاقت جنگ** (بہادر)
صدر مجلس انتظامی
ادارۂ ادبیات اردو

تقریر ہز اکسلنسی گورنر صاحب آندھرا پردیش

بھائیو اور بہنو! آج آپ کے درمیان آیا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے واقعی قابل قدر کام کیا ہے اور اس کا کام ہی دراصل اس کی سفارش ہے۔ خواہ کتابوں کی اشاعت کی شکل میں ہو یا رسالے کی یا قدیم اور قلمی کتابوں اور اخباروں کی حفاظت کی شکل میں ہو اس کام کی خوبی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو آپ کے کام کی اور اردو زبان سے جیسی کچھ دلچسپی ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہماری ترتیب اور نشو و نما اسی طرح ہوئی ہے جیسی آپ حضرات کی ہوئی ہوگی۔ دکن کی اردو خدمات کا تو مقابلہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں بہت کام ہوا ہے مگر یہ کہوں گا کہ پنجاب نے بھی اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ آج ہم ایک دوسرے کو نزدیک سے دیکھ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو جاننے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ ادارہ بہت اچھا کام کرتا رہا ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ آئندہ بھی اسی سرگرمی اور لگن سے ادارہ کا کام جاری رہے گا۔ مجھے تعجب ہے کہ اس سال ادارے کی امداد کیوں جاری نہیں ہوئی۔ مجھے موقع نہیں ملا۔ میں حکومت سے اس بارے میں دریافت کروں گا۔

حیدرآباد کی مہمان نوازی روکے سے نہیں رکتی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آمد کے موقع پر اس طرح کھانے پینے کی چیزوں کا اہتمام کیا جائے اور اس طرح کی زحمتیں برداشت کی جائیں۔ میں کسی پر بار نہیں بننا چاہتا۔ بہ ہر حال میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

وزیر فینانس ادارے میں

یکم نومبر ۱۹۵۷ء؁ کو ادارۂ ادبیات اردو میں آندھرا کے وزیر فینانس شعر و سخن کے دلدادہ اور اردو کے بہی خواہ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی صبح دس بجے معائنہ کے لئے تشریف لائے اور ان کے اعزاز میں ایک محفل شعر و سخن منعقد کی گئی۔ اس موقع پر ادارے کے اکثر ارباب کار معاونین اور اردو کے صاحبانِ ذوق جمع تھے جن میں مولانا سید علی اصغر بلگرامی نائب صدر مسلم اوقاف حیدرآباد و سابق صوبیدار اورنگ آباد۔ مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل انوار العلوم کالج و نائب صدر ادارہ۔ میر احمد علی خاں صاحب نائب صدر حیدرآباد پردیش کانگریس۔ گوپال راؤ ایکبوٹے صاحب معتمد دکنی ہندی پرچار سبھا۔ شاہجہاں بیگم صاحبہ ایم ایل اے و معتمد عمارت ادارہ۔ انجنی لو مترا صاحب معتمد دکش بھارت ہندی پرچار سبھا۔ جانکی پرشاد صاحب معتمد انڈین کانفرنس آف سوشیل ورکس۔ خلیل اللہ حسینی صاحب صدر مجلس تعمیر ملت۔ شیخ محمد صاحب ایڈیٹر بھارت نیوز۔ سراج الدین بابو خاں صاحب صدر کشمیر نیشنل فرنٹ۔ اشفاق حسین صاحب مددگار ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال صاحب۔ رشید قریشی صاحب ایم اے۔ رمن راج سکسینہ صاحب ایڈوکیٹ۔ جسٹس میر باسط علی خاں صاحب۔ خورشید علی بیگ صاحب لکچرار جغرافیہ۔ مرزا ضامن علی صاحب غازی صفوی کنٹراکٹر۔ سریوا لاہوتی صاحب معتمد ہندی پرچار سبھا۔ ہری لال واگھرے صاحب صدر ہندی پرچار سبھا حیدرآباد۔ فیض النساء بیگم صاحبہ رکن بلدیہ حیدرآباد۔ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ صاحبہ۔ شرف الدین صاحب سشن جج سکندرآباد۔ مولوی ابو محمود صاحب۔ مظہر حسین صاحب لکچرار ایوننگ کالج۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب۔ خواجہ حمید الدین شاہد صاحب۔ سید محمد صاحب مورخ بیدری۔ اکبر حسین صاحب ایڈوکیٹ وقارآباد۔ ڈاکٹر سید ابو الفضل صاحب۔ محمد محمود حسین صاحب لکچرار محبوب کالج۔ سلطانہ بیگم شرف الدین صاحبہ ایم اے۔ محمد عبد الوہاب صاحب سکریٹری سالار جنگ اسٹیٹ۔ اکبر الدین صدیقی صاحب لکچرار سٹی کالج۔ یوسف الدین صاحب کنٹراکٹر۔ عارف الدین حسن صاحب معتمد سوشیل سنٹرس ادارہ۔ قاضی احمد علی صاحب نصر اللہ صاحب ایم ایس سی لکچرار نظام کالج۔ منیر صفوی صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

معائنہ اور چائے نوشی کے بعد محفل شعر و سخن کا آغاز ہوا۔ ابن احمد تابؔ صاحب، خیرات ندیم صاحب۔ شمس الدین تاباں صاحب۔ معین الدین برحمی صاحب۔ مظہر الدین صاحب مظہرؔ۔ حمید الدین شاہد صاحب اور سرور ڈنڈا صاحب نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ڈاکٹر زور صاحب معتمد عمومی

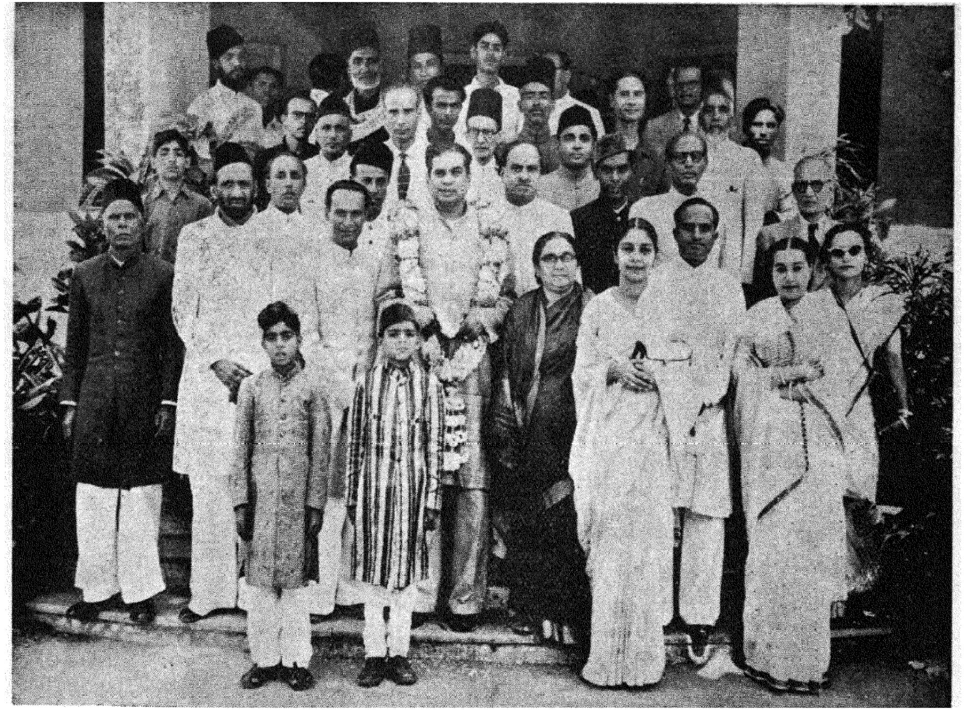

ڈاکٹر بی گوپال ریڈی وزیر فینانس آندھرا ادارے میں

پہلی صف میں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، فیض النساء بیگم، خواجہ حمیدالدین شاہد، سلطانہ بیگم
شاہجہاں بیگم، ڈاکٹر بی گوپال ریڈی، خیرات ندیم شمس الدین تاباں، سید محمد بیدری
دوسری صف میں۔ پرنسپل سید علی اکبر۔ مظہر۔ ابن احمد تاب۔ ڈاکٹر زور۔ معین بزمی۔
خواجہ نصراللہ۔

ادارہ نے حاضرین کو مخاطب کیا۔ جس کے جواب میں ڈاکٹر گوپال ریڈی صاحب وزیر فینانس نے ایک تقریر کی جو آئندہ صفحات میں درج ہے۔

تقریر معتمد عمومی ادارہ ــــــ

ڈاکٹر بی۔گوپال ریڈی اور معزز خواتین وحضرات!

ادارہ ادبیات اردو کی (۲۷) سالہ زندگی میں بہ حیثیت معتمد عمومی مجھے اکثر اس کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے کہ بڑے لوگوں کا خیر مقدم کروں۔ ان میں سے بعض علم وفن کے لحاظ سے بڑے ہوتے ہیں اور بعض اثر واقتدار کے لحاظ سے لیکن آج کی صحبت میں ایک ایسے بڑے آدمی کا خیر مقدم کر رہا ہوں جو دونوں باتوں کے لحاظ سے بڑا ہے۔ اثر واقتدار کو دیکھئے تو آندھرا پردیش کے جملہ خزانے اس کے قبضے میں ہیں اور علم وفن کو پرکھیئے تو پتہ چلے گا کہ انگریزی، تلگو، بنگالی، ہندی اور اردو جیسی وسیع زبانوں اور ان کے ادب کی گہرائیوں تک اس کی نظر پہنچتی ہے۔

حیدرآباد کے صرف ایک سالہ قیام ہی میں ڈاکٹر گوپال ریڈی نے اہل حیدرآباد کے دلوں کو مسخر کر لیا ہے۔ اپنے رعب وداب اور حکومت واقتدار کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے بے تکلف میل جول اور وسعت قلب ونظر کے باعث۔ ان کی سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالات نے ان کو حیدرآباد کی دیرینہ روایات سے بہت جلد مانوس کرا دیا اور کوئی تعجب نہیں کہ ایک وقت وہ بھی ہمارے محبوب وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی طرح امیری میں فقیری اور فقیری میں امیری کرنے لگیں۔

ڈاکٹر گوپال ریڈی صاحب ادارۂ ادبیات اردو کے نام اور کام سے اس وقت سے واقف ہیں جب کہ آندھرا پردیش قائم بھی نہیں ہوا تھا اور وہ بہ حیثیت چیف منسٹر صوبہ آندھرا حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں فرمایا تھا کہ ادارہ ضرور آئیں گے لیکن اس وقت کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اردو کے لئے اجنبی نہیں ہیں اور یہ کہ اس قدر جلد اپنے آپ کو اردو والوں کا ہمدم اور دمساز ثابت کر سکیں گے۔ آپ نے گذشتہ ماہ جامعہ عثمانیہ میں جو اردو تقریر کی ہے اس نے واضح کر دیا ہے کہ آپ محض ادب دوستی اور دکھاوے کی باتیں کرنے والے وزیر نہیں ہیں بلکہ اردو کے مسائل کو بہت سے اردو والوں سے بہتر سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ تقریر ہند و پاکستان کے رسائل وجرائد میں برابر نقل ہوتی جا رہی ہے اور اردو دنیا آپ کی نظر کی گہرائی اور حقیقت پسندی کا اعتراف کرنے لگی ہے۔

آپ یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ ادارہ ادبیات اردو کا مسلک بھی شروع ہی سے حقیقت پسندی اور خاموش خدمت گذاری رہا ہے۔ وہ نمود ونمائش اور شور وغل سے ہمیشہ دور رہا ہے اور خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے جہاں اردو زبان کی نشر واشاعت، تعلیم بالغان، سوشیل ایجوکیشن سنٹرس، اردو فیلوشپ، پچاس سے زیادہ شاخوں کے قیام اور ۱۹ سال سے مسلسل ایک رسالہ سب رس کے اجرا اور دو سو سے زیادہ مفید علمی وادبی کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دیا۔ دکن کی تاریخ اور تمدن کی حفاظت اور اس کے بہت سے تاریک پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی بھی قابل فخر

خدمت کی۔ گولکنڈہ اور حیدرآباد کی تاریخ پر اس کی کتابیں اور مضامین آج سند کا درجہ رکھتے ہیں اور انگریزی، ہندی، مرہٹی اور تلگو زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

اس کی خاموش طرز خدمت کا ایک جدید ثبوت اس واقعہ سے ظاہر ہوگا کہ جونہی آندھرا پردیش قائم ہوا اور حیدرآباد عظیم تر آندھرا کا دارالحکومت قرار پایا اور اس صوبہ کے تمام دفاتر یہاں منتقل ہوئے اور ان میں کام کرنے والے اصحاب حیدرآباد آئے تو ان میں سے بہت سوں کو اپنی دفتری ضرورتوں اور حیدرآبادی سوسائٹی کی دیرینہ روایتوں سے واقفیت کے لئے اردو کا جاننا ضروری معلوم ہوا۔ چنانچہ بعض اصحاب نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کا اظہار بھی کیا۔

ادارے نے اوائل جنوری ۱۹۵۷ء میں آندھرا پردیش کے تمام وزیروں، معتمدوں، صدور دفاتر اور نظماء کے یہاں خطوط روانہ کئے کہ اگر آپ یا آپ کے محکمہ کے افراد اردو پڑھنا، لکھنا سیکھنا چاہتے ہوں تو ادارہ اس کے لئے اپنی مفت خدمات کی پیشکش کرتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ادارہ کی اس پیشکش کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا اور معلوم ہوا کہ آندھرا کی حکومت، عہدہ دار اور اہلکار سب ہی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ چیف سکریٹری نے اپنی طرف سے بھی ایک گشتی مراسلہ حیدرآباد کے تمام دفاتر کو ادارے کی پیشکش کی نقل کے ساتھ ارسال کیا اور کئی دفتروں مثلاً طبابت، تعمیرات، زراعت، منصوبہ بندی وغیرہ سے اردو پڑھانے والوں کی مانگ کی گئی اور ادارے نے ہر دفتر کے لئے اردو پڑھانے والوں کا انتظام کیا۔ چنانچہ اس وقت کئی سو اصحاب اپنے اپنے دفتروں ہی میں بعد اوقات دفتر اردو پڑھ رہے ہیں اور توقع ہے کہ ادارے کے جو اردو امتحانات ڈسمبر میں لئے جائیں گے ان میں یہ لوگ شریک ہوکر اردو دانی کی سند حاصل کرسکیں گے۔ شاید اس کا اظہار غیر ضروری نہ سمجھا جائے گا اگر یہ بتایا جائے کہ اردو امتحانات میں ہم نے ۱۹۴۰ء ہی سے تلنگی، مرہٹی، کنڑی اور ہندی کے پرچے شامل رکھے ہیں۔

آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ جو ملازمین آندھرا دفاتر اردو پڑھ رہے ہیں ان میں بعض ایسے مسلمان بھی ہیں جن کو اردو نہیں آتی۔ یہ ایک مزید ثبوت ہے اس بات کا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔

ادارے کی ایک اور خاموش اور ٹھوس خدمت اس کا بے مثال کتب خانہ ہے جس میں اردو کی قدیم ترین کتابیں اور تاریخ آندھرا کے بیش بہا نوادر محفوظ ہیں۔ اس میں تقریباً پانچ ہزار قلمی کتابیں ہیں جن کے تین تفصیلی تذکرے تقریباً پندرہ سو صفحات میں شائع ہو چکے ہیں اور علمی اور تحقیقاتی دنیا میں مقبول اور مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی تیسری جلد کی تیاری و اشاعت کے لئے ہندوستان کی نیشنل اکاڈیمی آف لٹرز یعنی ساہتیہ اکاڈمی نے رقمی مدد دی تھی۔ چنانچہ یہ جلد دو ماہ قبل شائع ہو چکی ہے اور توقع ہے کہ ہر سال اسی طرح کی ایک جلد چھپتی رہے گی۔ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں تقریباً تیرہ ہزار کتابوں کا بھی سرمایہ جمع ہو چکا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی تفصیلی فہرست کی پہلی جلد بھی چھپ چکی ہے جن میں پانچ ہزار کتابوں اور تقریباً اتنے ہی رسالوں کا حال درج ہو چکا ہے۔

قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ادارے میں ہزاروں تاریخی کاغذات اور مشاہیر کی اصلی تحریریں اور

خطوط بھی اہتمام کے ساتھ محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ ان نادر کتابوں کے اجزا اور کاغذات کی نقلیں اور فوٹوز کی فراہمی کی ہندوستان اور پاکستان کے محققین اردو کی طرف سے برابر مانگیں آتی رہتی ہیں اور کوئی مہینہ ایسا نہیں گذرتا جب کہ ادب و تاریخ کے کوئی نہ کوئی رسیا ان کے مطالعہ اور نقل کے لئے ادارہ نہ آتے ہوں۔

ادارے کی عمارت کا سنگ بنیاد ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے ۶ نومبر ۱۹۵۵ء کو حکیم الشعرا حضرت امجد کی دعاؤں کے ساتھ رکھا تھا۔ یہ عمارت بہت کچھ بن چکی ہے اور حکومت ہند نے بھی اس کی تعمیر میں ۲۵ ہزار روپے کی مدد دی ہے اور توقع ہے کہ حکومت آندھرا بھی اپنا حصہ ادا کرے گی جس کے بغیر یہ عمارت جلد استعمال کے قابل نہ بن سکے گی۔ آپ نے اس کا ابھی معائنہ کیا ہے اور محسوس فرمایا ہوگا کہ اس کی تکمیل کے بعد حیدرآباد کی خوبصورت عمارتوں میں ایک اچھا اضافہ ہوگا اور یہ ادارہ اپنے دار المطالعہ، ریفرنس روم، پکچر گیالری، ریسرچ اسکالروں کے لئے گیسٹ ہاؤس اور کتب خانہ کے قلمی اور مطبوعہ شعبوں کی ترتیب و تہذیب کے لحاظ سے علمی و تحقیقاتی اداروں کے لئے ایک نمونہ ثابت ہوگا۔

گذشتہ سال جب سے وشال آندھرا کے قیام کی چہل پہل حیدرآباد میں شروع ہوئی خیال تھا کہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، شہر حیدرآباد کے بانی اور آندھرا کے ایک قدیم اور محبوب حکمراں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد اعلیٰ پیمانے پر منائی جائے۔

سالہا سال سے میں یہ کوشش کرتا آیا ہوں کہ محمد قلی کے تلگو کلام اور تلگو ادب کی سرپرستیوں کو اجاگر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں تلگو کے متعدد شاعروں اور ادیبوں سے گفتگو کی اور آج سے پندرہ بیس سال قبل اپنے دوست اور اس وقت کے ساتھی پروفیسر رایہ پرولو سبا راؤ صاحب سے پوتی کنتی تیلگینا کی کتاب یایتی چرتر پر مضمون لکھوا کر ادارے کے ترجمان ماہنامہ سب رس میں شائع کرایا تھا۔ اس کے بعد پروفیسر لکشمی رنجن کو اس کام کی طرف متوجہ کیا اور گذشتہ سال ہی چادرگھاٹ کالج کے ایک جز وقتی لکچرار تلگو سری انند موہن سے قطب شاہ کی قدردانی تلگو شعر و ادب پر ایک مضمون لکھوایا جو کالج کے مجلہ فکر نو میں شائع ہوا ہے لیکن اس اثناء میں ادارے کی عمارت کی تعمیر و تکمیل کے باعث اتنی مصروفیت رہی کہ محمد قلی قطب شاہ کی پیدائش کی تاریخ ۱۴ اپریل کو یہ تقریب منائی نہ جاسکی آخرکار گذشتہ ہفتہ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی سے ملاقات میں اس کا قطعی تصفیہ ہوا کہ اس کی تاریخ وفات ۱۱ جنوری ہی کو یہ تقریب منائی جائے۔ چنانچہ اس کے انتظامات شروع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی نے اپنے طبعی انکسار کے باعث اس کے انتظامات کی کمیٹی کا صدر رہنے کی جگہ نائب صدر رہنے پر اصرار کیا اور مشورہ دیا کہ نواب زین یار جنگ بہادر کو صدر بنایا جائے۔

نواب زین یار جنگ بہادر نے ادارے کی طرف سے ۱۳ سال قبل کل ہند اردو کانگریس کا انتظام جس اعلیٰ پیمانے پر کیا تھا اس کا اعتراف پوری اردو دنیا کر چکی ہے اور ادارے کو یقین ہے کہ یوم محمد قلی بھی شایان شان طور پر منعقد ہو سکے گا اور ۱۱ جنوری کا دن حیدرآباد کے بین قومی تہواروں میں ایک مقبول تہوار ثابت ہوگا۔

تاثرات وزیر فینانس

میں آج ادارے میں آکر اور اس کے مختلف شعبوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کتب خانۂ دار المطالعہ اور دوسرے کاموں کو بھی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے حیدرآباد آکر گیارہ مہینے ہو گئے۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ آج سے پہلے ادارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے عمارت کا نقشہ بھی دیکھا۔ اگرچہ وہ سمنٹ اور اینٹ کا ایک خواب تھا لیکن اب حقیقت بنتا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو عمدہ کام آپ کر رہے ہیں اس کے لئے ایک اچھی عمارت بہت جلد تیار ہو جائے گی۔ حکومت کے پاس مناسب اور صحیح طریقہ پر نمائندگی کی جائے تو مجھے امید ہے کہ وہ اس کام میں ضرور مدد کرے گی۔ غالباً آپ سب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ فینانس کا محکمہ ہمیشہ "نہیں" کہتا ہے۔ وہ ان تین لفظوں یعنی "نہیں۔ اب نہیں۔ اور کبھی نہیں" کہنے کا عادی ہے۔ لیکن اگر محکمۂ تعلیمات کی سفارش کے ساتھ کارروائی پیش ہو تو جتنا ہو سکتا ہے مدد کی جائے گی۔

آج ادارہ دیکھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں ایک دریچے میں سے حیدرآباد کے ماضی کو تین چار سو سال تک دیکھ رہا ہوں۔ اردو ہندوستان کی دوسری زبانوں کی نسبت کرتے ایک کم عمر زبان ہے لیکن وہ بہت جلد مقبول ہو چکی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جغرافیائی سرحدوں میں محدود نہیں ہے۔ اس نے کسی زبان کو کمزور نہیں کیا بلکہ ایک طرح سے مختلف زبانوں کو اپنے اثرات سے مالدار کیا ہے۔ اور ان زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کی۔ جب ہم روسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے ادب اور شاعری کو سمجھنے میں دلچسپی لیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنی ملکی زبان "اردو" کے سیکھنے میں پس و پیش کیا جائے۔ اردو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی۔ پھلی پھولی اور پروان چڑھ رہی ہے۔ اب یہ اردو والوں کا کام ہے کہ اس کی گرامر اور انداز بیان کو آسان سے آسان بنائیں اور ہندی سے قریب کر دیں۔ اسی طرح ہندی والوں کا یہ کام ہے کہ وہ اردو کے قریب آجائیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو بہت جلد ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان بن جائے گی۔

ادارۂ ادبیات اردو جیسے علمی مرکزوں پر کثیر تعداد میں لوگ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ تو مخصوص اہل ذوق کا ایک مرکز ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس نے زیادہ کام نہیں کیا بلکہ جو کام بھی یہاں کیا گیا اس کی

اہمیت اور قدر و قیمت دوامی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے کام ایسے ہوتے ہیں کہ وقتیہ طور پر ان کی شہرت ہوتی ہے لیکن بہت جلد لوگ ان کو بھول جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ادارہ بڑی خاموشی کے ساتھ ٹھوس خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کو اسی طرح جاری رہنا اور ترقی کرنا چاہیئے۔ آندھرا پردیش کی ساہتیہ اکاڈیمی نے بھی یہ تصفیہ کیا ہے کہ اردو نثر نگاروں اور شاعروں کی تخلیقات کے انتخابات کی دو جلدیں شائع کرے۔ یہ اکاڈیمی تلگو کی اکاڈیمی نہیں ہے بلکہ آندھرا کی ساہتیہ اکاڈیمی ہے جس کی ایک زبان اردو بھی ہے آندھرا علاقہ کے اردو ادیبوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ مگر اب تک شمالی ہند میں ان کی خاطر خواہ قدر نہیں کی گئی۔

ڈاکٹر زور نے اپنے مکان کے صحن کا بڑا حصہ ادارے کی عمارت کو بطور عطیہ دے کر بڑا ایثار کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے رہائشی مکان کی خوشنمائی دب گئی ہے۔ وہ بہت سے نوجوانوں کو کام پر لگاتے رہتے ہیں اور اب بھی اسی کام میں مصروف ہیں۔ میری خواہش ہے کہ ان کی یہ علمی و ادبی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں اور وہ اس کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیں۔ میں اپنی اور اردو کے بہی خواہوں کی طرف سے ان کی بیگم صاحبہ کا اس ایثار کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جو زمین عطیہ دی گئی ہے وہ ان ہی کی ملک ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ یہ نئی عمارت جلد مکمل ہو جائے اور علم و ادب کا ایک ایسا مندر بنے جہاں نہ صرف دکن کے صوبوں کے بلکہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے تشنگان علم و ادب آکر استفادہ کریں۔

میں اردو میں تقریر نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے اردو سے جو دلچسپی ہے اس کیلئے ضروری نہیں کہ میں ادبی اور سیاسی تقریریں بھی اسی زبان میں کیا کروں۔ میں آپ سب لوگوں کی تقریریں، شاعروں کے کلام اور ادبی مضامین کو سمجھ لیتا ہوں اور ان کا دلدادہ ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میری دیگر خدمات کی اتنی قدر و منزلت نہیں کی گئی جتنی کہ میری اردو دلچسپی کی وجہ سے کی جارہی ہے۔ اس سے میری بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

محفل شعر و سخن

(بضمن تشریف آوری خواجہ غلام السیدین صاحب معتمد تعلیم حکومت ہند)

۶ مئی شام کے ۶ بجے خواجہ غلام السیدین صاحب معتمد محکمہ تعلیم حکومت ہند ادارے کے معائنہ کے لئے تشریف لائے اور جملہ شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس موقعہ پر ادارے کے اکثر ارباب کار، ارکان اور معاونین شریک محفل رہے جن میں سید علی اکبر صاحب نائب صدر ادارہ و پرنسپل انوار العلوم کالج، مولوی فیاض الدین صاحب چیف ٹاون پلانر اور آرکٹکٹ عمارت ادارہ، مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب رکن مجلس انتظامی، مولوی عارف الدین حسن صاحب سکریٹری سوشیل ایجوکیشن سنٹرز ادارہ، مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب لکچرار اردو و معتمد کتب خانہ، محترمہ شاہجہاں بیگم صاحبہ ایم ایل اے و معتمد مجلس عمارت ادارہ، حکیم الشعرا حضرت سید احمد حسین صاحب امجد، جناب شاہد صدیقی صاحب، مولوی محمد حسین خاں صاحب کنسلٹنگ انجنیر ادارہ، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب، نواب میر باسط علی خاں صاحب جج ہائیکورٹ، ڈاکٹر رحیم الدین کمال رنٹ کنٹرولر، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، محترمہ جہاں بانو بیگم صدر شعبہ اردو زنانہ کالج، محمد بن عمر صاحب ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ، وحید اختر صاحب ایم۔ اے، سلیمان اریب صاحب ایڈیٹر صبا، مولوی شیخ محمد صاحب ایڈیٹر بھارت نیوز، مولانا حافظ محمد مظہر صاحب، مولوی شرف الدین صاحب سشن جج، س۔ا۔ عشرت صاحب، سردر ڈنڈا صاحب، سعادت نظیر صاحب ایم۔ اے، مولوی خواجہ حمید احمد صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی، مولوی احمد حسین خاں صاحب لکچرار عربی نظام کالج، ڈاکٹر سید ابو الفضل صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ، مولوی مظہر حسین صاحب لکچرار تاریخ، محمد مصلح الدین صدیقی صاحب پروفیسر سوشیالوجی زراعتی کالج، مسز عاصمہ کمال ایم۔ اے لکچرار ٹریننگ کالج حیدرآباد۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون لکچرار اردو مہارانی کالج میسور، پروفیسر محمد خاں مہاراجہ کالج میسور، سرینواس راؤ صاحب سوپروائزر عمارت ادارہ، ہاشم حسن سعید صاحب، حبیب ابراہیم صاحب، اشفاق حسین صاحب ایم۔ اے، سردار کرتار سنگھ صاحب دگل، محمود حسین صاحب لکچرار انگریزی، افضال احمد قادری صاحب لکچرار ریاضی، نواب عبد الرحمٰن شریف صاحب، مولوی مراد علی صاحب طالع، مولوی کرم اللہ خاں صاحب نائب معتمد اطلاعات وظیفہ یاب، سرینواس لاہوٹی صاحب، زکی الدین صاحب ریڈر طبیعیات سٹی کالج، مولوی غلام رسول صاحب مولف فہرست کتب خانہ ادارہ، سلطانہ بیگم شرف الدین صاحب ایم۔ اے قابل ذکر ہیں۔

جناب خواجہ غلام السیدین صاحب معتمد محکمہ تعلیمات حکومت ہند
ادارے کے مختلف شعبوں کا معاینہ کر رہے ہیں -

معائنہ کے بعد جملہ شرکائے محفل کا معزز مہمان سے تعارف کرایا گیا۔ ایک محفل شعر وسخن حکیم الشعراء حضرت امجد حسین صاحب امجد کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں خود حضرت امجد کے علاوہ شاہد صدیقی صاحب، سلیمان اریب صاحب، سعادت نظیر صاحب، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید صاحب، وحید اختر صاحب، س۔ ا۔ عشرت صاحب اور سرور ڈنڈا صاحب وغیرہ نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ تقریب خوشی کے بعد یہ پر لطف محفل برخاست ہوئی۔

جناب خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیم حکومت ہند نے اپنے تاثرات کے طور پر ڈاکٹر زور صاحب سے فرمایا کہ اتنا کام کرنے کے بعد کوئی شخص فخر سے کہہ سکتا ہے کہ ؎ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

رسالہ پی ای این میں ادارے کی خدمات کا اعتراف

ہندوستان کے شاعروں، ادیبوں اور ڈرامہ نگاروں کی مشہور انجمن پی ای این کے انگریزی رسالہ بابتہ اکتوبر ۱۹۵۷ء (صفحہ ۴۴۵ و ۴۴۶) پر جہاں اردو زبان اور ادب کی رفتار پر تبصرہ کیا ہے تو صرف ادارہ ہی کا ذکر کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ہمارے عظیم اداروں میں سے ہے۔ اس نے جنوبی ہند میں اردو کی ترقی اور مقبولیت کے لئے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی مطبوعات اور کامیابیاں زیادہ تر اس کے پرجوش معتمد اعزازی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور کارکنوں کی اس مخلص جماعت کی مرہون منت ہیں جو انہوں نے اطراف جمع کر لی ہے۔

اس ادارے کے کتب خانے میں مخطوطات کا ایک بیش بہا ذخیرہ محفوظ ہے۔ ان کے تفصیلی اور وضاحتی تذکرے کی دو جلدیں ڈاکٹر زور نے ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۰ء میں مرتب کر کے شائع کرا دی تھیں۔ پہلی جلد میں ۲۷۵ مخطوطات کا جامع تعارف شائع ہوا تھا۔ دوسری اس وقت چھپی ہے جب حیدرآباد سیاسی انتشار میں مبتلا تھا اس لئے اس میں پانچ سو مخطوطات کا زیادہ تر سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسری جلد میں جس میں مزید دو سو مخطوطات کا تذکرہ ہے ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ اس کی ترتیب کا معیار بہت بلند ہے۔ لائق مصنف نے مخطوطات کے مصنفوں، ان کے مضامین اور دوسری متعلقہ معلومات کو ممکنہ کمال کے ساتھ درج کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ پہلی جلدوں کی طرح تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے حوالہ اور رہبری میں نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو

علمی وادبی وکلچرل مصروفیات

۱۹۵۷ء

اتوار ۔ ۱۳ جنوری

۴ بجے ۔ مشہور اردو شاعر کیفی اعظمی ادارے میں تشریف لائے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس عصرانہ میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (ایم پی) ' مسٹر اختر حسین (ایم ایل اے) ایڈیٹر پیام ' جناب شاہد صدیقی صاحب محترمہ رضیہ بیگم ایم اے۔ خواجہ حمید الدین شاہد صاحب ایم اے ' اکبر الدین صدیقی صاحب ایم اے وغیرہ نے شرکت کی۔

اتوار ۔ ۲۰ جنوری

۵ بجے شام شری مہندر سنگھ رن دھاوا آئی سی ایس سکریٹری وزارت زراعت حکومت ہند نئی دہلی اور شری کرتار سنگھ دگل ادارے میں تشریف لائے اور قلمی مطلا و مذہب کتابوں اور آرٹ کے نمونوں اور تصویروں کا تفصیلی معائنہ کیا۔

پیر ۔ ۲۸ جنوری

اردو امتحانات ادارہ یعنی اردو دانی و اردو زبان دانی منعقدہ دسمبر ۱۹۵۶ء کے نتائج جملہ مقامی اخبارات میں شائع ہوئے۔

چہارشنبہ ۔ ۳۰ جنوری

گاندھی جی سے متعلق بچوں اور نوخواندہ بالغوں کے لئے ادارے کے شعبہ اردو امتحانات کی طرف سے ایک باتصویر منظوم کتاب شائع کی گئی۔

پیر ۔ ۴ فروری

کتابچہ ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۵۶ء شائع ہوا۔

منگل ۔ ۱۲ فروری

۴½ بجے ۔ مولوی سید ابو الفضل محمود قادری صاحب ایم ۔ اے ریسرچ اسکالر اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی ادارے میں آئے اور ملک خوشنود بیجاپوری کے بارے میں تبادلہ خیال کیا اور آزادی ہند میں اردو کے حصہ کے سلسلے میں کلام تلوک چند محروم کا مطالعہ کیا۔

چہارشنبہ ۔ ۱۲؍فروری

مصطفیٰ علی اکبر صاحب اور آمنہ ابوالحسن صاحبہ صدر و معتمد سروجنی دیوی سوسائٹی نے ادارے میں آکر سروجنی دیوی کا جنم دن منانے کے بارے میں تبادلہ خیال کیا اور خواہش کی کہ ادارے کی زیر طبع کتاب سروجنی دیوی اسی روز شائع کی جائے۔

منگل ۔ ۲۶؍فروری

مولوی غلام پنجتن صاحب شمشاد کی کتاب "حیدرآباد کے بڑے لوگ" شائع ہوئی۔

اتوار ۔ ۱۰؍مارچ

فاطمہ شجاعت صاحبہ ایم اے ریسرچ اسکالر اور سیدہ زہرا بیگم ڈاکٹر ناصر علی عابدی ادارے میں دو گھنٹے تک کتب خانہ وغیرہ کا معائنہ اور استفادہ کرتی رہیں۔ سیدہ زہرا بیگم صاحبہ نے بمبئی کی شاخ ادارۂ ادبیات اردو کو دوبارہ زندہ کرنے اور اردو کا بمبئی میں کام کرنے کا پیش کش کیا۔

جمعرات ۔ ۱۴؍مارچ

ادارے کی طرف سے کتاب سروجنی نائیڈو کی اشاعت عمل میں آئی۔

ہفتہ ۔ ۳۰؍مارچ

ادارے کی طرف سے کتاب "میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام" مرتبہ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی پروفیسر اردو بمبئی شائع کی گئی۔

اتوار ۔ ۳۱؍مارچ

۵ بجے شام ڈاکٹر سید علی محسن محسنؔ عابدی صاحب ادارے میں تشریف لائے اور حیدرآباد کے علمی مشاہیر کے بارے میں کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال کیا۔

جمعہ ۔ ۱۹؍اپریل

۶ بجے شام ڈاکٹر آمنہ خاتون میسور، مسٹر مالک رام دہلی۔ میر سکندر علی صاحب وجد ناندیڑ۔ محمد خاں صاحب لکچرار اردو بنگلور، غلام ربانی تاباں صاحب دہلی نے ادارہ کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد، مولوی عبدالوہاب صاحب معتمد اسٹیٹ سالار جنگ وغیرہ بھی شریک محفل تھے۔

اتوار ۔ ۲۱؍اپریل

۴ بجے۔ جناب مالک رام صاحب ادارے میں تشریف لائے اور مطبوعات ادارہ کی دلی میں ایجنسی کے قیام کے بارے میں معتمد عمومی ادارہ اور مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب سے تبادلہ خیال فرمایا۔

● ۵ بجے۔ یوم اقبال کے سلسلہ میں انجمن تعمیر ملت کی طرف سے جو نمائش منعقد ہونے والی ہے اس میں ادارے کا تعاون حاصل کرنے کے لئے مولوی مصباح الدین صاحب شکیل بی کام، ایل ایل بی کی قیادت میں ایک وفد آیا جس نے معتمد صاحب عمومی ادارہ اور مولوی اکبرالدین صدیقی صاحب معتمد کتب خانہ سے گفتگو کی۔

جمعہ ۔ ۳؍مئی

شام کے چھ بجے ہندی پرچار سبھا میں حیدرآباد کے تمام علمی و ادبی اداروں کے معتمدین کی ایک کمیٹی

منعقد ہوئی جس میں حکومت آندھرا پردیش کے وزرائے فینانس و تعلیمات کے یہاں ایک مشترکہ وفد لے جانے کا تصفیہ کیا گیا تاکہ حکومتی امداد جاری کرنے کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

منگل - ۷ مئی

شام کے ۷ بجے جناب خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیمات حکومت ہند نے ادارے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ ان کی آمد کی تقریب میں ایک محفل شعر و سخن منعقد ہوئی۔

ہفتہ - ۱۱ مئی

اردو امتحانات کی تاریخوں اور شرکت کی درخواستوں وغیرہ کے بارے میں مقامی اخبارات میں پریس نوٹ شائع ہوا۔

اتوار - ۱۲ مئی

صبح ساڑھے نو بجے ادارے کی مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ۶۹-۱۹۶۸ء کے موازنہ مطبوعات کے نئے مسودوں کے انتخاب اور دیگر ہنگامی امور کے بارے میں تصفیے کئے گئے۔

پیر - ۱۳ مئی

شام میں ۶ بجے ادارے کی مجلس عمارت کا اجلاس ہوا جس میں آڈیٹوریم کے اختتامی کام کی نگرانی کے انتظام اور فراہمی رقوم کے بارے میں تصفیے کئے گئے۔

منگل - ۱۴ مئی

ظہیر الدین میموریل لائبریری کو ادارے کی طرف سے ۱۵۲ مطبوعات بطور عطیہ دی گئیں۔

ہفتہ - ۱۸ مئی

انجمن تعمیر ملت کی جانب سے منعقدہ نمائش لوازم اقبال کے لئے ادارے سے ۳۶ کتابیں ۱۰ خطوط، ۶ تصویریں اور رسائل کی ۹۲ جلدیں دی گئیں۔

منگل - ۲۱ مئی

تلمذہ کلیانی کی شاخ ادارۂ ادبیات اردو نے حضرت تاج الدین شہسوار کے عرس کی تقریب میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جس کے لئے حسب ذیل طرح دی گئی تھی۔

ع نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے

ہفتہ - ۲۵ مئی

۶ بجے کرتار سنگھ صاحب دگل اور ڈاکٹر عائشہ دگل ادارے میں تشریف لائے۔

پیر - ۲۷ مئی

۹ بجے صبح فضل اللہ فاروقی صاحب اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی ادارے میں تشریف لائے۔

منگل - ۲۸ مئی

۶ بجے شام ڈاکٹر نعیم الدین صدر شعبہ فارسی ناگپور یونیورسٹی نے ادارے کا تفصیلی معائنہ کیا۔

جمعرات - ۳۰ مئی

۱۱ بجے قطب النساء ہاشمی صاحب ایم۔ اے متعلم پی ایچ ڈی ناگپور نے قلمی کتابوں سے استفادہ کیا۔

● ۶ بجے مولوی عبدالرزاق صاحب راشد

مرتب کلیات اقبال نے ادارے کا تفصیلی معائنہ کیا۔

اتوار۔ ۲ رجون

ڈاکٹر نعیم الدین صاحب ناگپور، ڈاکٹر آمنہ خاتون میسور، پروفیسر محمد خاں صاحب میسور نے ادارے کی قلمی کتابوں سے کئی گھنٹے ٹھہر کر استفادہ کیا۔

منگل۔ ۴ رجون

۵ بجے۔ قطب النساء بیگم صاحبہ ہاشمی نے ادارے کے کتب خانہ سے دو گھنٹے تک استفادہ کیا۔

جمعرات۔ ۶ رجون

۹ بجے صبح۔ پرنسپل سفارش حسین صاحب رضوی ادارے میں تشریف لائے اور بیاض مراثی اور عاصمی دہلوی کے مرثیوں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

● ۶ بجے شام۔ ہندی پرچار سبھا میں حیدرآباد کے کلچرل اور علمی اداروں، مہاراشٹرا ساہتیہ پریشد، آندھرا سارسوتہ پریشد، ادارۂ ادبیات اردو، ہندی پرچار سبھا کے معتمدین کی ایک کمیٹی منعقد ہوئی جس میں حکومت آندھرا پردیش سے امداد کے لئے میمورنڈم کی تکمیل کی گئی۔

منگل۔ ۱۱ رجون

ادارے کی ریسرچ فیلو رشیدہ موسوی صاحبہ ایم اے نے میر شمس الدین محمد فیض کے مخطوطات کا تحقیقی مطالعہ کیا۔

جمعہ۔ ۲۱ رجون

۳ بجے۔ حیدرآباد کی کلچرل اور ادبی انجمنوں کے معتمدین کے وفد کے ساتھ معتمد صاحب اعزازی ادارہ نے حکومتی امداد کے سلسلہ میں وزیر تعلیم آندھرا پردیش سے ملاقات کی۔

جمعہ۔ ۲۸ رجون

۵ بجے شام۔ جوہانسبرگ (افریقہ) کے مولانا حاجی یوسف میاں صاحب کو ادارے میں چائے پر مدعو کیا گیا۔ موصوف نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اور عربی مخطوطات کو تفصیل سے دیکھا۔ اس عصرانہ میں ادارے کے جملہ ارباب کار اور کارکن مدعو تھے۔ عصرانہ میں حکیم الشعرا حضرت سید احمد حسین صاحب امجد، ڈاکٹر یوسف الدین صاحب، مولانا حافظ حامد صدیقی صاحب معتمد شعبہ نشر و اشاعت ادارہ، مولوی عارف الدین حسن صاحب معتمد شاخہائے ادارہ، مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب معتمد کتب خانہ، مولوی خواجہ حمید الدین شاہد صاحب معتمد امتحانات، مولانا حافظ محمد مظہر صاحب، مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نائب ناظم آثار قدیمہ، مولوی عبدالوہاب صاحب معتمد سالار جنگ اسٹیٹ، مولانا طٰہٰ صاحب، مولوی احمد علی صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد نے معزز مہمان کے خیر مقدم اور تعارف میں ایک تقریر کی جس کے جواب میں مولانا یوسف میاں صاحب نے اپنی تقریر میں ادارے کے کام پر خوشنودی ظاہر کی اور ممکنہ امداد کا وعدہ کیا۔
ادارے کی زیر تعمیر عمارت کا بھی حاضرین نے معائنہ کیا۔

منگل۔ ۲ رجولائی

۵ بجے۔ پرنسپل سفارش حسین رضوی (سمستھرا) نے ادارے کی ایک قلمی بیاض سے عاصمی دہلوی اور

دیگر مرثیہ نگاروں کے کلام کی نقلیں حاصل کیں۔ پرنسپل صاحب موصوف نے مسلسل دو دن یعنی ۲ اور ۳ جولائی کی شامیں ادارے کے کتب خانے میں گذاریں۔

اتوار۔ ۱۴ جولائی

مولوی احمد اللہ خاں صاحب بی اے بی ایڈ اور محمد صدیق صاحب ماہر کتبات ادارے میں تشریف لائے۔ ادارے میں قدیم تاریخی کتبات کے چربوں کو جس احتیاط کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے اس کا معائنہ کیا۔ صاحب موصوف اپنے ساتھ جو چربے ادارے کو بطور عطیہ دینے لائے تھے ان میں سے دو ادارے میں محفوظ کر لئے گئے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ مزید نئے کتبات کی چھان بین میں ادارے کا ہاتھ بٹائیں گے۔

چہارشنبہ۔ ۲۴ جولائی

ادارے کے کتب خانہ کی قلمی کتابوں کے تفصیلی تذکرے کی تیسری جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس جلد میں دو سو مخطوطات کا تذکرہ چار سو سے زیادہ صفحات میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کے لئے ساہتیہ اکاڈیمی نے ادارے کو پندرہ سو روپے کی مدد دی تھی۔

جمعہ۔ ۲ اگسٹ

۵ بجے شام قمر احمد خاں صاحب ارکٹکٹ اور ٹاؤن پلانر اورنگ آباد نے ادارے کی زیر تعمیر عمارت کا معائنہ کیا اور رو کار کے نقش و نگار میں ترمیم کی رائے دی۔

جمعرات۔ ۸ اگسٹ

۶ بجے شام محمد یونس صاحب کانپوری ادارے میں تشریف لائے اور خرم علی صاحب کی قلمی کتابوں سے استفادہ کیا۔

ہفتہ۔ ۱۰ اگسٹ

ادارے کی طرف سے مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کی کتاب "اردو میں سائنسی ادب" (قدیم ترین کارنامے) شائع کی گئی۔

جمعہ۔ ۱۶ اگسٹ

شام ۵ بجے۔ احمد نگر کے مشہور شاعر افسر سیمابی اور جاوید لطیفی ادارے میں تشریف لائے اور تفصیلی معائنہ کیا۔ افسر سیمابی نے اپنا مجموعہ کلام "غبارستان" بطور تحفہ پیش کیا۔

ہفتہ۔ ۱۷ اگسٹ

صبح ۱۰ بجے۔ حیدرآباد کے مشہور صوفی شاعر مولانا شیخن احمد صاحب شطاری کامل اور مولانا سید ابراہیم حسینی صاحب نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔

اتوار۔ ۱۸ اگسٹ

شام ۶ بجے۔ ادارے نے حیدرآباد کی دوسری ادبی اور کلچرل انجمنوں (ہندی پرچار سبھا، آندھرا سرسوت پریشد، مرہٹواڑہ ساہتیہ پریشد، حیدرآباد بنگالی کمیٹی، پریم چند سوسائٹی، نو کلا کیندر اور انجمن ترقی اردو وغیرہ) کے تعاون سے اردو ہال میں ایک یوم ٹیگور منایا جس میں پروفیسر ونشی دھر ودیالنکار اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے تقریریں کیں۔ ٹیگور کی نظمیں پڑھی اور گائی گئیں۔ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی وزیر فینانس نے اس اجلاس کی صدارت کی۔

پیر۔ ۱۹ اگست

۵ بجے شام۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر وزیر آندھرا پردیش ادارے میں تشریف لائے اور زیر تعمیر عمارت کا معائنہ فرمایا۔ اس موقعہ پر محترمہ شاہجہاں بیگم صاحبہ معتمد مجلس عمارت، مولوی محمد حسین خاں صاحب انجنیر عمارت ادارہ، مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد معتمد اردو امتحانات و سوشیل سنٹر بھی موجود تھے۔

منگل۔ ۲۰ اگست

۵ بجے شام۔ ادارے کی مجلس انتظامی کا اجلاس ہوا جس میں نواب لیاقت جنگ بہادر صدر، نواب زین یار جنگ بہادر اور مولوی سید علی اکبر صاحب نائب صدور، پروفیسر مجید صدیقی صاحب، مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب اور معتمد ادارہ ڈاکٹر زور صاحب نے شرکت فرمائی۔ یوم اردو میں ادارے کی نمائندگی اور دیگر امور کے بارے میں تصفیے کئے گئے۔ ارکان مجلس نے ادارے کی زیر تعمیر عمارت کا معائنہ کیا اور کام کی رفتار پر خوشنودی کا اظہار کیا۔

اتوار۔ ۲۵ اگست

صبح دس بجے۔ اردو ہال حمایت نگر میں یوم اردو منایا گیا جس میں ادارے کی طرف سے اس کے صدر نواب لیاقت جنگ بہادر نے قرارداد کی تائید میں تقریر کی اور مجلس انتظامی کے ارکان نواب زین یار جنگ بہادر، مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب رائے جانکی پرشاد صاحب، ڈاکٹر زور صاحب اور ادارے کے شعبے کے معتمدین مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد، مولوی عارف الدین حسن صاحب اور متعدد ارکان نے شرکت کی۔

سہ پہر ۳ بجے۔ چینی عاشور خانہ قدم رسول قلعہ گولکنڈہ کی قدیم تاریخی تصاویر میں سے ۱۷ مشاہیر دکن اور صوفی شعراء کے فوٹو ادارے کی پکچر گیالری کے لئے اتارے گئے۔

ہفتہ۔ ۷ ستمبر

مولوی میر حسن صاحب ایم۔ اے اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو دھارواڑ ادارے میں تشریف لائے۔ زیر تعمیر عمارت کا معائنہ کیا اور ساہتیہ اکاڈمی کے لئے جس یونانی کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں اس کے بارے میں مشورہ کیا۔ مولوی میر حسن صاحب کی پہلی کتاب درڈسورتھ اور اس کی شاعری ادارہ کی پہلی مطبوعہ کتاب ہے۔

جمعرات۔ ۱۹ ستمبر

۵ بجے۔ ہندی پرچار سبھا میں حیدرآباد کے کلچرل اداروں کے معتمدین کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں حکومت حیدرآباد سے امداد حاصل کرنے کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا گیا۔

ہفتہ۔ ۲۱ ستمبر

۱۰ بجے صبح۔ ادارے کے اردو امتحانات (اردو عالم، اردو زباندانی اور اردو دانی) بلدہ کے علاوہ نرمل اور خانہ پور کے مراکز میں شروع ہوئے جو تین دن تک یعنی ۲۳ ستمبر تک جاری رہے۔

منگل۔ ۱۵ اکتوبر

۶ بجے شام۔ مولوی میر یسین علی خاں صاحب

نبیرہ نواب میر حسن علی خاں آمیر مرحوم نے اپنے دادا آمیر کے دیوان کی ترتیب کے سلسلہ میں
اور رشید موسوی صاحب ایم۔ اے حضرت فیض کی قلمی کتابوں سے اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلہ میں استفادہ کیا۔

جمعہ۔ ۱۸ر اکتوبر

۲ بجے شام۔ علی جواد زیدی صاحب انفارمیشن آفیسر حکومت سری نگر کشمیر ادارے میں تشریف لائے اور تفصیلی معائنہ کیا۔

جمعہ۔ ۲۵ر اکتوبر

۲ بجے۔ ڈاکٹر نہرو ترا ایم۔ اے، ڈی فل (ایڈنبرا) ڈائرکٹر بیورو آف سائیکالوجی حکومت اترپردیش الہ آباد نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور زیر تعمیر عمارت بھی دیکھی۔

ہفتہ۔ ۲۶ر اکتوبر

ادارے کی طرف سے کتاب "طالب و موہنی" کی اشاعت عمل میں آئی۔

پیر۔ ۲۸ر اکتوبر

۲ بجے۔ زیڈ۔ اے دیسائی صاحب آفیسر محکمہ آثار قدیمہ حکومت ہند ادارے میں تشریف لائے اور قطب شاہی دور کے فارسی کتبات کے جو چربے ادارے میں محفوظ ہیں ان کا تفصیلی مطالعہ کیا اور گولکنڈے کے کتبات کے بارے میں مشورہ حاصل کیا۔

چہارشنبہ۔ ۳۰ر اکتوبر

ادارے کی طرف سے یوم محمد قلی قطب شاہ منانے کا اعلان کیا گیا۔

جمعہ۔ یکم نومبر

صبح دس بجے۔ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی وزیر فینانس آندھرا پردیش نے ادارہ کا معائنہ کیا۔ اس خیر مقدمی تقریب میں ایک محفل شعر و سخن منعقد کی گئی۔

ہفتہ۔ ۲ر نومبر

شام ۵ بجے۔ روسی پروفیسر کرشنین کوف اور روسی طالب علم   کو ادارے میں عصرانہ دیا گیا۔ اس صحبت میں مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب ڈاکٹر یوسف الدین صاحب، بریگیڈیر علی احمد، خواجہ حمید الدین شاہد صاحب، کرنل عابدی صاحب، عزیز احمد صاحب، ڈاکٹر زور صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔ روس کے علمی و ادبی اداروں اور تحقیقات کے بارے میں تبادلہ خیال کیا گیا۔

منگل۔ ۵ر نومبر

۵ بجے روسی ریسرچ اسکالر الکسس برخوردارف اور چرنیشوف ادارے کے معائنہ کے لئے آئے۔ اس موقع پر سر نیواس لاہوٹی صاحب، شیو پرکاش صاحب، سعادت نظیر صاحب ایم۔ اے، وقار خلیل صاحب ایڈیٹر انعام، رشید الدین فاروقی صاحب وغیرہ بھی شریک محفل رہے۔

ہفتہ۔ ۹ر نومبر

۵ بجے۔ روسی ریسرچ اسکالروں چرنیشوف اور برخوردارف کو ادارے میں چائے پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس صحبت میں خواجہ حمید الدین شاہد صاحب،

معائنہ کے بعد جملہ شرکائے محفل کا معزز مہمان سے تعارف کرایا گیا۔ ایک محفل شعر و سخن حکیم الشعراء حضرت احمد حسین صاحب امجد کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں خود حضرت امجد کے علاوہ شاہد صدیقی صاحب، سلیمان اریب صاحب، سعادت نظیر صاحب، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید صاحب، وحید اختر صاحب، س۔ ا۔ عشرت صاحب اور سرور ڈنڈا صاحب وغیرہ نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ تقریب کے بعد یہ پر لطف محفل برخاست ہوئی۔

جناب خواجہ غلام السیدین صاحب معتمد تعلیم حکومت ہند نے اپنے تاثرات کے طور پر ڈاکٹر زور صاحب سے فرمایا کہ اتنا کام کرنے کے بعد کوئی شخص فخر سے کہہ سکتا ہے کہ ــ تا دم از زندگی خویش کہ کارے کردم ــ

رسالہ پی ای این میں ادارے کی خدمات کا اعتراف

ہندوستان کے شاعروں، ادیبوں اور ڈرامہ نگاروں کی مشہور انجمن پی ای این کے انگریزی رسالہ بابتہ اکتوبر ۱۹۵۵ء (صفحہ ۳۴۵ و ۳۴۶) پر جہاں اردو زبان اور ادب کی رفتار پر تبصرہ کیا ہے تو صرف ادارہ ہی کا ذکر کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ہمارے عظیم اداروں میں سے ہے۔ اس نے جنوبی ہند میں اردو کی ترقی اور مقبولیت کے لئے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی مشہور فتوحات اور کامیابیاں زیادہ تر اس کے پر جوش معتمد اعزازی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور کارکنوں کی اس مخلص جماعت کی مرہون منت ہیں جو انہوں نے اطراف جمع کر لی ہے۔

اس ادارے کے کتب خانے میں مخطوطات کا ایک بیش بہا ذخیرہ محفوظ ہے۔ ان کے تفصیلی اور وضاحتی تذکرے کی دو جلدیں ڈاکٹر زور نے ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۱ء میں مرتب کر کے شائع کرا دی تھیں۔ پہلی جلد میں ۲۷۵ مخطوطات کا جامع تعارف شائع ہوا تھا۔ دوسری اس وقت چھپی ہے جب حیدرآباد سیاسی انتشار میں مبتلا تھا اس لئے اس میں پانچ سو مخطوطات کا زیادہ تر سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسری جلد میں جس میں مزید دو سو مخطوطات کا تذکرہ ہے ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ اس کی ترتیب کا معیار بہت بلند ہے۔ لائق مصنف نے مخطوطات کے مصنفوں، ان کے مضامین اور دوسری متعلقہ معلومات کو ممکنہ کمال کے ساتھ درج کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ پہلی جلدوں کی طرح تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے حوالہ اور رہبری میں نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو

علمی و ادبی و کلچرل مصروفیات

سنہ ۱۹۵۷ء

اتوار۔ ۱۲ جنوری

۴ بجے۔ مشہور اردو شاعر کیفی اعظمی ادارے میں تشریف لائے۔ ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس عصرانہ میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (ایم پی)، مسٹر اختر حسین (ایم ایل اے) ایڈیٹر پیام، جناب شاہد صدیقی صاحب، محترمہ رضیہ بیگم ایم اے۔ خواجہ حمید الدین شاہد صاحب ایم اے، اکبر الدین صدیقی صاحب ایم اے وغیرہ نے شرکت کی۔

اتوار۔ ۲۰ جنوری

۵ بجے شام شری مہندر سنگھ رن دھاوا آئی سی ایس سکریٹری وزارت زراعت حکومت ہند نئی دہلی اور شری کرتار سنگھ دگل ادارے میں تشریف لائے اور قلمی مطلا و مذہب کتابوں اور آرٹ کے نمونوں اور تصویروں کا تفصیلی معائنہ کیا۔

پیر۔ ۲۸ جنوری

اردو امتحانات ادارہ یعنی اردو دانی، اردو زبان دانی منعقدہ دسمبر سنہ ۱۹۵۶ء کے نتائج جملہ مقامی اخبارات میں شائع ہوئے۔

چہارشنبہ۔ ۳۰ جنوری

گاندھی جی سے متعلق بچوں اور نو خواندہ بالغوں کے لئے ادارے کے شعبہ اردو امتحانات کی طرف سے ایک باتصویر منظوم کتاب شائع کی گئی۔

پیر۔ ۴ فروری

کتابچہ ادارۂ ادبیات اردو سنہ ۱۹۵۶ء شائع ہوا۔

منگل۔ ۱۲ فروری

۴½ بجے۔ مولوی سید ابوالفضل محمود قادری صاحب ایم۔ اے ریسرچ اسکالر اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی ادارے میں آئے اور ملک خوشنود بیجاپوری کے بارے میں تبادلہ خیال کیا اور آزادیٔ ہند میں اردو کے حصہ کے سلسلے میں کلام تلک چند محروم کا مطالعہ کیا۔

چہارشنبہ - ۱۳ر فروری

مصطفیٰ علی اکبر صاحب اور آمنہ ابوالحسن صاحبہ صدر و معتمد سروجنی دیوی سوسائٹی نے ادارے میں آکر سروجنی دیوی کا جنم دن منانے کے بارے میں تبادلہ خیال کیا اور خواہش کی کہ ادارے کی زیر طبع کتاب سروجنی دیوی اسی روز شائع کی جائے۔

منگل - ۲۶ر فروری

مولوی غلام پنجتن صاحب شمشاد کی کتاب "حیدرآباد کے بڑے لوگ" شائع ہوئی۔

اتوار - ۱۰ر مارچ

فاطمہ شجاعت صاحبہ ایم اے ریسرچ اسکالر اور سیدہ زہرا بیگم ڈاکٹر ناصر علی عابدی ادارے میں دو گھنٹے تک کتب خانہ وغیرہ کا معائنہ اور استفادہ کرتی رہیں۔ سیدہ زہرا بیگم صاحبہ نے بمبئی کی شاخ ادارۂ ادبیات اردو کو دوبارہ زندہ کرنے اور اردو کا جبینسہ میں کام کرنے کا پیش کش کیا۔

جمعرات - ۱۴ر مارچ

ادارے کی طرف سے کتاب سروجنی نائیڈو کی اشاعت عمل میں آئی۔

ہفتہ - ۳۰ر مارچ

ادارے کی طرف سے کتاب "میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام" مرتبہ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی پروفیسر اردو بمبئی شائع کی گئی۔

اتوار - ۳۱ر مارچ

۵ بجے شام ڈاکٹر سید علی محسن محشر عابدی صاحب ادارے میں تشریف لائے اور حیدرآباد کے علمی مشاہیر کے بارے میں کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال کیا۔

جمعہ - ۱۹ر اپریل

۶ بجے شام ڈاکٹر آمنہ خاتون میسور، مسٹر مالک رام دہلی۔ میر سکندر علی صاحب وجد ناندیڑ۔ محمد خان صاحب لکچرار اردو بنگلور۔ غلام ربانی تاباں صاحب دہلی نے ادارہ کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد، مولوی عبدالوہاب صاحب معتمد اسٹیٹ سالار جنگ وغیرہ بھی شریک محفل تھے۔

اتوار - ۲۱ر اپریل

۴ بجے۔ جناب مالک رام صاحب ادارے میں تشریف لائے اور مطبوعات ادارہ کی دلی میں ایجنسی کے قیام کے بارے میں معتمد عمومی ادارہ اور مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب سے تبادلہ خیال فرمایا۔

● ۵ بجے۔ یوم اقبال کے سلسلہ میں انجمن تعمیر ملت کی طرف سے جو نمائش منعقد ہونے والی ہے اس میں ادارے کا تعاون حاصل کرنے کے لئے مولوی مصباح الدین صاحب شکیل بی کام، ایل ایل بی کی قیادت میں ایک وفد آیا جس نے معتمد صاحب عمومی ادارہ اور مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب معتمد کتب خانہ سے گفتگو کی۔

جمعہ - ۳ر مئی

شام کے چھ بجے ہندی پرچار سبھا میں حیدرآباد کے تمام علمی و ادبی اداروں کے معتمدین کی ایک کمیٹی

منعقد ہوئی جس میں حکومت آندھرا پردیش کے وزرائے فینانس و تعلیمات کے یہاں ایک مشترکہ وفد لے جانے کا تصفیہ کیا گیا تاکہ حکومتی امداد جاری کرنے کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

منگل ۔ ۷ رمئی

شام کے ۷ بجے جناب خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر محکمہ تعلیمات حکومت ہند نے ادارے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ ان کی آمد کی تقریب میں ایک محفل شعر و سخن منعقد ہوئی۔

ہفتہ ۔ ۱۱ رمئی

اردو امتحانات کی تاریخوں اور شرکت کی درخواستوں وغیرہ کے بارے میں مقامی اخبارات میں پریس نوٹ شائع ہوا۔

اتوار ۔ ۱۲ رمئی

صبح ساڑھے نو بجے ادارے کی مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ۶۸-۱۹۶۷ء کے موازنہ مطبوعات کے نئے مسودوں کے انتخاب اور دیگر انتظامی امور کے بارے میں تصفیے کئے گئے۔

پیر ۔ ۱۳ رمئی

شام میں ۶ بجے ادارے کی مجلس عمارت کا اجلاس ہوا جس میں آڈیٹر کے اعتراض ، گنبد دار کے انتظام اور فراہمی رقوم کے بارے میں تصفیے کئے گئے۔

منگل ۔ ۱۴ رمئی

ظہیر الدین میموریل لائبریری کو ادارے کی طرف سے ۱۵۲ مطبوعات بطور عطیہ دی گئیں۔

ہفتہ ۔ ۱۸ رمئی

انجمن تعمیر ملت کی جانب سے منعقدہ نمائش لیگ اقبال کے لئے ادارے سے ۳۶ کتابیں ۱۸ خطوط ، ۶ تصویریں اور رسائل کی ۹۲ جلدیں دی گئیں۔

منگل ۔ ۲۱ رمئی

قلعہ کلیانی کی شاخ ادارۂ ادبیات اردو نے حضرت تاج الدین شیر سوار کے عرس کی تقریب میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جس کے لئے حسب ذیل طرح دی گئی تھی۔

ع نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے

ہفتہ ۔ ۲۵ رمئی

۶ بجے ۔ کرتار سنگھ صاحب دگل اور ڈاکٹر عائشہ دگل ادارے میں تشریف لائے۔

پیر ۔ ۲۷ رمئی

۹ بجے صبح ۔ فضل اللہ فاروقی صاحب اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی ادارے میں تشریف لائے۔

منگل ۔ ۲۸ رمئی

۶ بجے شام ۔ ڈاکٹر نعیم الدین صدر شعبہ فارسی ناگپور یونیورسٹی نے ادارے کا تفصیلی معائنہ کیا۔

جمعرات ۔ ۳۰ رمئی

۱۱ بجے قطب النساء ہاشمی صاحب ایم ۔ اے متعلم پی ایچ ڈی ناگپور نے قلمی کتابوں سے استفادہ کیا۔

● ۶ بجے مولوی عبدالرزاق صاحب راشد

مرتب کلیات اقبال نے ادارے کا تفصیلی معائنہ کیا۔

اتوار ۔ ۲؍جون

ڈاکٹر نعیم الدین صاحب ناگپور، ڈاکٹر آمنہ خاتون میسور، پروفیسر محمد خاں صاحب میسور نے ادارے کی قلمی کتابوں سے کئی گھنٹے ٹھہر کر استفادہ کیا۔

منگل ۔ ۴؍جون

۵ بجے ۔ قطب النساء بیگم صاحبہ ہاشمی نے ادارے کے کتب خانہ سے دو گھنٹے تک استفادہ کیا۔

جمعرات ۔ ۶؍جون

۹ بجے صبح ۔ پرنسپل سفارش حسین صاحب رضوی ادارے میں تشریف لائے اور بیاض مراثی اور عاصی دہلوی کے مرثیوں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

● ۶ بجے شام ۔ ہندی پرچار سبھا میں حیدرآباد کے کلچرل اور علمی اداروں، مہاراشٹرا ساہتیہ پریشد، آندھرا سارسوتہ پریشد، ادارۂ ادبیات اردو، ہندی پرچار سبھا کے معتمدین کی ایک کمیٹی منعقد ہوئی جس میں حکومت آندھرا پردیش سے امداد کے لئے میمورنڈم کی تکمیل کی گئی۔

منگل ۔ ۱۱؍جون

ادارے کی ریسرچ فیلو رشیدہ موسوی صاحبہ ایم اے نے میر شمس الدین محمد فیض کے مخطوطات کا تحقیقی مطالعہ کیا۔

جمعہ ۔ ۲۱؍جون

۳ بجے ۔ حیدرآباد کی کلچرل اور ادبی انجمنوں کے معتمدین کے وفد کے ساتھ معتمد صاحب اعزازی ادارہ نے حکومتی امداد کے سلسلہ میں وزیر تعلیم آندھرا پردیش سے ملاقات کی۔

جمعہ ۔ ۲۸؍جون

۵ بجے شام ۔ جوہانسبرگ (افریقہ) کے مولانا حاجی یوسف میاں صاحب کو ادارے میں چائے پر مدعو کیا گیا ۔ موصوف نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اور عربی مخطوطات کو تفصیل سے دیکھا۔ اس عصرانہ میں ادارے کے جملہ ارباب کار اور کارکن مدعو تھے۔ عصرانہ میں حکیم الشعرا حضرت سید احمد حسین صاحب امجد، ڈاکٹر یوسف الدین صاحب، مولانا حافظ حامد صدیقی صاحب معتمد شعبہ نشر و اشاعت ادارہ، مولوی عارف الدین حسن صاحب معتمد شاخہائے ادارہ، مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب معتمد کتب خانہ، مولوی خواجہ حمید الدین شاہد صاحب معتمد امتحانات، مولانا حافظ محمد مظہر صاحب، مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نائب ناظم آثار قدیمہ، مولوی عبدالوہاب صاحب معتمد سالار جنگ اسٹیٹ، مولانا طٰہٰ صاحب، مولوی احمد علی صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد نے معزز مہمان کے خیر مقدم اور تعارف میں ایک تقریر کی جس کے جواب میں مولانا یوسف میاں صاحب نے اپنی تقریر میں ادارے کے کام پر خوشنودی ظاہر کی اور حکمتہ امداد کا وعدہ کیا۔ ادارے کی زیر تعمیر عمارت کا بھی حاضرین نے معائنہ کیا۔

منگل ۔ ۲؍جولائی

۵ بجے ۔ پرنسپل سفارش حسین رضوی (شمس متھرا) نے ادارے کی ایک قلمی بیاض سے عاصی دہلوی اور

دیگر مرثیہ نگاروں کے کلام کی نقلیں حاصل کیں۔ پرنسپل صاحب موصوف نے مسلسل دو دن یعنی ۲ اور ۳ جولائی کی شامیں ادارے کے کتب خانے میں گذاریں۔

اتوار۔ ۱۴ جولائی

مولوی احمد اللہ خاں صاحب بی اے، بی ایڈ اور محمد صدیق صاحب ماہر کتبات ادارے میں تشریف لائے۔ ادارے میں قدیم تاریخی کتبات کے چربوں کو جس احتیاط کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے اس کا معائنہ کیا۔ صاحب موصوف اپنے ساتھ جو چربے ادارے کو بطور عطیہ دینے لائے تھے ان میں سے دو ادارے میں محفوظ کر لئے گئے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ مزید نئے کتبات کی چھان بین میں ادارے کا ہاتھ بٹائیں گے۔

چہارشنبہ۔ ۲۴ جولائی

ادارے کے کتب خانہ کی قلمی کتابوں کے تفصیلی تذکرے کی تیسری جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس جلد میں دو سو مخطوطات کا تذکرہ چار سو سے زیادہ صفحات میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کے لئے ساہتیہ اکاڈمی نے ادارے کو پندرہ سو روپے کی مدد دی تھی۔

جمعہ۔ ۲ اگست

۵ بجے شام قمر احمد خاں صاحب ارکٹکٹ اور ٹاؤن پلانر اورنگ آباد نے ادارے کی زیر تعمیر عمارت کا معائنہ کیا اور روکارہ کے نقش و نگار میں ترمیم کی رائے دی۔

جمعرات۔ ۸ اگست

۶ بجے شام محمد یونس صاحب کانپوری ادارے میں تشریف لائے اور خرم علی صاحب کی قلمی کتابوں سے استفادہ کیا۔

ہفتہ۔ ۱۰ اگست

ادارے کی طرف سے مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کی کتاب "اردو میں سائنسی ادب" (قدیم ترین کارنامے) شائع کی گئی۔

جمعہ۔ ۱۶ اگست

شام ۵ بجے۔ احمد نگر کے مشہور شاعر افسر سیمابی اور جاوید لطیفی ادارے میں تشریف لائے اور تفصیلی معائنہ کیا۔ افسر سیمابی نے اپنا مجموعہ کلام "خارستان" بطور تحفہ پیش کیا۔

ہفتہ۔ ۱۷ اگست

صبح ۱۰ بجے۔ حیدرآباد کے مشہور صوفی شاعر مولانا شیخن احمد صاحب شطاری کامل اور مولانا سید ابراہیم حسینی صاحب نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔

اتوار۔ ۱۸ اگست

شام ۶ بجے۔ ادارے نے حیدرآباد کی دوسری ادبی اور کلچرل انجمنوں (ہندی پرچار سبھا، آندھرا سرسوت پریشد، مرہٹواڑہ ساہتیہ پریشد، حیدرآباد بنگالی کمیٹی، پریم چند سوسائٹی، نوکلاکیندر اور انجمن ترقی اردو وغیرہ) کے تعاون سے اردو ہال میں ایک یوم ٹیگور منایا جس میں پروفیسر ونشی دھر ودیالنکار اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے تقریریں کیں۔ ٹیگور کی نظمیں پڑھی اور گائی گئیں۔ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی وزیر فینانس نے اس اجلاس کی صدارت کی۔

پیر۔ ۱۹؍ اگسٹ

۵ بجے شام۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر وزیر آندھرا پردیش ادارے میں تشریف لائے اور زیر تعمیر عمارت کا معائنہ فرمایا۔ اس موقعہ پر محترمہ شاہجہاں بیگم صاحبہ معتمد مجلس عمارت، مولوی محمد حسین خاں صاحب انجنیر عمارت ادارہ، مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد معتمد اردو امتحانات و سوشیل سنٹر بھی موجود تھے۔

منگل۔ ۲۰؍ اگسٹ

۵ بجے شام۔ ادارے کی مجلس انتظامی کا اجلاس ہوا جس میں نواب لیاقت جنگ بہادر صدر، نواب زین یار جنگ بہادر اور مولوی سید علی اکبر صاحب نائب صدور، پروفیسر مجید صدیقی صاحب، مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب اور معتمد ادارہ ڈاکٹر زور صاحب نے شرکت فرمائی۔ یوم اردو میں ادارے کی نمائندگی اور دیگر امور کے بارے میں تصفیے کئے گئے۔ ارکان مجلس نے ادارے کی زیر تعمیر عمارت کا معائنہ کیا اور کام کی رفتار پر خوشنودی کا اظہار کیا۔

اتوار۔ ۲۵؍ اگسٹ

صبح دس بجے۔ اردو ہال حمایت نگر میں یوم اردو منایا گیا جس میں ادارے کی طرف سے اس کے صدر نواب لیاقت جنگ بہادر نے قرارداد کی تائید میں تقریر کی اور مجلس انتظامی کے ارکان نواب زین یار جنگ بہادر، مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب، رائے جانکی پرشاد صاحب، ڈاکٹر زور صاحب اور ادارے کے شعبے کے معتمدین مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد، مولوی عارف الدین حسن صاحب اور متعدد ارکان نے شرکت کی۔

● سہ پہر ۳ بجے۔ حسینی عاشور خانہ قدم رسول قلعہ گولکنڈہ کی قدیم تاریخی تصاویر میں سے ۱۷ مشاہیر دکن اور صوفی شعراء کے فوٹو ادارے کی پکچر گیالری کے لئے اتارے گئے۔

ہفتہ۔ ۷؍ ستمبر

مولوی میر حسن صاحب ایم۔ اے اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو دھار واڑ ادارے میں تشریف لائے۔ زیر تعمیر عمارت کا معائنہ کیا اور ساہتیہ اکاڈیمی کے لئے جس یونانی کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں اس کے بارے میں مشورہ کیا۔ مولوی میر حسن صاحب کی پہلی کتاب ورڈسورتھ اور اس کی شاعری ادارہ کی پہلی مطبوعہ کتاب ہے۔

جمعرات۔ ۱۹؍ ستمبر

۵ بجے۔ ہندی پرچار سبھا میں حیدرآباد کے کلچرل اداروں کے معتمدین کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں حکومت حیدرآباد سے امداد حاصل کرنے کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا گیا۔

ہفتہ۔ ۲۱؍ ستمبر

۱۰ بجے صبح۔ ادارے کے اردو امتحانات (اردو عالم، اردو زباندانی اور اردو دانی) بلدہ کے علاوہ نرمل اور خانہ پور کے مراکز میں شروع ہوئے جو تین دن تک یعنی ۲۳؍ ستمبر تک جاری رہے۔

منگل۔ ۱۵؍ اکتوبر

۶ بجے شام۔ مولوی میر یٰسین علی خاں صاحب

نبیرہ نواب میر حسن علی خاں آمیر مرحوم نے اپنے دادا آمیر کے دیوان کی ترتیب کے سلسلہ میں
اور رشید موسوی صاحبہ ایم۔ اے حضرت فیض کی قلمی کتابوں سے اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلہ میں استفادہ کیا۔

جمعہ۔ ۱۸ر اکتوبر

۶ بجے شام۔ علی جواد زیدی صاحب انفارمیشن آفیسر حکومت سری نگر کشمیر ادارے میں تشریف لائے اور تفصیلی معائنہ کیا۔

جمعہ۔ ۲۵ر اکتوبر

۶ بجے۔ ڈاکٹر نہرو ترا ایم۔ اے، ڈی فل (اڈنبرا) ڈائرکٹر بیورو آف سائیکالوجی حکومت اتر پردیش الٰہ آباد نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور زیر تعمیر عمارت بھی دیکھی۔

ہفتہ۔ ۲۶ر اکتوبر

ادارے کی طرف سے کتاب "طالب و موہنی" کی اشاعت عمل میں آئی۔

پیر۔ ۲۸ر اکتوبر

۶ بجے۔ زیڈ۔ اے دیسائی صاحب آفیسر محکمہ آثار قدیمہ حکومت ہند ادارے میں تشریف لائے اور قطب شاہی دور کے فارسی کتبات کے جو چربے ادارے میں محفوظ ہیں ان کا تفصیلی مطالعہ کیا اور گولکنڈے کے کتبات کے بارے میں مشورہ حاصل کیا۔

چہارشنبہ۔ ۳۰ر اکتوبر

ادارے کی طرف سے یوم محمد قلی قطب شاہ منانے کا اعلان کیا گیا۔

جمعہ۔ یکم نومبر

صبح دس بجے۔ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی وزیر فینانس آندھرا پردیش نے ادارہ کا معائنہ کیا۔ اس خیر مقدمی تقریب میں ایک محفل شعر و سخن منعقد کی گئی۔

ہفتہ۔ ۲ر نومبر

شام ۵ بجے۔ روسی پروفیسر کرشنین کوف اور روسی طالب علم   کو ادارے میں عصرانہ دیا گیا۔ اس صحبت میں مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب، ڈاکٹر یوسف الدین صاحب، بریگیڈیر علی احمد، خواجہ حمید الدین شاہد صاحب، کرنل عابدی صاحب، عزیز محمد صاحب، ڈاکٹر زور صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔ روس کے علمی و ادبی اداروں اور تحقیقات کے بارے میں تبادلہ خیال کیا گیا۔

منگل۔ ۵ر نومبر

۵ بجے روسی ریسرچ اسکالر الکسس برخوردارف اور چرنیشوف ادارے کے معائنہ کے لئے آئے۔ اس موقع پر سرینواس لاہوٹی صاحب، شیو پرکاش صاحب، سعادت نظیر صاحب ایم۔ اے، وقار خلیل صاحب ایڈیٹر انعام، رشید الدین فاروقی صاحب وغیرہ بھی شریک محفل رہے۔

ہفتہ۔ ۹ر نومبر

۵ بجے۔ روسی ریسرچ اسکالروں چرنشوف اور برخوردار وف کو ادارے میں چائے پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس صحبت میں خواجہ حمید الدین شاہد صاحب،

مولوی سید نظام الدین احمد صاحب، مولوی سعید بادشاہ حسین صاحب ایڈیٹر پاکستان ڈائجسٹ کراچی مولوی عبدالرحمن شریف صاحب بھی شریک تھے۔ تاشکو کے انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے لئے ادارے کی چند مطبوعات بطور تحفہ روسی اسکالرس کو دی گئیں۔

اتوار ۔ ۱۰ر نومبر

پدما بھوشن نواب زین یار جنگ کی صدارت میں یوم محمد قلی کی مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں پروگرام کی تفصیلات طے کی گئیں اور مختلف انتظامات کے لئے ذیلی کمیٹیاں بنائی گئیں۔

اتوار ۔ ۱۷ر نومبر

۴ بجے۔ یوم محمد قلی کے انتظامات، نمائش و ڈنر کی مجلس انتظامی کا اجلاس دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ پروفیسر مجید صدیقی، آغا حیدر حسن صاحب، مسز نواب لاہوتی صاحب، نصیرالدین ہاشمی صاحب، سید محمد صاحب، شری رام شرما صاحب، خواجہ حمیدالدین شاہد صاحب، اکبرالدین صدیقی صاحب، عبدالوہاب صاحب، ڈاکٹر زور صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔ ڈنر اور انتظامات کے بارے میں متعدد امور طے پائے۔

جمعرات ۔ ۲۱ر نومبر

۵ بجے۔ تنویر علوی صاحب ایم۔اے متعلم پی ایچ ڈی علی گڈھ یونیورسٹی ادارے میں آئے اور بعد معائنہ اپنے مقالے کے سلسلہ میں ادارے کے کتب خانے میں قدیم اردو اخبارات فوائد الناظرین، دہلی اردو اخبار وغیرہ سے استفادہ کیا۔

جمعہ ۔ ۲۲ر نومبر

۴½ بجے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے انتظامات ڈرامہ، ٹیبلو، رقص وغیرہ کی کمیٹی منعقد ہوئی جس میں مس رشید موسوی صاحبہ ایم۔اے، مس عطیہ حفیظ صاحبہ، ضیاء الحسن صاحب جعفری، ولی محمد صاحب، سعادت صاحب، ممتاز احمد صاحب، حمایت اللہ صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔ ضروری امور طے پائے۔

اتوار ۔ ۲۴ر نومبر

۵ بجے۔ تنویر علوی صاحب ایم۔اے (علیگ)، رشید موسوی صاحبہ ایم۔اے اور عطیہ حفیظ صاحبہ بی۔اے نے اپنے تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں ادارہ آکر مختلف کتب و رسائل کا معائنہ کیا۔

چہارشنبہ ۔ ۲۷ر نومبر

صبح ۱۰ بجے۔ ادارے کے ایک وفد نے ہز اکسلنسی شری بھیم سین سچر صاحب گورنر آندھرا پردیش سے ملاقات کی۔ اس وفد میں نواب لیاقت جنگ بہادر صدر ادارہ، جانکی پرشاد صاحب، پروفیسر مجید صدیقی، مولوی عبدالوہاب صاحب، خواجہ حمیدالدین شاہد صاحب، ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ اور ڈاکٹر زور شامل تھے۔ گورنر صاحب نے ۱۱ر جنوری کو یوم محمد قلی کے افتتاح اور ۲۵ر ڈسمبر کو ادارے کے معاینہ کے لئے وقت مقرر کیا۔

ہفتہ ۔ ۳۰ر نومبر

صبح ۹ بجے۔ میتھوڈسٹ چرچ جنوبی ہند کے بشپ جان سبحان نے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے، دفتر اور زیر تعمیر عمارت کا معاینہ کیا اور ادارے کے کتب خانے کے لئے اپنی ایک اردو اور ایک انگریزی کتاب بطور تحفہ عطا کی۔

● شام ۵ بجے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی نمائش اور جلوس کے انتظامات کے سلسلہ میں معتمد صاحب ادارہ اور مولوی عبدالوہاب صاحب کنوینر نمائش نے نواب سر وقار الامراء کی دیوڑھی میں قطب شاہی فرامین اور قدیم سکوں کا معائنہ کیا اور بعد میں نواب دین یار جنگ بہادر سے ملاقات کی اور تبادلۂ خیال کیا۔

اتوار۔ یکم ڈسمبر

۴½ بجے۔ ابوالحسن قطب شاہ اور شری رام داس بعد راجیلم کے تعلقات کے بارے میں تحقیقات کے سلسلہ میں ادارے میں ایک دلچسپ محفل منعقد ہوئی جس میں شری گوپال کرشنا لکچرار تلگو نظام کالج، شری آنند مورتی لکچرار دیوک وردھنی کالج، خواجہ حمید الدین شاہد صاحب لکچرار چادر گھاٹ کالج، اکبرالدین صدیقی صاحب لکچرار سٹی کالج، تنویر علوی صاحب ایم۔ اے ریسرچ اسکالر علیگڈھ یونیورسٹی، مس سمپت کماری ایم۔ اے ریسرچ اسکالر مدراس یونیورسٹی، شری اور شریمتی کامیشور راؤ ڈی ایس پی آندھرا پردیش اور حبیب اللہ صاحب وغیرہ شریک تھے۔ ادارے میں جو قطب شاہی فرامین، کاغذات مخطوطے اور تاریخی کتبات کے چربے ہیں ان کا معائنہ کیا اور طے پایا کہ اول الذکر دو صاحبان نواب منصب جنگ بہادر کے مکان واقع ایمن کے تلگو کتبات پڑھ کر ان کی نقلیں تیار کریں اور ان پر مضامین قلمبند کریں۔

پیر۔ ۲ ڈسمبر

۹ بجے شب۔ محکمہ تعلیمات حکومت ہند کے اسسٹنٹ سکریٹری شری ایچ گپتا ادارے کے معائنہ کے لئے تشریف لائے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک تفصیل سے معائنہ کیا۔

چہارشنبہ۔ ۴ ڈسمبر

۴½ بجے۔ آنریبل ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی صاحب وزیر فینانس کی صدارت میں یوم محمد قلی کی فینانس کمیٹی کا جلسہ ہوا جس میں سید علی اکبر صاحب، مولوی فیاض الدین صاحب آرکٹکٹ، جانکی پرشاد صاحب، پروفیسر مجید صدیقی صاحب، ڈاکٹر زور صاحب، ڈاکٹر رحیم الدین کمال صاحب، سرینواس لاہوٹی صاحب، پروفیسر نصر اللہ صاحب، شریمتی فیض النساء بیگم، کپاڈیا صاحب وغیرہ نے شرکت کی اور موازنہ جمع و خرچ کی تفصیلات طے کی گئیں۔

پیر۔ ۹ ڈسمبر

۵½ بجے۔ مسٹر اجیت سنگھ آئی اے ایس ڈپٹی کمشنر وساکھاپٹنم اور مولانا سید محی الدین بیابانی صاحب کانگریس لیڈر کرنول نے ادارے کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔

اتوار۔ ۱۵ ڈسمبر

۴ بجے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی مجلس انتظامی کا اجلاس دفتر ادارہ میں پدما بھوشن نواب زین یار جنگ بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نواب مہدی نواز جنگ وزیر آندھرا، نواب دوست محمد علاء الدین، مولانا سید علی اصغر بلگرامی صاحب، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، مولوی خواجہ محمد احمد صاحب، سرینواس لاہوٹی صاحب، مولوی محمد عبدالوہاب صاحب، رمن راج سکینہ صاحب نصیر الدین ہاشمی صاحب، مسعود رضوی صاحب، حمید الدین شاہد صاحب، قاضی داور حسین صاحب، مجید صدیقی صاحب اور ڈاکٹر زور صاحب نے شرکت کی اور یوم محمد قلی کے بارے میں ضروری انتظامات طے کئے۔

● ۷ بجے شام ۔ شری سریش کھنگل صاحب آئی اے ایس ڈپٹی سکریٹری اغذیہ اتر پردیش ادارے کے معائنہ کے لئے تشریف لائے اور زیر تعمیر عمارت دیکھی۔

پیر ۔ ۱۶ر ڈسمبر

۵ بجے شام ۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں مرثیہ خوانی کی ذیلی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں نواب عنایت جنگ بہادر، مولانا سید علی اصغر بلگرامی صاحب، مولوی محمد عبدالوہاب صاحب اور ڈاکٹر زور صاحب نے شرکت کی اور اس مجلس کا تفصیلی پروگرام طے کیا۔

منگل ۔ ۱۷ر ڈسمبر

۵ بجے شام ۔ آندھرا پردیش کے وزیر تعلیم شری بیابجی راماراؤ ادارے کے معائنہ کے لئے تشریف لائے۔ زیر تعمیر عمارت دیکھ کر اس کی وسعت اور خوش اسلوبی پر مسرت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر ادارے میں جانکی پرشاد صاحب، نصیر الدین ہاشمی صاحب، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، نواب منصب جنگ بہادر، نواب میر باسط علی خاں صاحب، مسز رودا مستری، سرینواس لاہوٹی صاحب معتمد ہندی پرچار سبھا، شری ڈی راما نجا راؤ معتمد آندھرا ساہتیہ اکاڈیمی، خواجہ حمید الدین صاحب شاہد، نواب میر معظم علی خاں صاحب وغیرہ بھی ادارے میں تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر زور صاحب معتمد ادارہ نے وزیر تعلیم کا خیر مقدم کیا اور ادارے کے بارے میں تفصیلات بیان کیں۔ وزیر تعلیم نے اپنی جوابی تقریر میں ادارے کے کام پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور کارکنوں کو مبارکباد دی۔

اتوار ۔ ۲۲ر ڈسمبر

۱۱ بجے صبح مجلس جلوس و نمائش یوم محمد قلی کا ایک مشترکہ اجلاس منعقد ہوا ۔ مولوی محمد عبدالوہاب صاحب، جناب سرینواس لاہوٹی صاحب، ڈاکٹر رحیم الدین کمال صاحب، جناب مسعود احمد رضوی صاحب، جناب کاوس جی صاحب، خواجہ حمید الدین صاحب شاہد، جناب رمن راج سکسینہ صاحب، پروفیسر مجید صدیقی صاحب، راجہ امین چند دین دیال صاحب، ڈاکٹر زور صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔ جلسہ گاہ کا انتخاب، جلوس کی ترتیب اور نمائش کی تفصیلات طے کی گئیں۔

منگل ۔ ۲۴ر ڈسمبر

۹ بجے صبح ۔ ڈاکٹر اے ۔ نارائن راؤ صدر آندھرا ملنڈا ضلع کرشنا ادارے میں تشریف لائے اور اپنے ادارے کی کتابیں بطور تحفہ دیں۔

چہارشنبہ ۔ ۲۵ر ڈسمبر

۱۰ بجے صبح ۔ مولوی محمد عبدالوہاب صاحب کنوینر نمائش یوم محمد قلی اور ڈاکٹر زور صاحب نے حیدرآباد کے میئر شری بی کشن لال سے ملاقات کی اور بانی شہر حیدرآباد کی یادگاری تقریبات میں بلدیہ حیدرآباد کے تعاون کی تفصیلات طے کیں۔

● ۴ بجے شام ۔ ہز اکسلنسی شری بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش ادارے میں تشریف لائے اور تفصیلی معائنہ کیا۔ اس موقع پر ایک عصرانہ میں حیدرآباد کے اکثر خدمت گذاران اردو اور ادیب و شاعر مدعو تھے۔

● ۱/۲ ۵ بجے شام ۔ یوم محمد قلی کی مجلس نمائش کا اجلاس منعقد ہوا جس میں پروفیسر مجید صدیقی، مولوی محمد عبدالوہاب صاحب، زین العابدین رضوی صاحب، رمن راج سکسینہ صاحب، مرزا ضامن علی غازی صاحب، مسعود احمد رضوی صاحب، راجہ دین دیال صاحب،

نصیر الدین ہاشمی صاحب، حفیظ صدیقی صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔ نمائش کی تصاویر اور ارکان استقبالیہ کے لئے بیاجس اور آتشبازی وغیرہ کے انتظامات طے کئے گئے۔

جمعرات۔ ۲۶ر ڈسمبر

۲ بجے۔ یوم محمد قلی کے سلسلہ میں پروفیسر مجید صدیقی، مولوی عبدالوہاب صاحب اور ڈاکٹر زور صاحب نے حیدرآباد میوزیم کا معائنہ کیا اور نمائش محمد قلی کے سلسلے میں اس کے تعاون کی تفصیلات طے کیں۔

ریسرچ فیلوشپ

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ہر سال اردو کے اعلیٰ تحقیقی کام کی ہمت افزائی کے لئے مختلف یونیورسٹیوں کے پی۔ ایچ۔ ڈی اور ایم۔ اے کے طلبہ و طالبات کو ماہانہ پچاس روپے کا وظیفہ دیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں مس رشیدہ موسوی ایم۔ اے کو یہ وظیفہ جاری کیا گیا تھا جو ۱۹۵۷ء میں بھی جاری رہا۔ وہ دکن کے مشہور ادیب مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کی نگرانی میں حیدرآباد کے استاذالاساتذہ حضرت حافظ میر شمس الدین محمد فیض تلمیذ حافظ میر تاج الدین مشتاق دہلوی کے حیات اور کارناموں پر ایک مقالہ مرتب کر رہی تھیں۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں اس کو مکمل کر کے ادارے میں داخل کیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ مقالہ ادارے کی طرف سے ۱۹۵۸ء کی مطبوعات میں شائع کیا جائے گا۔

اس مقالے کی نسبت مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے یہ رائے لکھی ہے:۔

> "اس میں شک نہیں کہ فیض کے متعلق جو معلومات اس مقالے میں پیش ہوئی ہیں اس کو جامع اور مکمل کہنا چاہیئے اور میں اس کامیابی پر رشیدہ موسوی کو مبارکباد دیتا ہوں۔"

دفاتر آندھرا میں اردو کی مفت تعلیم

ادارۂ ادبیات اردو نے ۱۹۴۰ء سے تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز کیا۔ نصاب مرتب کیا گیا اور مشہور ماہر تعلیم مولوی سجاد مرزا صاحب کی نگرانی میں کتابیں تیار کروا کے چھپوائی گئیں۔ اس منصوبہ کے تحت ہر سال امتحانات اردو منعقد ہوتے رہے۔ ۱۹۴۷ء تک ان امتحانوں میں شریک ہونے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوتا رہا۔ تقریباً ہر ضلع اور ہر تعلقہ میں امتحانات کے مراکز بڑی سرگرمی سے کام کرتے رہے۔ نہ صرف حیدرآباد اور اس کے اضلاع میں بلکہ بمبئی، بنگلور، ناگپور اور برار میں بھی تعلیم بالغان کے مراکز قائم کئے گئے جن میں اردو دانی، اردو زباندانی، اردو عالم، اردو فاضل اور خوش نویسی کے امتحانات لئے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ملک کے حالات بدل گئے تو اس کا اثر تعلیم بالغان کی اردو جماعتوں پر بھی پڑا۔ جب حکومت ہند نے سوشیل ایجوکیشن سنٹر کے قیام سے اتفاق کیا تو پھر یہ جمود ٹوٹا اور ان امتحانات سے دلچسپی لینے والوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہوگیا۔ چنانچہ جون ۱۹۵۵ء میں اردو فاضل، اردو عالم، اردو زباندانی اور اردو دانی کے امتحانات چار مرکزوں میں ایک ساتھ لئے گئے جن میں جملہ (۱۷۹) بالغوں نے شرکت کی اور (۹۶) افراد نے کامیابی حاصل کی۔ پھر ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو صرف اردو دانی اور اردو زباندانی کا امتحان دوبارہ تین مراکز پر لیا گیا جن میں (۱۷۴) بالغوں نے شرکت کی اور (۱۲۳) نے کامیابی حاصل کی۔ اس طرح ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات نے اہل ملک کی جہالت کو دور کرنے اور انھیں اردو سکھانے میں مقدور بھر کوشش کی جس کی قائدین ملک نے بے پایاں ستائش کی ہے۔

یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو جب آندھرا پردیش کا قیام عمل میں آیا تو ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے جنوری ۱۹۵۷ء میں ایک مراسلہ کے ذریعہ آندھرا سے آنے والے تلگو داں حضرات سے خواہش کی گئی کہ ادارہ بلا معاوضہ قابل اساتذہ کی نگرانی میں اردو تعلیم کا پیش کش کرتا ہے۔ یہ تحریک ایک سرکیولر کے طور پر آندھرا پردیش کے جملہ وزراء، معتمدین، انتظامات اور صدور محکمہ جات کے پاس شخصی طور پر نام بہ نام روانہ کی گئی۔

مراسلۂ ادارہ کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

منجانب معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو } مقدمہ:۔ ملازمین
خیریت آباد۔ حیدرآباد ۴ } سرکار آندھرا پردیش
حیدرآباد کیلئے اردو تعلیم
کا بلا معاوضہ پیش کش۔

جناب والا! غالباً اکثر وزراء اور عہدہ داران آندھرا پردیش اپنی گوناگوں پبلک اور سرکاری مصروفیات اور ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلے میں محسوس کر رہے ہوں گے کہ اردو زبان کی واقفیت سے انہیں بے حد سہولت ہوگی اور وہ اس زبان کو سیکھنے کے خواہش مند بھی ہوں گے۔

یہ ادارہ جو گذشتہ (۲۶) سال سے اردو کی ترقی اور اشاعت میں کوشاں ہے اور تعلیم بالغان کے سلسلہ میں نصاب کی ترتیب، کتابوں کی اشاعت، مکتبوں کے قیام اور امتحانات کے انعقاد میں مصروف ہے۔ تمام ملازمین سرکار کو اردو سکھانے کی غرض سے بلا معاوضہ خدمات انجام دینے اور ممکنہ سہولتیں بہم پہونچانے کے لئے آمادہ ہے۔ ادارہ ہٰذا اردو کی تعلیم کے لئے ایسے اساتذہ کا انتظام کرسکتا ہے جو انگریزی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ قوی توقع ہے کہ وہ آندھرا سے آنے والے عہدہ دار جو اردو سیکھنے کے خواہش مند ہیں اس بلا معاوضہ پیش کش کو قبول فرمائیں گے۔

ادارہ سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے ایک انگریزی کتابچہ بھی ذریعہ ہٰذا مرسل خدمت ہے۔

ادارہ ہٰذا ایسے تمام اشخاص کو جو حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد کے مختلف محکموں میں کارگذار ہیں بلا معاوضہ اردو تعلیم کا انتظام کرے گا بشرطیکہ کم سے کم ہر جماعت دس افراد پر مشتمل ہو اور مقام اور کشستوں کا انتظام کیا جائے۔ براہ کرم جناب والا کے محکمہ میں اس کی مناسب تشہیر کی جائے اور خواہش مند حضرات کے بارے میں مطلع کیا جائے تاکہ جلد از جلد ضروری انتظامات کئے جاسکیں۔

جواب کا متمنی

معتمد اعزازی ادارہ

خوشی کی بات ہے کہ آندھرا پردیش کے حکام نے اس کو پسند کیا اور چیف سکریٹری نے اپنے مراسلہ نشان ۱۱۸۶ مورخہ ۱۳ر فروری کے ذریعہ سے آندھرا کے جملہ دفاتر کے نام ایک گشتی جاری کر کے اس اہم تحریک کی طرف ان کو متوجہ کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے آنریبل بی۔ گوپال ریڈی صاحب نے معتمد ادارہ کو مطلع کیا اور ان کے ذوق اردو کو اجاگر کرنے کا کام خواجہ حمید الدین شاہد صاحب کے ذمہ کیا گیا۔

۲۵ر فروری سے محکمۂ نظامت طبابت میں شری نارائن راؤ بی۔ اے نے ہفتہ میں دو بار اس دفتر کے (۲۰) اصحاب کو اعزازی طور پر اردو پڑھانے کا کام شروع کیا۔

۶ر مارچ کو ناظم محکمۂ معاشیات و شماریات نے اطلاع دی کہ ان کے محکمہ کے ملازم اردو سیکھنا چاہتے ہیں مفت تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۱۵ر جون کو محکمۂ پبلک سروس کمیشن آندھرا پردیش نے اطلاع دی کہ اس کے (۱۳) ملازمین

اردو پڑھنے کے خواہش مند ہیں۔ ادارے کی طرف سے مفت تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۵ راکتوبر سے شری جے۔سی۔ ہارڈیکر چیف انجنیر حکومت آندھرا پردیش کی خواہش پر ان کے اور ایکزیکیٹو انجنیر کے عملہ کے (۳) اصحاب کو اردو پڑھانے کا مفت انتظام کیا گیا۔

مئی ۱۹۵۷ء سے سررشتہ نظامت طبابت آندھرا پردیش کے تلگو داں حضرات کو شری سعادت نظیر ایم۔اے "اردو دانی" کا درس دے رہے ہیں۔ ان حضرات کی تعلیمی حالت اطمینان بخش ہے اور یہ لوگ اردو دانی کی پہلی کتاب ختم کر چکے ہیں۔ اردو بات چیت قدرے کرنے لگے ہیں اور اردو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

جون ۱۹۵۷ء میں سررشتہ معتمدی زراعت آندھرا پردیش کے تلگو داں حضرات کو شری سعادت نظیر ایم۔اے "اردو دانی" کا درس دے رہے۔ ان حضرات کی حالت بھی اطمینان بخش ہے اور یہ لوگ اردو دانی کی پہلی کتاب ختم کر چکے ہیں اور قدرے اردو بات چیت بھی کر سکتے ہیں۔ نیز اردو بآسانی سمجھنے لگے ہیں۔

ستمبر ۱۹۵۷ء سے تعمیرات عامہ آندھرا پردیش کے تلگو داں حضرات کو شری حبیب ابراہیم "اردو دانی" کا درس دے رہے ہیں۔ ان حضرات کی حالت بھی اطمینان بخش ہے۔ اردو دانی کی پہلی کتاب ختم ہو چکی ہے اور دوسری شروع کی گئی ہے۔ اردو بات چیت سمجھتے ہیں اور کچھ کہنے بھی لگے ہیں۔

سرکاری محکموں کے جو اصحاب اردو کی مفت تعلیم سے پابندی کے ساتھ خاطر خواہ مستفید ہو رہے ہیں ان میں حسب ذیل کے نام قابل ذکر ہیں۔

محکمہ طبابت

(۱)	شری سی۔ کمار اسوامی	سپرنٹنڈنٹ
(۲)	شری جی۔ وی۔ جگناتھم	"
(۳)	شری کے۔ وی۔ سوریا راؤ	"
(۴)	شری پی۔ کرشنا راو	یو۔ ڈی۔ سی
(۵)	شری آر۔ ایس۔ چکراپنی	"
(۶)	شری جی۔ جگنا دھر راؤ	"
(۷)	شری ایل۔ نرسنگ راؤ	"
(۸)	شری اے۔ سبرامنیم	"
(۹)	شری یم۔ ویاسولو	"
(۱۰)	شری یم۔ وی۔ ڈی۔ پرساد راؤ	یل۔ ڈی۔ سی
(۱۱)	شری وائی۔ ایم۔ گرومورتی	"
(۱۲)	شری پی۔ دراسوامی	"
(۱۳)	شری پی۔ سبرامنیا	"
(۱۴)	شری کے۔ رسیارا ایودو	"
(۱۵)	شری یم۔ گروناتھم	"
(۱۶)	شری سی۔ تھیاگارایودو	سپرنٹنڈنٹ
(۱۷)	گوبندا راجولو	پیون

محکمہ معتمدی زراعت

(۱)	شری یم۔ پاپا راؤ	سپرنٹنڈنٹ
(۲)	شری سیتارا ما شاستری	"
(۳)	شری بسویا نائیڈو	"
(۴)	شری کے۔ بی۔ مادھوا راؤ	"
(۵)	شری سبرامنیا چاری	"
(۶)	شری ٹی۔ سبا راؤ	یو۔ ڈی۔ سی
(۷)	شری گمپو سوامی	"
(۸)	شری سیوا راما سرما	"
(۹)	شری اے۔ آئی۔ آئی۔ آئی۔ نرسما مورتی	"

(۱۰) شری ٹی سوریا راؤ — یو۔ڈی۔سی
(۱۱) شری بی۔ راوی کمار — "
(۱۲) شری کے۔وی۔ اننتا چاری — سپرنٹنڈنٹ
(۱۳) شری کے۔ مانیکم پلائی — "
(۱۴) شری کے۔ بھیما شنکرا مورتی — "
(۱۵) شری سی۔ یلنا — ٹائپسٹ

محکمہ فینانس

(۱) شری گوارودھنا راؤ — ٹائپسٹ

محکمہ تعمیرات

(۱) شری کے سیتاراما شاستری (بی۔اے، بی۔ای، ایم۔اے، ای۔بی) ایگزیکٹیو انجنیر
(۲) شری جے۔ پرشوتم (جی۔ای، ایم۔ای، ایم۔اے، ای۔آئی، اے۔ایم۔اے۔ایس۔سی، ای، یو۔ایس۔اے) اسسٹنٹ انجنیر
(۳) شری اے لکشمنا سوامی (جی۔ای) اسسٹنٹ انجنیر
(۴) شری ایس۔ ایس۔ آر۔ انجنیلو (بی۔ای) جونیر انجنیر
(۵) شری ایس۔ ایچ۔ وی۔ رامنیا (بی۔ای) "
(۶) شری جی۔ کرشنا جی (بی۔ای) "
(۷) شری ایم۔ رامیا (بی۔اے، بی۔ای) "
(۸) شری ایم۔ جی۔ ای۔ دیانندراؤ (بی۔ای) "
(۹) شری جے۔ وینکٹیشورراؤ — سکنڈ گریڈ آفس مین
(۱۰) شری جے۔ این۔ سوریہ نارائن راؤ — ڈرافٹس مین
(۱۱) شری جے۔ ڈی۔ وینکٹیا — ٹریسیر
(۱۲) شری ایم۔ ڈی۔ حسین بیگ — "
(۱۳) شری یس۔ وی۔ یشرما — اسٹینو ٹائپسٹ
(۱۴) شری ایم۔ ھکیا — ہیڈ کلرک
(۱۵) شری وی۔ راگھوراماراؤ — یو۔ڈی۔سی
(۱۶) شری اے۔ ایلیا شاستری — یل۔ڈی۔سی
(۱۷) شری یس۔ عبدالغنی — "
(۱۸) شری کے۔ سری راما مورتی — "
(۱۹) شری جی۔ اچاری — "
(۲۰) شری پی۔ سری دھرراؤ — "

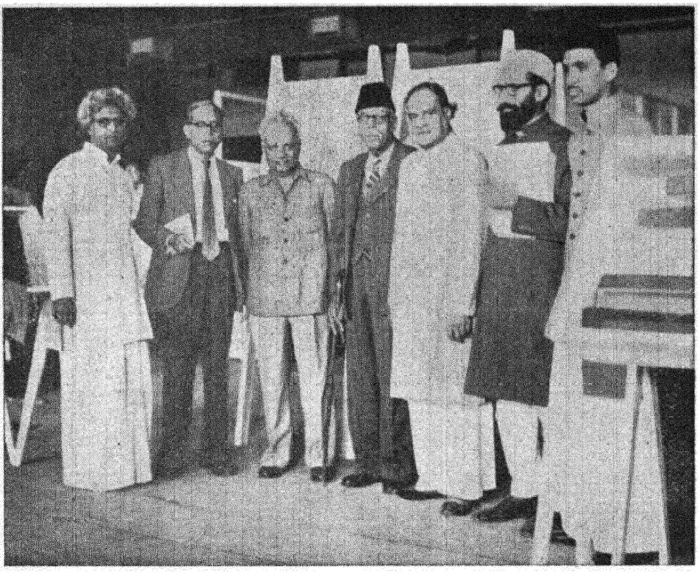

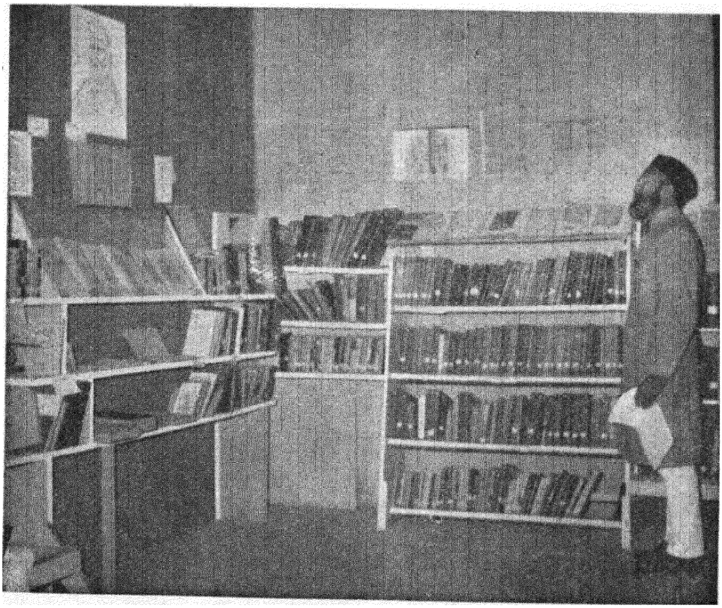

ساہتیہ اکادیمی دہلی کی طرف سے ہندوستانی زبانوں کے ادب کی نمایش میں اردو ادب کا حصہ ترتیب دینے والے مشاہیر اردو۔

خواجہ حسن ثانی نظامی۔ امتیاز علی خاں عرشی۔ ڈاکٹر زور۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ قاضی عبدالودود۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ قیصر زیدی۔

علمی و ادبی تعاون

(۱۹۵۸ء میں ادارے کی طرف سے اردو دنیا کے مختلف حصوں کے ارباب علم و تحقیق کے کاموں میں جو معاونت کی گئی ہے اس میں حسب ذیل امور قابل ذکر ہے۔)

تنویر علوی صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کو ذوق اور مہاراجہ چندولال کے تعلقات کے بارے میں مواد فراہم کیا گیا۔

●

ضیاء الدین برنی صاحب تعلیمی مرکز کراچی کو محمد مارماڈیوک پکتھال اور ان کی اہلیہ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔

●

مولانا محمد عبدالحلیم صاحب چشتی آرام باغ کراچی کو ان کی تالیف " وحیدالزماں حیدرآبادی " کے سلسلہ میں وحیدالزماں وقار نواز جنگ کی آخری زندگی اور قبر و تاریخ وفات کے بارے میں معلومات ارسال کی گئیں۔

●

اردو کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ کو مخطوطۂ دیوان زادۂ حاتم سے ان کی ابتدائی غزلوں کے بارے میں اطلاع دی گئی۔

●

غالبیات کے ماہر مالک رام صاحب ایم۔ اے کی خواہش پر ادارہ کے قلمی تذکرۂ ضیم سے مرزا غالب کے اہم شاگردوں کی فہرست مرتب کر کے ارسال کی گئی۔

●

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب ایم۔ اے، ڈی لٹ پروفیسر اردو الہ آباد کو وجہی، بحری وغیرہ اور دکنی لغات کی نسبت مواد فراہم کیا گیا۔

●

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب پروفیسر اردو لکھنؤ کو اورنگ آباد کے مشہور شاعر الف خان بیتاب

کی نسبت معلومات بھیجی گئیں۔

●

ا۔ل۔ خطیب صاحب پریس کلب ڈھاکہ کی خواہش پر ہند پاکستان منتخبات نظم و نثر کی ترتیب کے سلسلے میں ہندوستان کے نوخیز شاعروں اور ادیبوں کی فہرست اور پتے فراہم کئے گئے۔

●

سروجنی دیوی سوسائٹی حیدرآباد کو سروجنی جنم دن منانے کے لئے رقمی عطیہ دیا۔

●

مالک رام صاحب ایم۔ اے کی خواہش پر تذکرۂ یادگار ضیغم سے مرزا غالب کے حسب ذیل تلامذہ کے حالات اور کلام کی نقلیں ارسال کی گئیں۔

بسمل، شوکت، صاحب، فوق، محمود، وحید۔ ان کے علاوہ منشی شیو نرائن آرام کے کلام کی بھی نقل بھیجی گئی۔

●

محکمۂ وزارت تعلیم حکومت ہند کی خواہش پر ظاہرہ کالج کولمبو کی نمائش اسلامیات میں ادارے کی طرف سے ممکنہ تعاون کا پیش کش کیا گیا۔

●

ضیاء الدین احمد برنی صاحب تعلیمی مرکز کراچی کو بعض یوروپین شعرائے اردو کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔

●

مولوی عبدالرزاق راشد صاحب مرتب "کلیات اقبال" نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ رسالہ اردو ۱۹۳۵ء کی نقل حاصل کی۔

●

انجمن تعمیر ملت حیدرآباد کے یوم اقبال کی نمائش کے لئے ادارے کی طرف سے اقبال کے ۱۸ خطوط اور اقبالیات سے متعلق ۳۶ مطبوعات اور ۹۲ رسائل کی جلدیں دی گئیں۔

●

پیرزادہ عبدالقیوم صاحب ڈنل شاہ حیدرآباد سندھ کو سندھی زبان کے آغاز و ارتقا سے متعلق معلومات ارسال کی گئیں۔

●

پروفیسر عبدالحی سید سینٹ زیویر کالج بمبئی کو ملا نصرتی بیجاپوری کے بارے میں معلومات ارسال کی گئیں۔

●

مولوی سید عبدالجلیل صاحب ماٹل بی۔ اے بھوپال نے مخطوطات دیوان مجرم شاگرد بیدار، کلیات ممنون دہلوی اور قصہ مور پنکھی از میراں من دہلوی کے بارے میں استفسار کئے تھے۔ جن کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔

●

انصار فضلی صاحب انعامدار درھا ضلع الیت محل برار کو برار کی ادبی تاریخ کی ترتیب سے متعلق ضروری مشورے دیئے گئے اور معلومات فراہم کی گئیں۔

●

پروفیسر سید علی حیدر ایل ایس کالج مظفرپور بہار کو ادارے کے مخطوطہ دیوان سوز کے بارے میں تفصیلات ارسال کی گئیں۔

●

راجیندر ناتھ شیدا صاحب بول وارد روڈ دہلی کو نواز کے ترجمہ شکنتلا کی بابت استفسار کے جواب میں معلومات فراہم کی گئیں۔

●

ظہیرالدین احمد میموریل لائبریری کے لئے ادارے کی ۱۵۲ مطبوعات بطور عطیہ دی گئیں۔

●

شری آر۔ پی۔ مالویہ اسپیشل آفسر ادبیات وزارت تعلیم حکومت ہند کی خواہش پر ادارے کی طرف سے ایسے اصحاب کی فہرست مرتب کر کے ارسال کی گئی جو اردو میں بچوں کے ادب کے بارے میں ماہرانہ بصیرت رکھتے ہیں۔

●

کریم الدین احمد صاحب ایم۔ اے لکچرار اردو میرپور خاص مغربی پاکستان کے امیر مینائی سے متعلق استفسارات کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔

●

مقبول انور داؤدی صاحب فیروز سنس لاہور کو ان کے انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تبویب کے بارے میں مشورہ دیا گیا۔

●

محمد ایوب اولیا، ۳ نور باوا گوجرانوالہ پاکستان کو حضرت امجد حیدرآبادی کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئیں۔

●

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صدر شعبہ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی کو ادارے کے مخطوطہ دیوان فارسی میر سے مثنوی در فراق دہلی کی نقل ٹائپ کرا کے دی گئی۔

●

قطب النساء ہاشمی صاحبہ ایم۔ اے نے ایک قلمی کتاب مثنوی نادر کا تحقیقی مطالعہ کر کے اردو کے اس

پہلے سفرنامے کی نسبت معلومات حاصل کیں۔

•

محمد معزالدین صاحب ایم۔ اے لکچرار اردو جگن ناتھ کالج ڈھاکہ کے استفسارات بابت قائم چاندپوری کا جواب دیا گیا

•

نیشنل لائبریری کلکتہ کو کتاب انڈین پبلشرس ڈائرکٹری کی تیاری کے لئے معلومات فراہم کی گئیں۔

•

شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی مہتمم حالی پبلک لائبریری رام گلی نمبر ۱۴ لاہور کو اردو اور فارسی کے ایسے اخبارات کی نسبت معلومات ارسال کی گئیں جو سنہ ۱۸۲۲ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک ہندوستان و دکن میں جاری ہوئے تھے۔

•

شیخ فرید صاحب ایم۔ اے برہانپور کو ادارے کے مخطوطات منظومات ہجویہ و دیوانچہ آتشی سے متعلق معلومات ارسال کی گئیں۔

•

مرزا ظفرالحسن صاحب ریڈیو پاکستان کراچی کو ان کی زیر تالیف کتاب (اردو ادب میں طوائف کا تذکرہ) کے لئے معلومات فراہم کی گئیں۔

•

محمد یونس صاحب کانپوری نے ادارے کی قلمی کتابوں سے استفادہ کیا اور خاص کر خورم علی صاحب کے مخطوطات کا مطالعہ کیا۔

•

عبدالحق صاحب ایم۔ اے متعلم پی ایچ ڈی ڈھاکہ یونیورسٹی کے استفسارات بابت صنعت ایہام و تذکرہ نگاران اردو کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔

•

خلیق انجم صاحب ایم۔ اے لکچرار اردو کراوڈی مل کالج دلی یونیورسٹی کو خواجہ بندہ نواز کی نظم چکی نامہ (مخطوطہ ادارہ نمبر ۱۲۰ ب) کی نقل روانہ کی گئی۔

•

ڈاکٹر مسز اوشا اتھالے ایم۔ اے پی ایچ ڈی پونہ کو مخطوطات ابراہیم نامہ عبدل و گلشن عشق کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔

•

مس رشیدہ موسوی ایم۔ اے نے میر شمس الدین محمد فیض کی قلمی کتابوں سے اپنے تحقیقی کام کے سلسلہ میں استفادہ کیا۔

•

غلام صابر صاحب شکیب متعلم ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی لاہور کو ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں کے بارے میں

معلومات فراہم کی گئیں۔

●

ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی خواہش پر دکن میں مرثیہ نگاری کی تفصیلات اور تحقیقاتی وسائل پر معلومات ارسال کی گئیں۔

●

ابراہیم یوسف صاحب ایم۔ اے، بی ایڈ بھوپال کو اردو میں بچوں کے لئے جو کتابیں مختلف موضوعوں پر شائع ہوئی ہیں ان کی ایک فن وار فہرست ارسال کی گئی۔

●

ادارے کے بارے میں
معاصرین کے تاثرات

۱۔ حضرت ایم۔ اسلم صاحب (لاہور)

ادارہ ۱۹۳۱ء سے آپ حضرات عزیب اردو زبان کی جو شاندار خدمت کر رہے ہیں۔ آنے والے زمانہ کا مورخ اس کا تذکرہ سنہری حروف میں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

۱۴؍ جنوری ۱۹۵۶ء
نیاز مند — ایم اسلم

۲۔ جناب گوپی چند صاحب نارنگ ایم۔ اے (دہلی)

ادارہ ادبیات اردو آپ کی نگرانی میں اردو کی جو اہم خدمت کر رہا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ادبی احسان ناشناسی ہوگی۔ اعلیٰ ادبی کام ہمیشہ بے غرض اور بے لوث محنتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مبارک ہیں آپ لوگ جنھوں نے اس ادارے کو بغیر سرکاری امداد یا درباری اعانت کے شروع کیا تھا۔ ادارے کا بے مثل کتب خانہ آج اردو کے چند بہترین کتب خانوں میں گنا جاتا ہے۔ امید ہے اپنی علمی اور تحقیقاتی مشاغل کے ساتھ ساتھ ادارہ آندھرا میں اردو کو مقبول بنانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھے گا۔

نارنگ

۳۔ جناب میر سکندر علی صاحب وجد (ناندیڑ)

آپ کے عزم و ہمت کی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ آپ اس اردو بیزاری کے دور میں وہ کام کر رہے ہیں جو حیدرآباد میں اردو نوازی کے زمانے میں کبھی نہ ہو سکا۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے ۔۔۔ وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

۲۳؍ ڈسمبر ۱۹۵۶ء
خادم — وجد

۴۔ ڈاکٹر محمد باقر صاحب۔ صدر شعبہ اردو و فارسی اورینٹل کالج (لاہور)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد (دکن) گزشتہ ستائیس سال سے علم و ادب اور تحقیق کے میدان میں نہایت مفید خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اردو فیلوشپ، رسالہ سب رس، سوشیل سنٹرز، کتب خانہ مطبوعات اور دیگر علمی اور ادبی سرگرمیاں اس ادارہ کا ہدف رہی ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین زور اس ادارے کے روح رواں ہیں اور ان کی نگرانی، کاوش اور کمک سے جو معیاری کام کیا جا رہا ہے اس کیلئے وہ قابل صد تبریک ہیں۔

محمد باقر

ادارے کی مطبوعات

معاصرین کی نظر میں

"۱۹۵۵ء میں ادارے کی مطبوعات سے متعلق ہند و پاکستان کے رسائل و جرائد میں جو تبصرے شائع ہوئے ہیں ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔"

ارمغان امجد

جناب امجد حیدرآبادکے مشہور شعراء میں سے ہیں۔ آپ اردو میں رباعی کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ نہ صرف نفسِ فن کی حد تک بلکہ مضامین وخیالات کے اعتبار سے بھی آپ بلند پرواز ہیں۔ سرسری مطالعہ سے ہی یہ واضح ہوگیا کہ اس میں جناب امجد کا بہت مفصل تعارف کرایا گیا ہے۔ آپ کے خاندانی احوال گھریلو زندگی معاشرت اور تہذیب و اخلاق وغیرہ پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدم بہ قدم آپ کی رباعیات بھی نشاط قلب ونظر کے لئے موجود ہیں۔ کتاب میں جلسوں اور مشاعروں وغیرہ کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ چلتے چلتے اتنا کہدوں کہ حال امجد کا ایک مکتوب پڑھا ہے۔ بڑا ہی غضب کا ہے۔ کوزہ میں دریا، اختصار میں تفصیل، لطیف اشاریت اور ذہانت کا آئینہ سلامتی فکر ونظر کا مرقع۔ اگر میں نے اس خط کے سوا امجد کی کوئی اور چیز کبھی نہ پڑھی ہوتی تب بھی میں کہتا کہ اس کا خط کا لکھنے والا بہت ذہین اور بڑی صلاحیتوں کا مالک ہے۔

عامر عثمانی

"تجلی" دیوبند (اپریل ۱۹۵۵ء)

حیدرآباد کے مشہور صوفی شاعر سید احمد حسین امجد کے یادگار جشن الماسی کے مقالات، نظموں، مشاہیر کے بیانات اور تقریبات کی تفصیلی روداد جو خواجہ حمیدالدین شاہد ایم۔ اے نے مرتب کی اور ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (دکن) کی طرف سے شائع ہوئی۔

رسالہ اردو۔ کراچی (پاکستان) (جنوری ۱۹۵۷ء)

خیام وقت حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی کا جشن الماسی جنوری ۱۹۵۵ء میں بڑے اہتمام سے ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے منایا گیا تھا۔ جس میں حکیم الشعراء کی شاعری اور ان کے حالات زندگی پر مقالات، نظمیں وغیرہ پڑھی گئی تھیں۔ شاہد صاحب نے جشن الماسی کے معتمد کی حیثیت سے ان مقالات اور اس کے متعلق دیگر تحریرات

کو "ارمغان امجد" کے نام سے جمع کر کے اب ان کو شائع کر دیا ہے۔
مقالات کے حصہ میں حضرت امجد کی گھریلو زندگی حکیم الشعراء اور نقیر گیلانی و امجد بحیثیت شاعر و انسان ، دکن کا نامور شاعر پڑھنے کے لائق ہے ۔ سپاس نامہ تاریخی دستاویزات ہیں جن کو ہماری آنے والی نسلیں شوق سے پڑھے گی اور سبق لے گی۔
جشن سیمیں کی تقریب کو کیمرہ والے تصویر کشا نے سات تصویروں میں محصور کر لیا ہے اور ساتوں تصاویر یادگار اور قیمتی ہیں جو اس مجموعے کی زینت ہیں۔

"الفاروق" ہفتہ وار (جنوری ۱۹۵۵ء)

پن چکی (اورنگ آباد)

کہتے ہیں کہ اورنگ آبادی کی پن چکی اپنی دلکشی اور دلفریبی کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں بے مثال ہے۔ جو لوگ اجنتا اور ایلورہ کے مشہور عام غاروں کو دیکھنے آتے ہیں وہ یہاں بی بی کا مقبرہ اور پن چکی کو ضرور دیکھتے ہیں ۔ پن چکی دو قدسی نفس فقرا حضرت بابا شاہ مسافر اور حضرت بابا پلنگ پوش نقشبندی کے فیض قدم سے جنت کا نمونہ چمن زار بن چکی ہے ۔ زیر نظر کتاب میں ان ہی بزرگوں کے حالات اور پن چکی کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ انداز بیان دلکش ہے ۔ بلا پوری کتاب پڑھے اس کو ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

"الفاروق" ہفتہ وار (جنوری ۱۹۵۵ء)

اورنگ آباد اپنی تاریخی عظمت اور قدیم یادگاروں کے اعتبار سے بڑی اہمیت اور مجد و شرف کا حامل ہے۔ دولت آباد کا قلعہ ، خلد آباد اور اجنتا ، ایلورہ کے محیر العقول غار (caves) اورنگ آباد ہی کے سواد میں واقع ہیں۔
اورنگ آباد کی پن چکی بھی بڑی تاریخی چیز ہے اور فن آب رسانی کے اس ترقی یافتہ عہد میں بھی وہ نادر و عجیب ہی سمجھی جاتی ہیں۔ جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت نے اسی "پن چکی" کی تاریخ لکھی ہے اور بڑی تحقیق و کاوش سے لکھی ہے۔ کتاب کے عنوانات —— اورنگ آباد کی تاریخ۔ پن چکی کا محل وقوع ۔ حضرت بابا محمد سعید پلنگ پوش نقش بندی ۔ حضرت محمد عاشور بابا شاہ مسافر ۔ بابا شاہ محمود ۔ بابا شاہ محمود کے جانشین ۔ پن چکی کی نہر اور عمارتیں ۔ پن چکی کے بارے میں بعض مشاہیر کی رائیں۔

"فاران" کراچی (مارچ ۱۹۵۵ء)

حضرت بابا شاہ محمد سعید پلنگ پوش نقش بندی اور حضرت محمد عاشور بابا شاہ مسافر کی زندگی کے تفصیلی حالات اور نہر پن چکی اور پن چکی کی تاریخ جو مستند ماخذوں سے سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم اے نے مرتب کی ۔ یہ وہی مشہور مقام ہے جہاں ایک زمانے میں ایک عظیم الشان نادر کتب خانہ تھا جس میں ہمارے علم و ادب اور مذہب کی تصانیف کا لاجواب ذخیرہ تھا۔ تعجب ہے کہ مولف نے حال کے ایک معمولی کتب خانہ کا تو ذکر

کیا ہے مگر اس قدیم کتب خانہ کا نام تک نہیں لیا جس کی تعریف و توصیف علامہ آزاد بلگرامی جیسے فاضل نے کی ہے۔
رسالہ "اردو" کراچی (جنوری ۱۹۵۷ء)

حیدرآباد کے بڑے لوگ

ریاست حیدرآباد اب نقشہ سے محو ہوگئی ہے۔ شہر حیدرآباد باقی رہ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس انقلاب کا اثر اس کی روایات پر بھی ہوگا اور پرانی باتیں اور پرانے لوگوں کے نام و نشان مٹتے جائیں گے۔ ادارہ ادبیات اردو قابل ستائش ہے کہ جس نے تاریخ و ثقافت دکن کا شعبہ قائم کر رکھا ہے جو وقتاً فوقتاً پرانی باتوں کو اجاگر کرتا رہتا ہے۔ اس شعبے کے زیر اہتمام ابھی حال میں "حیدرآباد کے بڑے لوگ" نامی کتاب شائع ہوئی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کو مولوی سید غلام پنجتن صاحب شمشاد نے مرتب کیا ہے۔ اس میں حیدرآباد کے نامی گرامی فرزندوں کے حالات درج ہیں۔ اس کو پڑھنے سے حیدرآباد کے پچھلے پچاس سالہ دور کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ انداز بیان سلجھا ہوا اور دلچسپ ہے۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ اچھا ہے۔
"الفاروق" ہفتہ وار (اپریل ۱۹۵۷ء)

سید غلام پنجتن شمشاد علیگڈھ کے پرانوں میں سے ہیں۔ ادب و شعر کے علاوہ سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے حیدرآباد کی پندرہ بڑی شخصیتوں پر مضامین لکھے ہیں جنھیں ڈاکٹر زورؔ نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ شمشاد صاحب کی تحریر رواں اور دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر زور کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے حیدرآباد کی گذشتہ نصف صدی کی زندگی نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور ان اصحاب کی خدمات اجاگر ہوجاتی ہیں جنھوں نے اس مرحوم ریاست کی بیداری اور ہمہ جہتی ترقی کے لئے بے لوث خدمات انجام دیں۔
"ساقی" کراچی (مئی ۱۹۵۷ء)

گاندھی جی

یہ ادارۂ ادبیات اردو کی ایک منظوم کتاب ہے۔ کم لکھے پڑھے لوگوں اور کم عمر بچوں کے لئے اس کو لکھا گیا۔ اس کے ناظم جناب خورشید احمد جامی ہیں۔ آسان اور سہل زبان میں ٹھوس اور مفید باتیں لکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن شاعر کی قادرالکلامی نے اس میدان کو بہت خوبی سے سر کرلیا ہے۔ ابتداء کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ اس کا عنوان ہے دلیس کا سب سے بڑا رہنما۔

"الفاروق" ہفتہ وار (اپریل ۱۹۵۷ء)

اردو کا یہ ۲۴ صفحہ کا کتابچہ ادارہ ادبیات اردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ تین نظموں میں کوئی ڈیڑھ سو کے قریب اشعار ہیں اور ایک مختصر سا پیش لفظ ہے۔ خورشید احمد جامی نے بہت

سہل زبان لکھی ہے۔ بحر بھی چھوٹی ہے۔ کتاب بچوں کے لئے موزوں ہے۔

۱۱ر فروری ۱۹۵۷ء

گوپی ناتھ امن
(مشیر وزارت دہلی)

سروجنی نائیڈو

یہ بلبل ہند سروجنی نائیڈو کی جیون کہانی ہے جس کو جناب وزیر حسن صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو خود سروجنی کے حوالے سے درج ہیں اور کچھ باتیں ان کے بیٹے رندمیر نائیڈو سے سن کر لکھی گئی ہیں۔ مضامین کی ترتیب یہ ہے۔ ۱۔ ماں باپ ۲۔ بچپن ۳۔ پڑھائی ۴۔ بیاہتا جیون ۵۔ کویتائیں ۶۔ اسپیچیں ۷۔ سچائی ۸۔ سندرتا ۹۔ ہندو مسلم اتحاد ۱۰۔ اردو ۱۱۔ جمہوریت ۱۲۔ کمیونزم وغیرہ۔ یہ باتیں (۱۱۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ سرورق پر سروجنی کی تصویر ہے۔ زبان ہندی اور اردو کی ملاوٹ بہت آسان اور شیریں ہے۔ اس کو پڑھنے سے سروجنی کا جیون اور ان کے خیالات سامنے آجاتے ہیں۔ کتاب اپنے مضامین کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے۔ اگر اس کو ادارہ کے نصابات میں رائج کیا جائے تو اچھا اور مفید ہوگا۔

"الفاروق" ہفتہ وار (اپریل ۱۹۵۷ء)

سروجنی دیوی بھارتی کانگریس کی ایک رہنما ہونے کے باوجود گھٹیا قسم کی فرقہ وارانہ تعصب سے بالکل پاک تھیں اور آخر تک پاک رہیں۔ ان کی ذات گوناگوں خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ یہ کتاب حیدرآباد دکن کے وزیر حسن صاحب نے لکھی ہے۔ اس سے قبل جن لوگوں نے ان کی کتاب چاند بی بی سلطان پڑھی ہے وہ ان کے دلچسپ انداز بیان سے خوب واقف ہیں۔ سروجنی نائیڈو میں بھی اسی دلکش انداز بیان کے آثار ملتے ہیں۔ وزیر حسن نے سروجنی دیوی کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ بیان اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کو پڑھ کر سروجنی دیوی کی پاکیزہ اور کامیاب زندگی کی اچھی خاصی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ سروجنی دیوی اور گاندھی جی صاحب کے بلند پایہ اقوال بھی درج ہیں۔ یہ کتاب اپنے ادبی انداز بیان کے لحاظ سے بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

"الحمرا" لاہور (اپریل و مئی ۱۹۵۷ء)

میاں داد خاں سیاح

میاں داد خاں سیاح غالب کے چہیتے شاگردوں میں تھے اور جن لوگوں نے مرزا کے خطوط کا مطالعہ کیا ہے وہ اُن کی دلچسپ اور رنگا رنگ شخصیت سے خوب واقف ہیں۔ سیاح کے دو چار اشعار کے علاوہ ان کے کلام کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سیاح کا اردو دیوان دریافت کرلیا ہے اور اسے مرتب کر کے اردو داں طبقے کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس دیوان میں سیاح کی (۳۴) اردو غزلیں ہیں اور یہ شعر بھی جو اردو کا مقبول ترین شعر ہے ؎

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

مدنی صاحب چونکہ سیاح کے ہم وطن ہیں اس لئے جہاں انھیں اس دیوان کو دستیاب کرنے میں آسانی ہوئی وہاں انھوں نے بڑی کاوش سے سیاح کے حالات زندگی بھی اکٹھا کئے ہیں اور مختلف تذکروں میں سیاح سے متعلق جو مواد بکھرا پڑا ہے اسے یکجا کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو کور کسر رہ گئی تھی وہ اردو زبان کے نامور محقق قاضی عبدالودود صاحب نے "تکملہ" لکھ کر پوری کردی۔ یہ کتاب غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نادر تحفہ ہے۔

"ہماری زبان" علیگڈھ (اگست ۱۹۵۸ء)

تذکرۂ اردو مخطوطات جلد سوم

حیدرآباد کے مشہور ادارہ ادبیات اردو کا کتب خانہ اردو زبان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ نایاب کتابوں کا بڑا قیمتی اور نادر ذخیرہ ہے اس کے تذکرہ کی کئی جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست کی تیسری جلد ہے۔ اس میں دو سو قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست ہے جس میں تصنیف اور مصنف دونوں کے متعلق معلومات بھی دے دیئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں اردو کی بہت سی نایاب کتابیں بکھری ہوئی ہیں جن کا علم بھی کسی کو نہیں اور ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اس لئے لائق مرتب نے یہ فہرست شائع کر کے اردو زبان کی بڑی مفید خدمت انجام دی ہے اور اس پر کام کرنے والوں کے لئے بڑی سہولت پیدا کر دی ہے۔ کتاب کے شروع میں تینوں جلدوں کی مندرجہ کتابوں کی اجمالی فہرست بھی دے دی ہے۔

"معارف" اعظم گڈھ (نومبر ۱۹۵۷ء)

تذکرۂ اردو مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو (جلد سوم) اردو۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور صفحات (۴۰۴)۔ قیمت سات روپے۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔

کتاب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کی قلمی کتابوں کی توصیفی فہرست کی یہ تیسری جلد ہے جو حال میں شائع کی گئی ہے۔ اس جلد میں ادارہ کی دو سو قلمی کتابوں کا تفصیلی جائزہ شامل ہے۔ یہ کتابیں بیشتر فارسی اور اردو کی ہیں۔ آخر میں ایک مفید اشاریہ بھی شامل ہے۔

"مجلہ دانش گاہ پنجاب" لاہور (فروری۔مئی ۱۹۵۸ء)

طالب و موہنی

اس مثنوی کی اہمیت کئی اعتبار سے ہے۔ اول خود اس کا مصنف اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ وہ ایران کے نہایت ہی ممتاز خانوادے کا ایک فرد تھا۔ اس کے جد امجد سید رضی الدین ابوالحسن ذوالحسنین تھے جنھوں نے حضرت علی علیہ السلام کے خطبات و مقالات کو نہج البلاغہ کے نام سے مرتب و مدون کیا۔ سید رضی الدین اور ان کے بھائی سید مرتضیٰ علم الہدیٰ چوتھی صدی کے ان ممتاز ترین علماء میں تھے جن کے حالات سے ساری تاریخیں و تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ سید محمد والہ ایران سے ہندوستان آئے اور وہاں سے حیدرآباد پہنچے۔ یہیں عبداللہ قطب شاہ کے داماد سید نظام الدین احمد..... ...... کی لڑکی سے شادی ہوگئی۔ آندھرا پردیش کے حالیہ وزیر سید محمد مہدی صاحب والہ ہی کی اولاد میں ہیں۔

دوم اس کتاب کی لسانی اہمیت بھی قابل ذکر ہے۔ یہ اس دور کی یادگار ہے جب معیاری دکنی زوال پذیر ہونے لگی تھی اور ادب کا مرکز جنوب سے شمال میں منتقل ہو رہا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے اردو کی لسانی ارتقا کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوگی۔ سوم یہ ہے کہ بقول نصیرالدین ہاشمی میر تقی میر کی دریائے عشق واؔلہ ہی کی مثنوی پر مبنی ہے اور ڈاکٹر زورؔ کا قیاس یہ ہے کہ میرؔ کی مثنوی کے کئی حصے طالب و موہنی سے ماخوذ نظر آتے ہیں اور خاص کر خاتمہ میں تو بالکل اسی کا چربہ اتارا گیا ہے۔ چنانچہ بقول مرتب "اس کی اشاعت سے قدیم اردو کے محققین کو بحث و تحقیق کے لئے ایک نیا موضوع دستیاب ہوگا اور جہاں ابن نشاطی کی پھولبن (۱۰۶۶ھ) سے اس کا مقابلہ کیا جا سکے گا (اس لئے کہ پھولبن سے متاثر ہو کر واؔلہ نے یہ قصہ نظم کیا تھا) میر تقی میرؔ کی دریائے عشق سے بھی اس کا موازنہ ہو سکے گا۔ جو اسی کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ حسن اتفاق سے یہ دونوں پہلے ہی چھپ چکی ہیں اور طالب و موہنی کے چھپنے سے زنجیر کی سب کڑیاں مربوط ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک درمیانی کڑی تھی جو اب تک نظروں سے اوجھل تھی۔ اس کی اشاعت سے میرؔ کی دریائے عشق کا سلسلہ ابن نشاطی کی پھولبن تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو ادب اور زبان کا ارتقا زمان و مکان کی دوریوں کے باوجود فطری مدارج سے گزرتا رہا ہے"۔

طالب و موہنی کے مطبوعہ نسخہ میں (۲۲) صفحے کا عالمانہ مقدمہ شامل ہے۔ پہلے اس کتاب کی اشاعت کی ضرورت بیان کی گئی ہے۔ پھر واؔلہ کے حالات زندگی دئیے گئے ہیں۔ حسن اتفاق سے حالات کے ماخذ میں خود والہ کے ایک شاگرد کی کتاب لمعات الشمس ہے جس کا ایک اہم مخطوطہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر ہے۔ پھر واؔلہ کی (۱۱) تصانیف کا تعارف ہے۔ ان میں سے بعض ڈاکٹر زورؔ کے سامنے ہیں

اتفاق یہ ہے کہ باوجود مثنوی کی شہرت کے اس کا اور کوئی نسخہ ہندوستان میں دستیاب نہیں ہو سکا۔ انڈیا آفس میں ایک نسخہ موجود ہے جس کی تفصیل جناب نصیرالدین ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "یوروپ میں دکنی مخطوطات" کے صفحات ۴۲۷ تا ۴۳۴ پر پیش کر دی ہے۔ پھر "مدراس میں اردو" میں بھی اس کی بحث شامل کی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کے مقدمے میں بہت مفید معلومات درج ہیں۔

مطبوعہ کتاب میں تین عکس ہیں اور تینوں نہایت ہی اہم ہیں۔ دو عکس واؔلہ کی دو کتابوں یعنی اساس الایمان اور دستور نظم کے ہیں۔ یہ دونوں مخطوطے خود واؔلہ ہی کے ہاتھ کے ہیں۔ اول الذکر ۱۱۴۶ھ میں اور دوسرا ۱۱۵۴ھ میں لکھا گیا۔ تیسرا عکس لمعات الشمس کا ہے جس میں دو صفحے ہیں۔ ایک صفحہ میں والہ کا شجرۂ نسب اور دوسرے میں سید رضی کے حالات ہیں۔ ان عکس کے شامل کر دینے سے، کتاب کے ظاہری و باطنی حسن میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے۔

قصہ طالب و موہنی کی اشاعت سے اردو ادب کے ذخیرہ میں نہایت قابل قدر اضافہ ہوا۔ اس لحاظ سے ہم ڈاکٹر زورؔ کے انتہائی ممنون احسان ہیں۔ امید کہ اس گراں قدر تصنیف کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا جائے گا

(دسمبر ۱۹۵۵ء) "ہماری زبان"

سید محمد واؔلہ موسوی متوفی ۱۱۷۷ھ دکن کے ایک فاضل اور شاعر تھے۔ نظم و نثر کی دوسری تصنیفات کے علاوہ انھوں نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی جس میں مہاراشٹر کے ایک تاریخی شہر "پینڈھ" کی پرانی داستانِ عشق و محبت

جس کو واآلہ نے ایک بوڑھے برہمن کی زبانی سنا تھا ۔ حسن اتفاق سے اس مثنوی کے مخطوطہ کا ایک ہی نسخہ ادارہ ادبیات اردو کے ذخیرہ اردو مخطوطات میں شامل تھا ۔ ڈاکٹر زور نے اس کو اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ اڈٹ کر کے شائع کردیا ہے ۔ مثنوی کی زبان اردو فارسی اور دکھنی تینوں زبانوں کا مجموعہ ہے ۔ اور اس لئے نسبتاً سہل و آسان ہے ۔ یہ مثنوی زبان کے اعتبار سے بڑی اہم ہے اور اس سے اردو کے لسانی ارتقا کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی ۔

"برہان" دہلی (ڈسمبر ۱۹۵۶ء)

ادارہ ادبیات اردو ۱۹۵۶ء میں

مرتبہ محمد جمال الدین ۔ صفحات (۶۴) ۔ قیمت آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر ۔ حیدرآباد دکن کے مرکزی ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی مختلف سرگرمیوں کے ذریعہ سے اردو زبان اور ادب کی جو خدمات ۱۹۵۶ء میں انجام دیں یہ ان کا مجمل تذکرہ ہے ۔

"مجلہ دانش گاہ پنجاب" لاہور (فروری ۔ مئی ۱۹۵۷ء)

راہ رو اور کارواں

مرتبہ حفیظ قتیل ۔ صفحات (۱۴۸) قیمت دو روپے ۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر ۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد (دکن) نے جن ادیبوں اور شاعروں کی نظم و نثر گذشتہ ربع صدی میں شائع کی ہے اس رسالہ میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے ۔

"مجلہ دانش گاہ پنجاب" لاہور (فروری ۔ مئی ۱۹۵۷ء)

داستان ادب حیدرآباد

از سید محی الدین قادری زورؔ ۔ صفحات (۲۲۲) ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیرت آباد ۔ حیدرآباد دکن ۔

اس تالیف میں حیدرآباد دکن کی تین سو سال کی اردو فارسی اور عربی شاعری اور ادب کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اور ارباب کمال کا مختصر سا حال درج ہے ۔ آخر میں ایک مفید اشاریہ بھی شامل ہے ۔

"مجلہ دانش گاہ پنجاب" لاہور (فروری ۔ مئی ۱۹۵۷ء)

کتب خانہ اور دار المطالعہ

۱۹۵۵ء میں حسب سابق رسائل، کتابوں اور مخطوطات کا ادارہ کے کتب خانہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ان کتابوں کی تعداد (۸۶۰) ہے اور مخطوطات کی تقریباً ایک ہزار۔ لیکن ان مخطوطات میں بہت کم اچھی حالت میں ہیں۔ اکثر و بیشتر اول و آخر ناقص کرم خوردہ اور بوسیدہ ہیں۔ بعض مخطوطات نایاب بھی ہیں جو ادارہ کے شعبہ مخطوطات میں اہم اور قابل قدر اضافہ سمجھے جائیں گے۔ لیکن ان کو مرتب کرنے، ان کے ناموں، مصنفین اور ان کے حالات کی تلاش آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت زیادہ وقت اور محنت کی ضرورت ہے اور جلد بنانے یا بہتر حالت میں لانے کے لئے سرمایہ کی بھی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ اس کام میں اپنا بہت کچھ وقت صرف فرماتے ہیں۔ چنانچہ چند کتابیں مرتب ہوگئی ہیں اور جلد بندی کیلئے تیار ہیں

اس سال جن حضرات نے ادارہ کو کتابیں یا رسائل عطا فرمائے ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ مولوی احمد اللہ خاں صاحب ۔ کئی سو نادر اور کمیاب کتابیں جو غیر مرتب اور کرم خوردہ ہیں۔

۲۔ محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ ۔ ۳۷۶ مطبوعہ و قلمی کتب

۳۔ ڈاکٹر زورؔ صاحب ۔ ۴۵ مطبوعہ کتب

۴۔ ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب (سابق صدر شعبہ فارسی) ۔ ۳۵ مطبوعات

۵۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ۔ ۹ مطبوعات

۶۔ " رمضان بھائی صاحب تاجر کرانہ ۔ ۴ مطبوعات

۷۔ " مصطفےٰ لطفی صاحب ۔ ۱

۸۔ " ہارون خاں صاحب شروانی ۔ ۱

۹۔ " امیر اللہ خاں صاحب ۔ ۲

۱۰۔ " عبداللہ شریف صاحب ۔ جریدہ صدق ہفتہ وار ارسال فرماتے رہے۔

اس قسم کی امداد و اعانت کی تفصیلات ایک علیحدہ عنوان کے تحت بھی درج ہیں۔ آئندہ صفحات ملاحظہ ہوں۔

ادارے کے کتب خانے سے استفادہ کے لئے حسب ذیل قابل ذکر اصحاب تشریف لائے اور رسائل، مطبوعات یا مخطوطات کا مطالعہ کیا۔ مزید تفصیلات عنوان علمی و کچول معروفیات کے تحت ملاحظہ فرمائی جائیں۔

۱۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون ۔ لکچرار مہارانی کالج میسور۔

۲۔ جناب محمد خاں صاحب ۔ لکچرار یوراج کالج میسور۔

۳۔ جناب سید نعیم الدین صاحب — ریڈر ناگپور یونیورسٹی۔
۴۔ " قطب الشاہ ہاشمی صاحب — مددگار محکمہ تعلیمات
۵۔ " تنویر علوی صاحب — ریسیرچ اسکالر علیگڈھ یونیورسٹی
۶۔ " شیخ فرید صاحب — لکچرار جبلپور
۷۔ پرنسپل سفارش حسین رضوی صاحب — سمتھر مدھیہ پردیش

سال ۱۹۵۷ء میں دارالمطالعہ کے ناظرین کی تعداد (۱۶۰۰) رہی۔ دارالمطالعہ روزانہ ۳ تا ۶ کھلا رہا۔ (ہفتہ میں ایک بار دوشنبہ کو چھٹی کے باعث بند رہتا ہے۔)

ادارہ کے ترجمان "سب رس" کے تبادلے میں رسائل کچھ تو پابندی سے آتے رہے اور کچھ رسائل ایسے بھی ہیں جو ہمیں برابر وصول نہ ہوئے۔ بعض اہل خیر حضرات نے اپنے مطالعہ کے بعد ادارہ کو عطا فرمائے۔ ان رسائل کی مکمل فائلیں جلد بنوا کر داخل کتب خانہ کر دی جاتی ہیں اور اس سے ان کی افادیت میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سنین ماضیہ کے رسائل جو ادارہ میں محفوظ ہیں اکثر و بیشتر ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ہم ممنون ہوں گے اگر ایڈیٹر صاحبان اپنے موقر رسائل پابندی سے روانہ فرمائیں تاکہ ہمارے فائل میں کوئی کمی نہ رہ سکے۔ فہرست مطبوعات جلد اول میں ہم نے ایک ہزار رسائل کی فہرست دیدی ہے۔ دوسری فہرست (جو زیر ترتیب ہے) کے لئے بھی ایک ہزار رسائل کی فہرست مرتب کرنے کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ اردو کے علاوہ انگریزی، تلنگی، کنڑی، مرہٹی کے رسائل بھی آتے ہیں اور فرانسیسی اور فارسی کا بھی ایک ایک رسالہ آجاتا ہے۔ ذیل میں ایک فہرست دی جارہی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ملک اور بیرون ملک کے ایڈیٹر صاحبان نے اپنے موقر رسائل ادارہ کے نام "سب رس" کے تبادلے میں اجرا کئے۔

سہ ماہی

۱۔ اردو — کراچی
۲۔ اردو ادب — علی گڈھ
۳۔ العلم — کراچی
۴۔ اورینٹل کالج میگزین — لاہور
۵۔ تصویر کشمیر — سرینگر
۶۔ مخزن — میسور
۷۔ مجلہ عثمانیہ — حیدرآباد
۸۔ نوائے ادب — بمبئی

ماہنامے

۱۔ آج کا حیدرآباد — حیدرآباد دکن
۲۔ آجکل — دہلی
۳۔ آستانہ — دہلی
۴۔ ادب لطیف — لاہور
۵۔ ادبی دنیا — "
۶۔ استقلال — رنگون (برما)
۷۔ افکار — لاہور
۸۔ الحمرا — "
۹۔ القدیر — حیدرآباد دکن
۱۰۔ الہام — "
۱۱۔ برہان — دہلی
۱۲۔ پگڈنڈی — امرتسر
۱۳۔ تجلی — دیوبند
۱۴۔ تجلی — کراچی
۱۵۔ تخلیق — "
۱۶۔ تذکرہ — کراچی
۱۷۔ تعمیر — علیگڈھ
۱۸۔ تعمیر — سرینگر
۱۹۔ ثقافت — لاہور
۲۰۔ چشمہ حیات — دہلی
۲۱۔ حسامی — حیدرآباد دکن
۲۲۔ حقیقت اسلام — لاہور
۲۳۔ خیال — بمبئی
۲۴۔ دائرہ — حیدرآباد دکن
۲۵۔ دین و دنیا — دہلی
۲۶۔ ساقی — کراچی
۲۷۔ سب رس — حیدرآباد دکن
۲۸۔ شاعر — بمبئی۔

۲۹۔ شانِ ہند — دہلی
۳۰۔ شاہراہ — ″
۳۱۔ شفق — ناگپور
۳۲۔ شہناز — کراچی
۳۳۔ صبا — حیدرآباد دکن
۳۴۔ عصمت — کراچی
۳۵۔ فاراں — ″
۳۶۔ فانوس — ″
۳۷۔ فروغِ اردو — لکھنؤ
۳۸۔ کتابی دنیا — کراچی
۳۹۔ گل برگ — گلبرگہ
۴۰۔ لوک ہتیاوی — جالندھر
۴۱۔ ماہِ نو — کراچی
۴۲۔ مسیح الملک — دہلی
۴۳۔ معارف — اعظم گڈھ
۴۴۔ معاصر — پٹنہ
۴۵۔ معاون — کلکتہ
۴۶۔ منادی — دہلی
۴۷۔ مہرِ نیمروز — کراچی
۴۸۔ نئی قدریں — لکھنؤ
۴۹۔ نورس — حیدرآباد دکن
۵۰۔ ہمدردِ صحت — دہلی
۵۱۔ ہندوستانی ادب — حیدرآباد دکن

پندرہ روزہ و ہفتہ وار

۱۔ آبشار — کراچی
۲۔ آج کا امریکہ — دہلی
۳۔ الفاروق — ناگپور (کامٹی)
۴۔ پیامِ اسلام — لکھنؤ
۵۔ جمہور — حیدرآباد دکن
۶۔ حمایتِ اسلام — لاہور
۷۔ رہنما — کراچی
۸۔ ریاست — دہلی
۹۔ سحر — لاہور
۱۰۔ شیراز — حیدرآباد دکن
۱۱۔ صدق — لکھنؤ
۱۲۔ قومی زبان — کراچی
۱۳۔ مضافات — محبوب نگر
۱۴۔ ناظم — رامپور
۱۵۔ نیا پیام — دہلی
۱۶۔ نئی دنیا — حیدرآباد دکن
۱۷۔ نیا ہندوستان — حیدرآباد دکن
۱۸۔ ہماری زبان — علیگڈھ
۱۹۔ ہمدرد — دہلی

ان کے علاوہ تقریباً تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں سے جو میگزین مختلف زبانوں میں شائع ہوتے ہیں وہ بھی ادارہ میں آتے ہیں مثلاً اردو کالج کراچی، اردو کالج حیدرآباد، علی گڈھ میگزین مسلم یونیورسٹی۔ اورنٹیل کالج میگزین اور مقامی کالجوں کے تقریباً تمام ترجمان ادارہ کو وصول ہوتے ہیں۔ مختلف ممالک کے خبرنامے بھی ادارے میں آتے ہیں۔ اگر سب کے نام دیئے جائیں تو فہرست اچھی خاصی ڈائرکٹری بن جائے گی۔ آخر میں ہم پھر ایڈیٹر صاحبان سے متمنی ہیں کہ کتب خانے کی افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں اپنے رسائل تبادلے میں عنایت فرمائیں تو موجبِ منت ہوگا۔

محمد اکبرالدین صدیقی
معتمد کتب خانہ

امداد و اعانت

(۱۹۵۵ء میں جن اصحاب ذوق نے ادارے کی مختلف ذریعوں سے مدد فرمائی ہے اس کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔ ان سب اصحاب کا ادارہ شکر گزار ہے)

مولوی محمد عبیداللہ شریف صاحب کرچی فراش خانہ پرانی حویلی نے ادارے کے دارالمطالعہ کے لئے ہفتہ وار صدق جدید کے شمارے ہر ہفتے عطا فرمائے تاکہ بعد مطالعہ کتب خانہ میں محفوظ کئے جائیں۔

•

مولوی ابو سعد سید اسماعیل صاحب سید نے لطیف ساجد مرحوم کے خطوط اور نظمیں ادارے کے کتب خانہ میں محفوظ رکھنے کے لئے عطا کیں۔

•

مولوی مرزا ضامن علی صاحب غازی نے ۹ قدیم مخطوطات ادارے کو بطور تحفہ عطا فرمائے۔

•

عطاءاللہ شاہ بخاری اقتیاز صاحب نے یوم اقبال کی نمائش کے لئے ادارے کے مکاتیب اقبال کو شیشے کے فریموں میں اعزازی طور پر محفوظ کیا۔

•

مولوی غلام پنجتن صاحب شمشاد نے اپنی جملہ مطبوعات ڈاکٹر زور صاحب کو بطور تحفہ دیں جو ادارے کے کتب خانہ میں محفوظ کر دی گئیں۔

•

مولوی محمد بن عمر صاحب ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ نے ادارے کے کتب خانہ کو ۲۵ روپے کا عطیہ دیا۔

•

محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ تہنیت نے ۱۶۶ قلمی و مطبوعہ کتابیں اور رسائل و جرائد کے خاص نمبر اور مشاہیر دکن کے خطوط ادارے کو بطور تحفہ عطا کئے۔

•

نواب امیر اللہ خاں صاحب دارالشفاء نے ۳ قلمی اور ۲ مطبوعہ کتب ادارے کو بطور تحفہ عطا کیں۔

مولوی محمد صدیق صاحب ماہر کتبات نے دو عمدہ تاریخی کتبوں کے چربے ادارے کو عطا فرمائے۔

●

مولوی عبدالرزاق صاحب راشد ایچ سی ایس نے اپنی مرتبہ کتاب "کلیات اقبال" ادارے کو بطور تحفہ عطا کی۔

●

مولوی ابوسعید سید اسماعیل صاحب سید شوراپوری نے نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے خطوط ادارے میں محفوظ کرنے کے لئے عطا فرمائے۔

●

مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد نے تین مطبوعہ کتب ادارے کے کتب خانے کو بطور تحفہ عطا کیں۔

●

ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ نے ادارے کی عمارت میں اپنے نام سے ایک کمرہ بنانے کا پیش کش کیا اور اس سلسلہ میں پانچ سو روپے کی پہلی قسط عطا کی۔

●

مولوی دلاور علی صاحب عاصی ساکن گولکنڈہ نے جو چینی عاشور خانہ قدم رسول گولکنڈہ اور عرس عبداللہ قطب شاہ کے متولی ہیں ادنا دیوان ابوالحسن قطب شاہ کا لکھا ہوا ایک اصل فرمان مورخہ ۱۰۸۸ھ اور جس پر ابوالحسن تانا شاہ کی مہر ختم بالخیر والسعادۃ ثبت ہے بطور عطیہ ادارے کے کتب خانہ کو دیا۔

●

ڈاکٹر ابونصر خالدی صاحب نے مجلس اساتذۂ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دو سالہ اجلاسوں (۱۳۲۹ف تا ۱۳۳۱ف) کی روئدادوں کا اصلی رجسٹر بطور تحفہ عطا فرمایا جس میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے جملہ پرنسپلوں اور پرو وائس چانسلروں مہدی حسن بلگرامی، راس مسعود، عبدالستار صدیقی، ای۔جی۔ ولکنز، محمد عبدالرحمن خاں، قاضی محمد حسین اور حسین علی خاں کے دستخط ثبت ہیں۔

●

ڈاکٹر سید ابوالفضل صاحب نے تین عربی مخطوطات بطور تحفہ عطا کئے۔

●

ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب ناظم دائرۃ المعارف حیدرآباد نے نواب مشرف جنگ فیاض اور نواب عزیز یار جنگ عزیز کے کتب خانوں کی ۴۲ جلد کتابیں ادارے کو بطور تحفہ عطا فرمائیں جن میں راسخ، اسیر، امیر، داغ، سالک، شیفتہ، نائل، وزیر، مومن، یقین، کیف، ذوق، ظفر، رند جیسے اساتذۂ سخن کے مطبوعہ دواوین اور کلیات اور عزیز یار جنگ عزیز مرحوم کا ایک قلمی دیوان بھی شامل ہے۔

●

الحاج مولوی محمد صلاح الدین صاحب قریشی بی۔اے سکریٹری انجمن تاریخ و آثار برہان پور (مدھیہ پردیش)

نے ڈاکٹر زور صاحب کو برہانپور کی تاریخی عمارتوں کی تصویروں کا ایک البم بطور تحفہ ارسال فرمایا تھا جس کو ڈاکٹر زور صاحب نے ادارے کے کتب خانہ میں محفوظ کرنے کے لئے عطا فرمایا۔

●

مولوی میر یٰسین علی خاں صاحب نبیرہ نواب میر حسن علی خاں آمیر مرحوم نے تاریخ روضۃ الصفا کی وہ ضخیم قلمی جلدیں جو مطلا ہیں اور جو نواب مبارز خاں عماد الملک صوبہ دار دکن کے خاندان کی مہروں سے مزین ہیں ادارے میں بطور تحفہ داخل فرمائیں۔ ان میں سے پہلی جلد سنہ ۱۰۵۰ھ کی مکتوبہ ہے۔

●

ڈاکٹر ہیندر راج سکسینہ صاحب نے امریکہ کے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے متعلق دو کتابچے ادارے کے ریفرنس روم کے لئے عطا فرمائے۔

●

محمد ابن موسیٰ میاں جوہانسبرگ (جنوبی آفریقہ) نے دو سو ساٹھ ۲۶۰ روپے یعنی ۲۰ پونڈ ادارے کی خدمات کے اعتراف میں عطا فرمائے۔

●

سید اقبال احمد صاحب نے ابوالحسن تانا شاہ کا اصلی فرمان مکتوبہ مادنا دیوان اور عہد محمد قلی قطب شاہ کے دو سنگین کتبے جو نہایت عمدہ خط نسخ میں کندہ کئے گئے ہیں ادارے کی عمارت کے لئے بطور تحفہ عطا کئے۔

●

بشپ جان سبحان نے اپنی ایک اردو اور ایک انگریزی تصنیف ادارے کو بطور تحفہ عطا کی۔

●

مولوی احمد اللہ خاں صاحب بی۔ اے، بی ایڈ ہائی اسکول گولکنڈہ نے کئی سو قدیم قلمی اور مطبوعہ کتابیں ادارے کو عطا فرمائیں۔

●

ڈاکٹر اے۔ نارائن راؤ صدر آندھرا نلندا گوڈی واڈہ ضلع کرشنا نے اپنے ادارے کی ۶ تلنگی کتابیں ادارے کو تحفۃً دیں۔

●

نواب ناظر یار جنگ بہادر نے ریاست حیدرآباد کا ایک قدیم مطبوعہ تلنگی اردو دیواری نقشہ اور ریاست حیدرآباد کا اردو پوسٹ کارڈ اور اردو لفافہ ادارے میں محفوظ رکھنے کے لئے عطا فرمائے

نتیجہ اردو امتحانات

۲۳ر ڈسمبر ۱۹۵۶ء کو اردو دانی کا جو امتحان بلدہ حیدرآباد میں لیا گیا تھا اس کے کامیاب امیدواروں کے نام یہ ہیں :-

(کامیاب)

رول نمبر ۱۔ ام الفضل فرزانہ
" ۲۔ رحمت النسا بیگم
" ۳۔ امت المعبود
" ۴۔ مریم بیگم
" ۵۔ جمشید بیگم
" ۶۔ مختار بیگم
" ۸۔ انور بیگم
" ۱۰۔ مبارک النساء بیگم
" ۱۲۔ زبیدہ بیگم
" ۱۳۔ کبریٰ بیگم
" ۱۴۔ فاطمہ بی
" ۱۵۔ معین فاطمہ
" ۲۲۔ غوثیہ بیگم

رول نمبر ۲۳۔ سید محی الدین
" ۲۴۔ عنایت مہدی
" ۲۶۔ محمد قاسم
" ۲۸۔ عبدالصمد
" ۲۹۔ محمد شبیر شریف
" ۳۰۔ فراست سلطانہ
" ۳۲۔ صابرہ متین
" ۳۶۔ انیسہ سلطانہ
" ۳۹۔ محمد احمد
" ۴۰۔ سروری سلطانہ
" ۴۱۔ سلیمہ سلطانہ
" ۴۲۔ سید عتیق احمد
" ۴۵۔ حبیبہ سلطانہ
" ۴۷۔ رحیم النسا بیگم

نتائج اردو امتحانات بابتہ ستمبر ۱۹۵۷ء

(مرکز بلدہ)

اردو عالم

رول نمبر ۱۔ شیخ عبدالوہاب تسنیم — دوم
" ۲۔ محمد محمود علی — "

(مرکز نرمل)

اردو زباندانی

رول نمبر ۱۔ بشیر احمد صدیقی — اول

اردو دانی (مرکز نزل ذکور)

کامیاب بہ امتیاز

رول نمبر ۱۹۔ سید فیض الدین

کامیاب

رول نمبر ۴۔ گوکل چند
" ۵۔ محمد یعقوب شریف
" ۶۔ محمد اظہر حسین
" ۷۔ عبدالقیوم خاں
" ۸۔ حبیب الدین
" ۹۔ محمد علی
" ۱۰۔ سید قادر شریف
" ۱۲۔ حبیب محمد
" ۱۳۔ سید خواجہ مشتاق علی
" ۱۴۔ محمد عبدالحمید
" ۱۵۔ محمد عبدالرشید
" ۲۱۔ محمد اسمٰعیل خاں

(مرکز نزل اناث) کامیاب

رول نمبر ۱۶۔ ثریا سلطانہ بیگم
" ۱۷۔ اسماء خاتون

رول نمبر ۱۸۔ رضیہ دردانہ بیگم

(مرکز خانہ پور۔ ذکور و اناث)

کامیاب بہ امتیاز

رول نمبر ۳۵۔ اقبال بیگم
" ۳۶۔ بلقیس بیگم

کامیاب

رول نمبر ۲۲۔ شفیع محمد
" ۲۳۔ محمد شرف الدین
" ۲۴۔ عبدالباری خاں
" ۲۵۔ محمد یوسف
" ۲۶۔ حبیب الدین
" ۲۷۔ رئیس احمد خاں
" ۲۸۔ محمد ذکاء اللہ
" ۲۹۔ محمد اسحاق
" ۳۰۔ عبدالقیوم
" ۳۱۔ محمد کریم الدین صدیقی
" ۳۲۔ محمد عبدالباسط
" ۳۳۔ قمر النساء بیگم
" ۳۴۔ فیض النساء بیگم

نتیجہ بیک نظر

بابتہ ڈسمبر ۱۹۵۶ء

	شریک	حاضر	غیر حاضر	کامیاب	ناکام	نتیجہ
اردو دانی	۴۷	۳۶	۱۱	۲۷	۹	۵۷٪

بابتہ ستمبر ۱۹۵۷ء

	شریک	حاضر	غیر حاضر	کامیاب	ناکام	نتیجہ
اردو عالم	۲	۲	×	۲	×	صد فیصد
اردو زباندانی	۱	۱	×	۱	×	صد فیصد
اردو دانی	۳۶	۳۶	×	۳۱	۵	۹۰٪

خواجہ حمید الدین شاہد

تنقیح شدہ حسابات

ادارۂ ادبیات اردو ۔ حیدرآباد دکن

تختہ آمد و خرچ سالانہ تاختم مارچ ۱۹۵۷ء

آمد

سلک افتتاحی اور بنک کی رقمیں:۔	
اسپیشل سیونگ اکاونٹ، رگھوناتھ مل بنک ۹۱۔۰۔۹	
" " " " سب رس ۲۰۔۱۰۔۰	
فکسڈ ڈپازٹ حیدرآباد بنک لمیٹڈ ۱۸۴۲۔۱۴۔۱۱	
نقد ۴۶۴۔۱۲۔۳	
جملہ	۲۴۱۹۔۵۔۱۱
امداد حکومت حیدرآباد ۴۳۷۱۔۰۔۰	
امداد مرکزی حکومت ۲۵۰۰۔۰۔۰	
جملہ	۶۸۷۱۔۰۔۰
آمد مطبوعات	۸۹۵۔۱۳۔۳
آمد سب رس	۲۵۴۔۸۔۶
آمدنی کارِ باغ	۱۰۷۔۲۔۳
آمد تعلیم بالغان	۵۰۷۔۱۳۔۰
عطیات	۲۵۲۰۔۲۔۶
آمد بہ مد تعمیر عمارت:۔	
امداد مرکزی حکومت ۲۵۰۰۰۔۰۔۰	
آمدنی چندہ وغیرہ ۱۳۹۴۱۔۱۳۔۹	
جملہ	۳۸۹۴۱۔۱۳۔۹
متفرق آمدنی	۱۹۔۱۲۔۰
صدر جملہ	۵۲۵۴۷۔۷۔۱۱

خرچ

خرچ خریدی و طباعت کتب	۳۰۹۲۔۰۔۹
" سب رس	۹۶۰۔۳۔۰
" فیلوشپ برائے طلبہ	۱۲۸۔۸۔۶
" کارِ باغ	۸۲۔۱۲۔۳
" کلچرل تقریبات	۲۱۵۔۴۔۶
" تنخواہ و مشاہرہ	۱۵۲۰۔۸۔۰
" فیس تنقیح حسابات	۱۰۰۔۰۔۰
" متفرق	۱۳۔۵۔۲
" تعمیر عمارت	۱۵۴۲۶۔۰۔۰
" کرایہ مکان	۱۰۲۸۔۷۔۰
" ٹیلیفون	۲۷۶۔۵۔۰
" صادر و طباعت	۳۲۔۱۲۔۹
" تار و ٹپہ	۸۷۔۲۔۹
" تعلیم بالغان	۲۰۶۔۶۔۰
" سوشیل ایجوکیشن	۸۴۵۔۱۲۔۰
" کتب خانہ	۲۷۶۱۔۷۔۰
" معاوضہ مصنفین	۱۹۰۔۰۔۰
سلک اختتامی اور بنک کی رقمیں	
اسپیشل سیونگ اکاونٹ رگھوناتھ مل بنک ۴۷۵۔۵۔۰	
" " سب رس ۳۶۔۱۰۔۰	
فکسڈ ڈپازٹ حیدرآباد بنک لمیٹڈ ۱۸۴۲۔۱۳۔۹	
" حیدرآباد اسٹیٹ بنک ۲۰۰۰۰۔۰۔۰	
کرنٹ اکاونٹ " " ۳۱۹۳۔۵۔۹	
نقد ۲۲۔۶۔۹	
جملہ	۲۵۵۷۰۔۹۔۲
صدر جملہ	۵۲۵۴۷۔۷۔۱۱

تنقیح کی گئی اور حسابات صحیح پائے گئے
مورخہ ۱۹۔۴۔۱۹۵۷ء

شرمد تخط ۔ ایس۔ جی۔ دستگیر اینڈ کو۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس

ادارہ کی مجلس انتظامی

۱۔ نواب لیاقت جنگ بہادر	صدر
۲۔ نواب زین یار جنگ بہادر	نائب صدر
۳۔ مولوی سید علی اکبر صاحب	"
۴۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب	رکن
۵۔ " عبدالقادر سروری صاحب	"
۶۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب	"
۷۔ مسٹر پی۔ ہنمنت راؤ صاحب	"
۸۔ جناب جانکی پرشاد صاحب	"
۹۔ " ایل۔ این۔ گپتا صاحب	"
۱۰۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	معتمد عمومی

ادارے کے شعبوں کے معتمدین

۱۔ شعبہ علمیہ و تحقیق :۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب۔

۲۔ شعبہ تاریخ و ثقافت :۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب۔

۳۔ شعبہ امتحانات، تعلیم بالغان، سوشیل سنٹرس اور شاخہائے اضلاع :۔ مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
" عارف الدین حسن صاحب

۴۔ شعبہ کتب خانہ و دارالمطالعہ :۔ مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب

۵۔ شعبہ نشر و اشاعت :۔ مولوی محمد محمود حسین صاحب (شعبہ انگریزی)، مولانا حامد صدیقی صاحب (شعبہ اردو)

۶۔ شعبہ ماہنامہ سب رس :۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب، جناب رائے جانکی پرشاد صاحب،
جناب رمن راج سکسینہ صاحب۔

یوم محمد قلی قطب شاہ

شہر حیدرآباد کے بانی، اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر دکنی تمدن کے معمار اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار سلطان محمد قلی قطب شاہ (۴/ اپریل ۱۵۶۶ء تا ۱۱/ جنوری ۱۶۱۲ء) کی یاد میں ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے جو ادبی اور کلچرل تقریبات ۱۱/ جنوری ۱۹۵۵ء سے شروع ہو رہی ہیں ان کا افتتاح عالیجناب ہز اکسلنسی سری بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش محمد قلی قطب شاہ کے عالیشان گنبد کے چبوترے پر شام کے چار بجے فرمائیں گے۔ اس سے قبل محمد قلی قطب شاہ کے بنائے ہوئے یادگار زمانہ چارمینار سے ایک جلوس نکل کر گولکنڈہ پہنچے گا جہاں گنبدان سلاطین قطب شاہی کے وسیع میدان میں ایک میلہ رہے گا۔

محمد قلی قطب شاہ کی سلطنت اسی وسیع علاقہ پر قائم تھی جہاں اب آندھرا پردیش قائم ہوا ہے اور اس پورے علاقے کے فارسی، اردو اور تلگو کے شاعروں اور ادیبوں کی اس دریادل بادشاہ نے قدر افزائی کی تھی اور اپنی رعایا سے قریب ہونے اور ایک مشترکہ تمدن قائم کرنے کے لئے اپنی وضع قطع اور لباس ایسا اختیار کیا تھا جو یہاں کے ماحول کے مناسب تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک آندھرائی حکمران تھا جس نے اس ہندو مسلم ایکتا کو پروان چڑھایا جو صدیوں تک اس ملک میں باقی رہی اور حالات حاضرہ کے تحت ضروری ہے کہ اس کا احیا کیا جائے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اردو نے تمام آندھرا پردیش کے ساتھ ہی اس جشن کو شایان شان طریقہ پر منانے کا اہتمام کیا ہے تاکہ یہ ایک قومی تہوار بن جائے اور اہل آندھرا کو معلوم ہو کہ ان کے پایۂ تخت شہر حیدرآباد کی بنیادیں کس رواداری اور فیاضانہ ماحول میں رکھی گئی تھیں۔ ادارے کو امید ہے کہ سارے اہل ملک اس اقدام کی قدر کریں گے اور اس قومی جشن میں دل کھول کر ادارے کا ساتھ دیں گے۔ یقین ہے کہ اس سے بڑے دیرپا اور دوررس نتائج نمودار ہوں گے۔ اس جشن کے منانے میں پدما بھوشن نواب زین یار جنگ بہادر، ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی صاحب وزیر فینانس، نواب مہدی نواز جنگ بہادر وزیر ہوزنگ، ڈاکٹر سری نواس چاری ناظم آثار قدیمہ وغیرہ ذاتی دلچسپی سے ادارہ کا تعاون کر رہے ہیں اور حیدرآباد کے جملہ علمی و تاریخی ذوق رکھنے والے اصحاب بھی شریک ہیں۔ ملک کے دوسرے کلچرل اور ادبی ادارے مثل ہندی پرچار سبھا، آندھرا سارسوتہ پریشد، آندھرا ساہتیہ اکاڈیمی، دکھشن بھارت ہندی پرچار سبھا، دکنی ساہتیہ پرکاشن سمیتی، مرہٹواڑہ ساہتیہ پریشد، مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، انجمن ترقی اردو اور اردو کی دوسری انجمنیں ادارے کے ساتھ ہیں۔

یہ جشن ۱۱ سے ۱۳/ جنوری ۱۹۵۵ء تک منایا جائے گا۔ ۱۲/ جنوری کی صبح میں ایک نمائش نوادرات کا افتتاح ہوگا جو کئی روز تک جاری رہے گی۔ اس میں قطب شاہی سلاطین و مشاہیر کی تصویریں، لباس، سکے، ہتھیار، زیورات، کتابیں، نقشے اور شہر حیدرآباد اور قطب شاہی عمارتوں کی تصویریں رکھی جا رہی ہیں۔ اسی روز ۱۰ تا ۱۲ دن اور ۴ تا ۶ شام تقریروں اور قانونی مقالوں کے اجلاس ہوں گے اور رات میں ڈراما، ٹیبلو، رقص اور موسیقی کی محفل منعقد ہوگی۔ تیسرے دن مشاعرہ ہوگا اور ان سب میں وہی اصحاب شریک ہو سکیں گے جو رکن استقبالیہ بن جائیں گے جس کی فیس صرف پانچ روپے رکھی گئی ہے

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد (آندھرا پردیش)

جلد ۲۲، شمارہ ۲و۳ ـــــ فروری و مارچ ۱۹۵۹ء

نگراں:
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ادارہ:-
رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
جانکی پرشاد

چندہ سالانہ چھ ۶ روپے سکۂ ہند
ششماہی تین ۳ " "

قیمت
پچاس ۵۰ نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے "نیشنل فائن پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا

فہرست

غزلیں:- فیروز نظر۔ الطاف شاہد ۳
اسلم پرویز۔ ابو سعد سید امین سید ۴
انوار ظہوری۔ صابر کوسگوی ۵

نظمیں:- مجبوری احمد ادیب ۶
بہار شمس الدین تاباں
تا
اندھیرے اجالے مجیب خیر آبادی
اشک حسرت شاغل قادری گیاوی ۸

مضامین ہم کہانی جناب شیخ فرید صاحب ۹
رباعیات شاد عظیم آبادی ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب ۱۴

افسانے نیئین رالم جناب مظفر عالمگیر صاحب ۲۱
تخفیف محترمہ شاکرہ فضل اللہ صاحبہ ۲۴

تبصرے ناقابل فراموش۔ جوش ملسیانی (ابھینندن گرنتھ)۔
دیوان غالب۔ فریاد داغ۔ نوائے آزادی۔
جواہر لال نہرو۔ غذا اور اس کی اہمیت۔
اساس عربیہ۔ رسالہ انعام۔ گولکنڈہ میگزین۔
سحاب۔ انسانیت۔ نورنگ۔

غزلیں

فیروز نظر

عجب سلسلے ہیں ترے شہر میں
بڑے دکھ ملے ہیں ترے شہر میں

نگاہوں میں مایوسیوں کا ہجوم
لبوں پر گلے ہیں ترے شہر میں

نئی زندگی کے بجائے ہمیں
نئے غم ملے ہیں ترے شہر میں

لگا دی گئی ان پہ مُہرِ سکوت
اگر لب ہلے ہیں ترے شہر میں

کہیں زخم، ارماں کہیں زخم کے
عجب گل کھلے ہیں ترے شہر میں

جنھیں زندگی بھر نہ بھولیں گے ہم
وہ غم بھی ملے ہیں ترے شہر میں

الطاف شاہد

نہ سہی کچھ اور، یہ خوشی تو ہے کہ وفا کے نقش ابھر گئے
جو لکھے تھے لمحے فراق کے کسی طرح ہم پہ گذر گئے

انھیں آرزو ہو حیات کی یہ خیال ہے یہ محال ہے
وہ غریب جی کے کریں گے کیا جو تری نظر سے اتر گئے

نہ پھر آرزو رہی جام کی نہ رہی ہوس ہی شراب کی
یونہی تری نظر سے نظر ملی کہ بڑھا کے ہاتھ ٹھہر گئے

جنھیں آرزو تھی کہ جان دیں انھیں موت آ نہ سکی کبھی
جنھیں زندگی کی تلاش تھی وہ تلاشِ زیست میں مر گئے

ترے عاشقوں کی یہ شان ہے تری جستجو ہی مآل ہے
یہ پتہ نہیں کہ کہاں رہے یہ خبر نہیں کہ کدھر گئے

اسلم پرویز

●

خرد کی انتہا اندیشۂ سود و زیاں تک ہے
جنوں کی دسترس لیکن خدا جانے کہاں تک ہے

بنا ہے گردِ راہِ ناقۂ لیلیٰ مگر پھر بھی
رسائی قیس کی اب تک غبارِ کارواں تک ہے

اسیرِ مرگ ہو ذوقِ نمودِ زندگی کیوں کر
گرفتِ دامِ صیادِ قضا تو جسم و جاں تک ہے

ادھر دام و قفس، دار و رسن، طوق و سلاسل ہیں
ادھر اک جوشِ عمل ہے اور ذوقِ امتحاں تک ہے

قفس تو کیا نشیمن پھونک دو پرواز کی خاطر
جمودِ بال و پر کی حد قفس سے آشیاں تک ہے

کچھ اہلِ گلستاں بھی ہیں شریکِ غارت گلچیں
اب اتنا صاف کیوں کہیے کہ اس میں باغباں تک ہے

نظر کی چوٹ اثر انداز دل تک ہی نہیں اسلم
بزورِ تیشۂ فرہاد یہ سنگِ گراں تک ہے

ابوسعد سید اسمٰعیل سید

●

لڑ کے مرنا دلیلِ پستی ہے
مل کے جینا فروغِ ہستی ہے
عظمتِ زیست زر پرستی ہے
عقل و دانش کی کتنی پستی ہے
ہر عبادت شعورِ پستی ہے
خود پرستی ہی حق پرستی ہے
جو صداقت پہ کاربند رہا
آج دنیا اسی پہ ہنستی ہے
رہنمائی میں رہزنی ہے روا
کیسی انسانیت کی پستی ہے

انوار ظہوری

اوروں کی خبر ہے نہ مجھے اپنی خبر ہے
کیا جانے دل وہ نگہہ فتنہ اثر ہے
شاید یہ میرے سوزِ تمنا کا اثر ہے
جو اشک مژہ پر ہے وہ مانوسِ شرر ہے
کیا ہو دلِ رنجور کا یہ کس کو خبر ہے!
اب تک تو بڑی دور شبِ غم کی سحر ہے
کیا جانئے انجام ہو کیا ذوقِ جنوں کا!
آگاہ محبت سے نہ دل ہے نہ جگر ہے
وہ دیر ہو کعبہ ہو کوئی نقشِ قدم ہو
محفوظ ابھی تک تو مرا سجدۂ سر ہے
کیا کہیئے تماشا گہہ عالم کی حقیقت
آلودۂ نیرنگیٔ غم ہے جو نظر ہے
بے ساختہ اک آہ نکل جاتی ہے دل سے
شاید یہ میرے دردِ محبت کا اثر ہے
ہوتے تو ہو تمکین محبت سے گریزاں
کچھ تم کو دلِ سوختہ ساماں کی خبر ہے؟
پردے میں بھی بے پردگیٔ حسن کا عالم
اے چشمِ تمنا یہ ترا حسنِ نظر ہے
جس درد کا احساس رلاتا تھا شب و روز
وہ درد مرے دل میں بہ اندازِ دگر ہے
دو چار قدم چل کے ابھی دیکھ رہے ہیں
سنتے تو ہیں کعبہ کی یہی راہگذر ہے
انوار شبِ غم کی سیاہی نہ مٹے گی
خورشید ابھی تک پسِ دامانِ سحر ہے

صابر کوسگوی

لب کی سرخی گلاب ہے شاید
چشمِ میگوں شراب ہے شاید
اک مسلسل عذاب ہیں آنسو
مسکرانا ثواب ہے شاید
آتشیں ہے شفق کی رنگینی
تیرے رخ کا نقاب ہے شاید
جلوۂ حسن برق ساماں ہے
طور ان کا جواب ہے شاید
پھر مجھے میکدہ بلاتے ہیں
کچھ پرانا حساب ہے شاید
ان کے ہونٹوں پہ آگئی ہے ہنسی
آنسوؤں کا جواب ہے شاید
نکہتِ گل سبک خرامی سے
چاندنی محوِ خواب ہے شاید
شمع کی لو بھی تھرتھراتی ہے
اس پہ تیرا عتاب ہے شاید
جذب کر لوں جبیں میں سجدوں کو
بندگی کامیاب ہے شاید
کتنی باتیں ہیں کتنے افسانے
زندگی بھی کتاب ہے شاید
منزلِ شوق سے گذر بھی چکا
اب رہ پر حجاب ہے شاید
آپ صابر کو کیوں بلاتے ہیں
اس کی نیت خراب ہے شاید

نظمیں

مجبوری

ماجد ادیب بریلوی

تیرے شانوں پہ بھٹکتی ہوئی زلفوں کی قسم
میں نے چاہا تھا کہ بن جائے مرے دل کو سکوں
اس سے پہلے کہ بکھر جائے نظامِ ہستی
جاگ اٹھیں مرے جذبات مرا سوزِ دروں
کیا عجب زیست کے کملائے سے رخساروں کی
شعلۂ برقِ تبسم سے نکھار آ جائے
تیری معصوم جوانی کا اشارہ پاکر
اک حسیں خواب محبت کے افق پر چھائے
میں نے سوچا تھا چمکتے ہوئے تارے لاکر
جگمگاؤں گا محبت کے شبستانوں کو
مسکرائیں گے خوش آہنگ بہاروں کے کنول
خوب مہکاؤں گا ارمانوں کے کاشانوں کو
ہو گیا وقت کے ہاتھوں سے کچھ ایسا مجبور
دل ہے ناکامیٔ تقدیر کا تابندہ ثبوت
اب کہاں زیست کے تاروں میں وہ اگلی سی تڑپ
چھا گیا ہے مری دنیائے محبت پہ سکوت
حادثاتِ غمِ دوراں کی قسم کھاتا ہوں
اب ترے پیار کی محفل میں نہیں آ سکتا
دامنِ وقت سے لپٹی ہیں بلا کی پرچھیں
گیت میں سازِ محبت پہ نہیں گا سکتا

اور وہ گیت محبت کے جو گائے تھے کبھی
بربطِ وقت کے تاروں پہ بکھر جانے دے
وہ ستارے جو لرزتے ہیں صفِ مژگاں میں
ان سے ایوانِ محبت کو سنور جانے دے
صبحِ روشن پہ مسلط ہیں شبِ غم کے نقوش
اور اب تجھ سے ملاقات کا امکاں بھی نہیں
وقت کی تیرہ و تاریک گزرگاہوں میں
کوئی تیرے غمِ جاں سوز کا پرساں بھی نہیں
غم نہ کر میری جدائی کا یہی بہتر ہے
حادثاتِ غمِ ایام کی منزل ہے یہی
زندگانی اسی ماحول میں گزرے گی تری
جذبۂ فطرتِ آلام کا حاصل ہے یہی
کوششیں کی ہیں ہر گام تجھے پانے کی
لیکن افکار کی الجھن سے نکل ہی نہ سکا
کاوشِ سعیٔ مسلسل سے بہ اندازِ دگر
اپنے ماحول کی تقدیر بدل ہی نہ سکا
تیرہ و تار روایات کے کاشانوں میں
اپنی معصوم محبت کا لہو بہنے دے
سازِ امید کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو نہ چھیڑ
تلخیٔ غم کے شراروں کو دبا رہنے دے

اور مجھے یاد نہ کر، یاد نہ کر، یاد نہ کر

بہار ——— محمد شمس الدین تاباںؔ

نشانِ ہستی جاناں ہے ہست و بود بہار — بغیر ان کے نہیں معتبر وجود بہار
جمالِ سنبل و گل عکس زلف و رخ بھی نہیں — شباب یار کی حدیں کہاں حدودِ بہار
فضا فضا ہوئی جب اس نے بال کھول دیئے — کشود زلف گرہ گیر ہے کشود بہار
چھلکتی مئے سے چراغاں کریں گلستاں میں — اٹھاؤ جام کہ ٹوٹے کہیں جمود بہار
چلیں چمن میں ذرا سیر فصل گل کو چلیں — بغیر آپ کے خطرے میں ہے وجود بہار
دل و نگاہ کی موت و حیات کے آگے — کچھ اور شئے نہیں نام خزاں نمود بہار
اسی طرح سے مصیبت کے بعد راحت ہے — کہ جس طرح ہے فرار خزاں ورود بہار
خزاں تو خیر خزاں تھی مگر نصیب کی بات — ہے اور وجہ فروغ جنوں وجود بہار
نظر کا حسن ہے احساس کی لطافت ہے — بہار کچھ نہیں جز یافت و شہود بہار
سنیں قفس میں عنادل کی زار نالی بھی — سنائیں اہل چمن نغمہ و سرود بہار

غم و خوشی میں لئے اپنے جان و دل تاباںؔ
کہ جاں ربود خزاں اور دل ربود بہار

اندھیرے اُجالے ——— مجیب خیرآبادی

(مستقبل قریب کی رفیق سفر — مہر کے نام — یہ سورج ہنوز دکن ہی کے قبضہ میں ہے۔)

میں تو سمجھا تھا — دل ساز کے ٹوٹے ہوئے تار
تادم عمر کبھی ایک نہ ہو پائیں گے
اور جو نغمے فضاؤں میں کبھی گونجے تھے
دور گمنام خلاؤں میں بھٹک جائیں گے

صورت طعنۂ اغیار جو چلتے ہی رہے
زہر آلودہ وہ سب تیر بھی کھائے ہیں نے
کتنے روگ لے ہیں گھر، کتنے ستارے توڑے
کتنی راتوں کے در و بام سجائے ہیں نے

میں تو سمجھا تھا کہ تاریک نہاں خانۂ دل
تادم عمر ہی ترسے گا اجالوں کے لئے
جگمگائے گی نہ بھولے سے کوئی شوخ کرن
آئینہ کوئی تو ہو زہرہ جمالوں کے لئے

ظلمتیں یوں تو قدم لینے کو بڑھتی ہی رہیں
مہر تاباں کی مگر دل سے تمنا نہ گئی
حوصلے جبر مشیت سے الجھتے ہی رہے
زندگی یورش آلام سے گھبرا نہ گئی

اب یہ بات اور پیمانے تقاضائے جنوں
تابش مہر پہ میں نے بھی نظر ڈالی تھی
ذہن میں گردش دوراں کا تصور ہی نہ تھا
جیب بھی درہم و دینار سے کچھ خالی تھی

بارہا تھک کے خرد بیٹھ گئی راہوں پر
پھر بھی قندیل جنوں ہے کہ فروزاں ہی رہی
بارہا یوں تو امیدوں کے دیئے بجھنے لگے
اک تمنا ہے کہ رقصاں و غزل خواں ہی رہی

اور جب میں نے بہاروں کا وطن چھوڑ دیا
کتنا افسردہ، ترا چہرۂ شاداب ہوا
کھنچ گئی فاصلۂ وقت کی اونچی دیوار
تو سمجھ بیٹھی کہ پیمان وفا خواب ہوا

خیر وہ دور بھی آ پہنچا ہے اے جہدِ حیات
آج ہر منزلِ دشوار طلب آساں ہے
قہقہہ زن ہے جنوں آج مرا گام بہ گام
عوضِ درہم و دینار طلب آساں ہے

پھر وہی نغمے فضاؤں میں مچل اٹھے ہیں
اب اجالے ہی اجالے ہیں مری راہوں میں
آئینۂ عکسِ رخِ مہر سے پھر روشن ہے
پھر تصور ہے بہاروں کی طرب گاہوں میں

تابشِ مہر جو ہوئی نہ کہیں راہوں میں
چار سو ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوتا
جی بھاتی نہ سرِ شام شفق کی لالی
کم سے کم اتنا حسیں پھر نہ سویرا ہوتا

اشکِ حسرت

شاغل قادری گیاوی

عروج میں زوال کا فسانہ آہ کیا کہوں
کہ ذکرِ عہدِ رفتہ سے دلوں کا ہو رہا ہے خوں

مری خودیٔ محتشم کی لوگ کھاتے تھے قسم
مگر نگاہِ غیر میں ہوں اب ذلیل و سرنگوں

غمِ زوال بھی گیا بلندیٔ نظر کے ساتھ
مگر پسند دل کو ہے یہ میری حالتِ زبوں

سدھاری تیرگیٔ شب سحر کی روشنی ہوئی
گیا نہیں دماغ سے ہنوز خواب کا فسوں

روش روش، چمن چمن بہار ہی بہار ہے
اسیرِ دامِ آگہی ہنوز ہے مگر جنوں

اسیر جب تلک رہا تھی فکرِ باغ و آشیاں
رہائی میں یہ کب کھلا چمن میں یا قفس میں ہوں

ہر ایک گل کی آنکھ میں کھٹک رہا ہوں خار سا
نگاہِ باغباں تو کیا میں شاخ پر بھی بار ہوں

حیات کا الم نہیں تو یار کا بھی غم نہیں
جہاں میں کوئی شے نہیں جسے گلے لگا سکوں

رہِ طلب میں بڑھ رہا ہے کارواں پہ کارواں
مگر جہاں سے قادری چلا تھا میں وہیں پہ ہوں

پیم کہانی

از: جناب شیخ فرید صاحب (ایم، اے) برہان پوری

پیم کہانی ـــــ ہندی دوہوں کا ایک مجموعہ ہے۔[1] ان دوہروں کے مصنف کے بارے میں مختلف رائیں ہیں۔

(۱) "تذکرہ اولیائے سندھ" کے فاضل مصنف جناب سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد نے لکھا ہے کہ پیم کہانی حضرت برہان الدین راز الہی کی تصنیف ہے۔ حضرت موصوف کا یہ خیال "شرح پیم کہانی" ـــــ (قلمی) ـــ کے ذیل کے ترقیمہ کی بناء پر ہے۔

"تمام شد۔ کار من نظام شد۔ پیم کہانی۔
من تصنیف قدوۃ الواصلین۔ زبدۃ العارفین۔
منبع السالکین حضرت شاہ برہان الدین راز الہی
قدس سرہ العزیز"[2]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ پیم کہانی حضرت راز الہی کی تصنیف ہے۔

(ب) کتب خانہ درگاہ راز الہی ـــ (برہانپور) میں محفوظ ایک قلمی بیاض میں چار دوہے بہ عنوان ـــ "من تصنیف راز الہی" ـــــ منقول ہیں

(س) سلک گہر ـــ تذکرہ شعرائے سی پی وبرار ـــ کے نوجوان مصنف ـــ جناب جاوید صاحب نعمانی ـــ نے لکھا ہے کہ یہ دوست محمد کی تصنیف ہے اور کتاب شائع ہو چکی ہے۔[3] موصوف نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔

حقیر راقم السطور کی نظر سے پیم کہانی کا کوئی مطبوعہ نسخہ نہیں گذرا۔ گمان غالب ہے کہ سلک گہر کے فاضل مولف کی نظر سے بھی اس کتاب کا کوئی نسخہ نہیں گذرا ہے۔ کیونکہ تالیف مذکور میں بعض ماخذات کا ذکر صرف اعزازی حیثیت رکھتا ہے اور تصانیف تذکروں کے بیانات پر بھروسہ کرکے لکھ دی گئی ہیں۔

امید ہے کہ بیچ میرز راقم کو ناظرین کرام اس کتاب کے مطبوعہ نسخے سے مطلع کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

راقم کے علم میں شرح پیم کہانی کے تین نسخے ہیں۔[4]

(الف) کتب خانہ آصفیہ کا نسخہ: حیدرآباد:

---

[1] حضرت برہان الدین راز الہی کے حالات اور تصانیف کیلئے ملاحظہ کیجئے ـــــ تذکرہ اولیائے سندھ ص ۲۱۱، حالات (سب رس نومبر و دسمبر ۱۹۵۵ء)، مثنوی (معارف دسمبر ۱۹۵۵ء)، تصانیف (سب رس مئی و جون ۱۹۵۶ء)

[2] ت اس ص ۲۱۷

[3] سلک گہر ص ۴

[4] جناب راشد صاحب کے قلمی نسخہ ـــ شرح پیم کہانی ـــ کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

(ب) ادارۂ ادبیات اردو کا نسخہ (حیدرآباد)

(ص) کتب خانۂ پیر محمد شاہ کا نسخہ (احمد آباد)

کتب خانہ آصفیہ میں اس شرح کے دو نسخے ہیں۔ ایک خوش خط بارہ سطری نسخہ اور دوسرا نسخہ ۱۲۳۳ھ کا نوشتہ ہے۔ پہلا نسخہ "رسالہ تسویہ" کے ساتھ محفوظ ہے۔ مناجات کے خاتمہ پر "تمام شد نسخہ پیم کہانی" مندرج ہے۔

کتب خانۂ پیر محمد شاہ کا نسخہ ناقص الآخر ہے۔ اس میں صرف بارہ دوہروں کی شرح ہے۔

ادارۂ ادبیات کے نسخے سے مصنف، کاتب اور سنِ تصنیف و کتابت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ مگر "جملہ مقابلہ از اصل کردہ شد" سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب کی نظر سے اصل نسخہ گذرا ہے اور زیر نظر نسخہ کا اس سے مقابلہ کیا گ [illegible]

[illegible] ملس حسن تو جملۂ خوبان

اور مقطع یہ ہے ـــ

خاطرم رام کن ز صحبت شاں
وقتِ من ساز خوش ز قسمت شاں

جناب قبلہ راشد صاحب کے مملوکہ نسخہ ـــ "شرح پیم کہانی" ـــ میں چالیس[7] سے کچھ زیادہ دوہروں کی شرح ہے۔ آخر میں ایک مناجات (مثنوی)[6] ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

حضرت راشد صاحب کے نسخہ کی ترقیمہ کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیم کہانی ـــ حضرت برہان الدین راز الٰہی کی تصنیف ہے۔

پیچ میرزا راقم کا خیال ہے کہ "شرح پیم کہانی" حضرت راز الٰہی کی تصنیف ہے اور کسی عقیدت مند نے ملفوظ کے طریق پر اس کی ترتیب دے دی ہے۔

راقم کا یہ خیال ذیل کے اقتباسات پر مبنی ہے۔

(الف)۔ پہلے دوہرے کی تشریح کے ذیل میں لکھا ہے۔

"روزے حضرت شیخ برہان الدین راز الٰہی برہانپوری قدس اللہ سرہٗ در درجۂ فنا فی اللہ سخن می گفتند و در مثال آں می فرمودند" یہ[5]

(ب)۔ دوسری جگہ لکھا ہے۔

"در ملفوظ حضرت [illegible] بتلاتا ہے کہ یہ حضرت راز الٰہی نے کی ہے اور اس کی ترتیب ان کے وصال کے بعد کی گئی۔

سطور ذیل میں ناظرین کرام کی دلچسپی کے لئے کتب خانہ آصفیہ کے نسخۂ اول سے دو دوہرے نقل کئے جاتے ہیں۔

پیم کہانی

پیم کہانی کہت ہتوں۔ سنو سکھی تم آئے
پیو ڈھونڈن ہوں گئے۔ آئے آپ گنوائے

---

۵ ت اس ص ۳۰۹۔
۶ سب رس (مئی و جون ۱۹۵۶ء) میں یہ مثنوی پوری نقل کی گئی ہے۔
۷ ت اس ص ۳۰۹ ـــ قلمی نسخہ آصفیہ (الف) ص ۴۔
۸ قلمی نسخہ آصفیہ الف ص ۱۴ ـــ قلمی نسخہ ب ص ۵۴۔

پیم کہانی ۔ رس بھری ۔ مت سنیؤ کوئی آئے
باتوں باتوں رس جھرے ۔ دیکھت ہیں گھر جائے
ہم کہا تی ۔ سو سنے ۔ جو تن من دھن دے وار
اپنے پیو پر اور نیک نہ لاوے بار
پیم نگر موں آئی سکھی! سدھ بدھ رہیو کون
سدھ بدھ یوں گھل جات ہے ۔ جون پانی ماہیں لون
سوتے تھے ۔ سکھ چین سوں ۔ گھر اپنے پاؤں پسار
موہن موکو جگانے کے لئے پھر لیو دواری دوار
لئے کیسین جاؤں ۔ ٹھکیاں ۔ مارک رکوائے
نیک لاج نیں ۔ باوری ۔ گورس لیت چھنائے
لئے کیسے جاؤں ۔ گگریا بھاری ۔ موہن پکڑت بانہہ
دہیئے دودھ کھٹین لین ۔ کہنیت ہیں بن جانہ
جو وہ گھڑا موسر پڑو کا ہو کے نا سے نہے
کچھو پلاوین پیم رس ۔ کبھو کیسے لیس جہن بانہے
اپنے پیرا کئے ۔ چتوری کہا کلوں آئے
رین و نا بیکل رہے ماس ہنسکا کہائے
ارّی من کہی باوری ہوں ۔ پوچھت ہوں تو کون
بریں تئوں آن گیو ۔ کہ کن لیو ہر موہ
نہ جانوں یہ جیوڑا ۔ کا سوں لاگو جائے
موہن تک ادت نہیں رہے ہون ہا کہائے
پیم گلی ات سانکری ۔ یہ بن کچھو نہ سمائے
تن من چھور جو اس کے تو ئے ایا جائے
یوسر کہ موسوں پڑی ہو جو ناتھ تو نانہہ
سائیں موہ او تہائے لئے ہے جو یہ سب ناتھ جانہہ
بھلا ہوا ۔ پھر جیئے بیری اور سر سے ٹلے بلائے
جیسے تھے ویسے تھے ۔ اب کچھو کہا نہ جائے
ہم کہیں ۔ کہتے بنے ۔ جو کچھے واتیں آئے
بات کہیں جیہہ لیت ہے نو کہ پکڑت ہے دہائے

سدھ بدھ تاون سون کے جاؤن دیکھے ناتھ
چوئے تر کے انکیا ۔ ور کے جب کہ پکڑی ناتھ
سدھ بدھ تن من سون گئی اور نین سوں گئی لاج
بات دہوی پاچھیں پڑی مانے موہن آج
پڑی نین کو ندہای کے ۔ نین کا جل دیہہ
تن من دو او جہارہ گئے ساجن سوں کچھ نیہہ
مانگ سنوارو ۔ یہ سوں ۔ کنگھی کر گوندھو بال
کہا پروانگ بھر گیڑی کر پہلے لال
پیتم گیسو من آئے ۔ گئے ۔ چوڑا انک بجائے
اے سکھی! کچھو بات نیہہ کئے کہونک ائے
لاج بھاج موسوں گئی ۔ جاوں لاگو نیہہ
بوری ہو ڈوری ۔ پھر وں سر موں واریں کیہہ
تن من کہل بل پڑی جو ہے برہ کئے پھانس
دہا و ماس دوا دکھے ۔ دہائی چلے بن سانس
اکت کہتا ہے ۔ پیم کیئے ۔ کہیں پٹ کو جہنا نہہ
جاتن لاگو متیہرا ۔ سو بوجھے من مانہہ
جانہ چاہین ۔ راک کون مورکہ انہیں سائیں
بھوکے مانگے ۔ جو پڑی رو گئے رو گہا کہائیں
جو رکرت ہے نہرا ۔ کہہ سکھی! کت او نہہ جانوں
نا جانوں واکانوں کو جان سجن کو نہانوں
رائیت رہے بر یے پایئے ۔ لے پیو کے جاتے کے جائے
مالا ٹوٹے ۔ انگیا پھوٹے ۔ من تن موں سمائے
چیر تنا انگ سون ۔ انگیا چھوٹے جاییئے
من میر و میرا لبیین ۔ کہئے جو موہن لہین لیئے
دیکھ موسر پڑی ۔ تن من جل بھیو کیہہ
ہوں بوری کہا جانتے کون کیھت سینہہ
جوں سورج کہہ جات ہے ۔ گھر باہر چھانہہ
تیکون میری کا سدھ جات ہے ۔ پیہہ مو کہہ دیکھیں نانہہ

جور کرت ہے نہرا۔ پوچھہ پرت کچھہ ناہہ
ناجانوں اے سکھی! ہوں کہادھر جھیہ ماہہ
تاسم ہو کے نیہہ من سون تپ ہوا سے
باہر بھتیر بیوہن۔ جو پاوے سو کہائے
اک نگو داد لیشہ وبیچ پڑ دنہہ ٹہانون
جہاں نہ چرچا نہیہ کا۔ پنچ نہ بیویں نانون
پائل باجیں باٹ مو اور گھنگرو جھنکا نہہ
دوسیے دو کہ ہم سر پڑی کا۔ ہوئیں کیسے یانہہ
کو چرادت پھرت ہے۔ نت اوٹھہ جہنا نیر
ایک جھین چین نہ دیت ہے چنچل نیٹ اہیر
رین ونا دیکھت رہیں تو او دیہہ نہ چین
نیہہ ٹھک نہ اکھات ہیں۔ پیٹے ووی کیں نیں
سور ٹھہ نیٹ کٹھن نیہے اے باہر اسوں اے بکھے
بن دیکھن جیہ جائے دیہیں ہیں من ناپہری لکھن ٹے
جو انکھیان نبھوا ناپیو دیکھت نکھت مرتوں تو او
.... بہری نہ جیوںؔ
رین دہ ناگہریں۔ رہیں۔ ایک چھن دیہہ نہ چین
یا موہیں کے بات سوں پرت موہ جیو دین
سور ٹہہ ان مینے ناتھ اتھے تیوری لائے کیئے
مولودا کچھ سہ ناہہ نوک کہا پہری آئے کیئے

دھر دہر بیرا کرت ہے۔ مرو جیو را جاسے
دہر دہر سوں دکھہ پاپری برین کہیئے مرائے
دہر دہر بیرا کرت ہے۔ دہیرنیے کوئے دیت
نیہ بمن کا پیہہ۔ من مارا تیر جیو ایت
پیتم لاج سب اٹھ گئی۔ سنت برو کیئے میں ہے
پیتم کئے درشن بنا ٹہہ ٹہہ گئے دو او نین
باہر پہرد نہرا من کون۔ رہو نہ ٹہانو
کچھو میرو موہین نین رہ گیو میرد مانو
سانس لیں نہیں دیت ہے چھن چھن برہا ایسے
اب اون بن ہرن نان رہوں چیر انکسا جانے
سن رہے نیہے باوری۔ کاچے بدوی چھور
داکوں کیسین۔ پائیے جاسوں چھپے نہ جور
آج نہ دیکھے لال حال ہمارا اور ہے
جو پیہے برو کئے جہاں دو کہہ کہیئے دورا دو دہا ہے
من میرو لیو موہ ای ری سکھیے تانکر موں
ہیں نہ کہت تہے تو موہن ہیں یاد کر موں
من میرو لئے موہ موت۔ پہر کھورت ہے موہ
اری اری موہن باوری۔ کچھو لاج نین ہے توہ
پیئے کئے کو ریت ہے۔ میت بیچھ دو ہے تانو
پھوٹے مت کوئے جائے یوری یو کا سیہ نہانو
کل دوہروں کی تعداد پچاس میں ایک کم ہے

ٖ بد خطی کے باعث صاف طور پر پڑھا نہ جاسکا۔ (ف)

رباعیاتِ محروم

اردو کے نامور شاعر تلوک چند محروم کی حقائق آفریں رباعیات کا مجموعہ
دوسری بار نئی آب وتاب سے شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۳/۱۲-
مندرجہ ذیل پتے سے طلب فرمائیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ——— مرکز ادب
اردو بازار ——— دہلی
مشن روڈ۔ نزد بندر روڈ۔ کراچی

رباعیات شاد عظیم آبادی

از:۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب (ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی)

فارسی کے مشہور رباعی گو شاعر عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ (Edward Fitzgerald) نے انگریزی نظم میں کیا اور اس طرح اس کو مغربی ممالک میں روشناس کرایا۔ یا یوں سمجھئے کہ جیرالڈ نے مشرقی شراب کو مغربی شیشوں میں بھر کر یورپ کے میکدہ میں پیش کیا اور اس طرح یورپی ممالک میں عمر خیام کو زندہ جاوید بنا دیا۔

شاد عظیم آبادی کی بھی رباعیات کا ترجمہ انگریزی نثر میں حمید عظیم آبادی نے کیا ہے۔ اس کے بعد سر نظامت جنگ بہادر نے اسی انگریزی ترجمے کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ ترجمہ مع اردو رباعیات کے ۱۹۴۵ء میں پٹنہ سے حمید عظیم آبادی نے شائع کیا ہے۔

کسی اردو شاعر کو انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی ممالک سے روشناس کرانا ایک مفید اور قابل ستائش کام ہے اور اس لحاظ سے حمید عظیم آبادی اور نواب سر نظامت جنگ بہادر کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ شاد عظیم آبادی عمر خیام کی طرح یورپی ممالک سے خراج تحسین وصول نہ کر سکے۔ اگرچہ ان کو اس بات کی توقع تھی جیسا کہ انھوں نے ایک رباعی میں کہا ہے ؎

روشن ہے کہ شاد سخن آرا ہوں میں   سمجھو نہ مجھے غیر تمہارا ہوں میں
مغرب میں شعاع بڑھ کے پہنچے گی ضرور   مشرق کا چمکتا ہوا تارا ہوں میں

بہت ممکن ہے کہ یہ مشرق کا چمکتا ہوا تارا آئندہ مغرب میں بھی روشنی پھیلا سکے مگر ابھی تک تو اس کی کرنیں مغرب تک نہیں پہنچ سکیں۔ ان دونوں شاعروں میں ایک بنیادی فرق ہے جس نے ایک کو گمنام رکھا اور دوسرے کو شہرت عام کا تاج پہنا دیا۔ شاد عظیم آبادی کی یورپ میں غیر مقبولیت کا راز یہ ہے کہ ان کی شاعری زیادہ تر تصوف پر مبنی ہے جو مغربی ممالک کے مزاج و خمیر سے ذرا مختلف ہے۔ اگرچہ Mysticism کا مطالعہ مغربی ممالک میں بھی کیا گیا ہے۔ تاہم یہ مطالعہ اہل مغرب کی روزانہ کی زندگی سے دور ہے۔ اس کے برخلاف عمر خیام کی رباعیات میں ساغر و سبو کا ذکر اس حسین و دلکش انداز میں پایا جاتا ہے جس سے ان کا لطف مے نوشی دوبالا ہوجاتا ہے اور مے نوشی یورپ کی زندگی کا جزو اعظم ہے۔

بہر حال اگر شاد عظیم آبادی کی رباعیات کا ترجمہ یورپ میں زیادہ مقبول نہ ہو سکا تو اس سے ان کے فن اور ان کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ شاد عظیم آبادی کی رباعیات اردو ادب میں اپنا ایک خاص مقام نہیں رکھتی ہیں۔

شاد کی رباعیات کے موضوعات[14] ۔ متصوفانہ و فلسفیانہ رباعیات

تصوف

شاد عظیم آبادی کی رباعیات کا بیشتر حصہ صوفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ انھوں نے تصوف کے مختلف مسائل پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ایک رباعی میں انھوں نے خالق و مخلوق کے تعلقات کو واضح کیا ہے۔ ان کی رائے میں انسان کے وجود کا انحصار خدا کے وجود پر ہے۔ انسان کا وجود خدا کے وجود سے جدا نہیں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا انسان کی سخت غلطی ہے اگر وہ خالق کے وجود سے ہٹ کر اپنے وجود کے سوچنے میں مقید رہے۔ اس خیال کو انھوں نے مندرجہ ذیل رباعی میں ظاہر کیا ہے۔

ارباب قیود تجھ کو کیا دیکھیں گے　　　خواہانِ نمود تجھ کو کیا دیکھیں گے
رویت کے لئے شرط ہے میدان فنا　　　پابند وجود تجھ کو کیا دیکھیں گے

شاد نے خدا کے وجود کو دنیا کے ہر ذرے سے ثابت کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عالم کا خالق "کن فیکون مخلوق" سے کسی طرح بھی اور کسی وقت بھی جدا نہیں ہو سکتا۔

ہر دم مرے دل میں تو ہی موجود رہے　　　ہر قصد میں یار تو ہی مقصود رہے
جب آنکھ اٹھاؤں ترا جلوہ دیکھوں　　　جب سر کو جھکاؤں تو ہی مسجود رہے

ایک رباعی میں شاد نے آنکھوں کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے جو دیدار یار سے ان کو محروم رکھتی ہیں اور محو تماشائے دنیا رہتی ہیں۔ جب یہ آنکھیں بند ہو جائیں گی تو جلوۂ یار خود بخود نظر آنے لگے گا

یہ دل تو ازل ہی سے تراشیدا ہے　　　دیدار کی حسرت میں مٹا جاتا ہے
پردہ تو ان آنکھوں ہی تلک ہے محدود　　　آنکھیں ہوئیں جب بند تو پردا کیا ہے

شاد نے مختلف رباعیوں کے ذریعہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ایسی رباعیاں دہریوں کے عقیدے کے خلاف ایک چیلنج ہیں۔ ایک رباعی میں انھوں نے دہریوں کو ایک اور منہ توڑ جواب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کے وجود کے بارے میں سمجھنا تو درکنار پہلے کوئی اپنے وجود کے بارے میں تو سمجھ لے۔ مندرجہ ذیل رباعی ملاحظہ ہو۔

یہ بھی نہ کھلا کہ ہم نہیں ہیں یا ہیں　　　ہے ساتھ کوئی یا کہ تن تنہا ہیں
مانا کہ نہیں ہیں تو نہیں پر برہان　　　اچھا ہم اگر ہیں بھی تو آخر کیا ہیں

اسی خیال کی توضیح ایک رباعی میں بھی دیکھئے۔

جو چاہیے دیکھنا، نہ دیکھا میں نے　　　ہر شئے پہ کیا ہے غور کیا کیا میں نے
اوروں کو سمجھنا تو بہت مشکل ہے　　　خود کیا ہوں اسی کو کچھ نہ سمجھا میں نے

ایک رباعی میں شاد نے فرمایا ہے کہ خدا کو عقل کے ذریعہ نہیں پہچانا جا سکتا ہے بلکہ اس کو پہچاننے کا واحد ذریعہ عقیدہ ہے۔ اس طرح سے انھوں نے ریشنلزم پر بھی چوٹ کی ہے اور اس کے پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے انسان اپنے "انا" کا تجزیہ کرے۔ اس کے بعد وہ اپنے خالق سے قریب ہو سکتا ہے۔

یہ وہم کسی طرح نہ معقول ہوا　　　افسوس یقین بھی شک محمول ہوا
اللہ ری دراندازئ عقلِ انساں　　　معلوم جو تھا وہ اور مجہول ہوا

شاد صاحب نے فلسفۂ عبادت کو بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ پرخلوص عبادت کے قائل ہیں۔ خدا کے نام کو گن گن کر لینا ان کے نزدیک ریاکاری ہے بلکہ بغیر کسی شمار کے خدا کا نام لینا عین ثواب ہے۔ اسی لئے وہ "شمار سبحہ" کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ؎

کیا نعمت کا زاہدوں نے الزام لیا — تسبیح کے دانوں سے عبث کام لیا
یہ نام تو وہ ہے جسے بے گنتی لیں — کیا لطف جو گن گن کے ترا نام لیا

تسبیح کے خلاف ایک جگہ اور انھوں نے علم بغاوت بلند کیا ہے ؎

کیا دلق مزور پارسائی کے لئے — تسبیح فقط ہے خود نمائی کے لئے
اے زاہد سالوس، نہ دے مجھ کو فریب — ساری ہے یہ بندگی خدائی کے لئے

شاد عظیم آبادی کا طائر تخیل بعض اوقات عمر خیام کی فضا تک پہنچ جاتا ہے۔ عمر خیام کی طرح وہ بھی سچی اور حقیقی عبادت کے قائل ہیں۔ پہلے عمر خیام کی رباعی ملاحظہ ہو ؎

من بندۂ عاصیم، رضائے تو کجاست — تاریک دلم نور صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی — این مزد بود، لطف و عطائے تو کجاست

اس کے بعد شاد عظیم آبادی کی ایک رباعی سنئے جس میں عمر خیام کی آواز بازگشت موجود ہے ؎

لا کر مجھے دنیا میں جو مہمان کیا — کیا کچھ نہیں میرے لئے سامان کیا
طاعت پہ نہ بخشا کہ یہ مزدوری تھی — یوں بخش دیا تو اور احسان کیا

مندرجہ ذیل رباعی میں شاد نے عبادت اور مزدوری کے درمیان حد فاصل قائم کی ہے۔

محبوب سے جس وقت تلک دوری ہے — جو فعل ہے معنوی نہیں صوری ہے
لالچ سے بہشت کی عبادت کرنا — اے شاد عبادت نہیں مزدوری ہے

شاد صاحب نے دوزخ اور جنت کی بھی تشریح نہایت جامع اور دلکش الفاظ میں کی ہے ؎

کتنی ہی حیات ہو مگر مرنا ہے — تا عمر اسی زیست کا دم بھرنا ہے
دوزخ کیا ہے؟ ہجوم غم میں رہنا — کیا ہے بہشت؟ دل کو خوش کرنا ہے

شاد کی چند متصوفانہ رباعیاں اور ملاحظہ فرمائیے ؎

اس سلسلۂ شہود کو توڑ دیا — گھبرا کے عدم کی سمت منہ موڑ دیا
کب تک ان سختیوں کو جھیلا کرتی — اکتا کے مری روح نے جی چھوڑ دیا

مسلک جو الگ الگ نظر آتے ہیں — یہ دیکھ کے راہ گیر گھبراتے ہیں
رستہ کا فقط پھیر ہے رہرو آخر — منزل پہ پہنچتے ہی تو مل جاتے ہیں

کیوں صورت جام میں دکھایا تھا مجھے — دنیا میں عدم سے کیوں بلایا تھا مجھے
آتی ہے صدا شیشۂ بشکستہ سے — جو توڑ دیا تو کیوں بنایا تھا مجھے

فلسفۂ جبر و اختیار | شاد نے فلسفۂ جبر و اختیار کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ لیکن وہ اس مسئلہ کو عام شعراء سے

الگ ہٹ کر سوچتے ہیں۔ زیادہ تر شعراء جبر کے قائل ہیں۔ یہاں تک عمر خیام بھی جبر کا نظریہ رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

از رفتہ قلم ہیچ دگرگوں نہ شود ۔ وز خوردن غم بجز جگر خوں نشود
کو در ہمہ عمر خویش خوں تا بہ خوری ۔ یک قطرہ ازاں کہ ہست افزوں نشود

مگر شاد نے فرسودہ راہ پر گامزنی نہیں کی بلکہ اپنے لئے ایک جدا راستہ اختیار کیا جو کہ نیا تو نہیں ہے لیکن راہ رو اس قدر کم اس پر چلے ہیں کہ نیا معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اختیار کو اپنا مسلک بنایا ہے۔

یہ سچ کہ ہجوم کار میں رکھا ہے ۔ یہ جھوٹ کہ اضطرار میں رکھا ہے
قانون میں فطرت کے نہیں جبر روا ۔ سب کچھ ترے اختیار میں رکھا ہے

بے ثباتیٔ دنیا شاد نے بے ثباتی دنیا کی بھی حسین تصویریں کھینچی ہیں۔ ان رباعیات میں تڑپ اور تاثیر موجود ہے۔ ان رباعیات کا رنگ عمر خیام کے رنگ سے جدا ہے۔ عمر خیام نے کوزہ گر کے چرخ پر "انگشت فریدوں وکف کے خسرو" دیکھا۔ اس کو فطرت کی مختلف اشیاء میں کسی عظیم شخصیت ۔۔۔ یا کسی محبوب ماہ طلعت کا عکس نظر آیا۔ مگر شاد کے دیکھنے کا انداز جدا ہے۔ انھوں نے ایک سادے انداز میں دنیائے دنی کا تجربہ کیا اور اس کے فانی ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ مثلاً ان کو شب غم میں "آثار سحر" نظر آئے۔

پھولوں سے لپٹ کے نفس میں سرطاہر ہے ۔ کیفیت یاس شمع سے ظاہر ہے
تم بھی شب غم سے مل کے رو لو اے شاد ۔ آثار سحر بھی ہیں، رات بھی آخر ہے

شاد کو اس کا احساس ہے کہ قاصد اجل "خط شوق" لے کر آنے ہی والا ہے لہٰذا اب سفر کی تیاری کر لینا چاہئے۔

گھر قبر بنے اب وہ محل آ پہنچا ۔ ہشیار کہ پیغام اجل آ پہنچا
لے کر خط شوق چلا چکا ہے قاصد ۔ پہنچا نہ اگر آج تو کل آ پہنچا

فنائے دنیا کی ایک اور رباعی ملاحظہ فرمائیے ؎

ہے دور کبھی دن کا، کبھی یاں شب ہے ۔ گردش کا زمانے کا یہی مطلب ہے
ہم تم نہ رہیں گے ورنہ ساری دنیا ۔ تا حشر یوں ہی رہے گی جیسی اب ہے

یوں تو ساری رباعی دل پر اثر کرتی ہے مگر خاص طور پر مصرعہ ہائے سوم و چہارم سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس رباعی کو پڑھ کر ذوق کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے ؎

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور ۔ اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

پیری کی رباعیاں شاد صاحب کی رباعیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے پیری کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی ایسی رباعیوں میں میر انیس اور پیارے صاحب رشید جیسا سوز و گداز تو نہیں ہے لیکن ان کی سلاست اور روانی کی وجہ سے ان پر تھوڑی دیر کے لئے نظر ضرور ٹھہر جاتی ہے۔ چند رباعیاں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں ؎

اس بزم سے نزدیک ہے جانا میرا ۔ پیری ہے اب آخر ہے زمانہ میرا
پروانے عبث ہیں مجھ کو گھیرے اے شاد ۔ میں شمع ہوں کیا ٹھکانا میرا

خاموش ہوئے ہیں آپ اپنے گھر میں　　اگلی سی کہاں چرب زباں ہم میں
گھل گھل کے فنا ہوگئے ہم آخر کار　　لو تیز تھی شمع ڈھل گئی اک دم میں

مقصود خرد سے دستگیری ہے تری　　اب کہنے کو زنجیر اسیری ہے تری
یہ منزل آخر ہے تری عمر کی شاد　　ہر گام سنبھل کے رکھ کہ پیری ہے تری

مندرجہ ذیل رباعی ان کے کلام کی مقبولیت کو بھی ظاہر کرتی ہے جو ان کے لئے ان کی ریاضت کا ثمرہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کو آخر عمر میں ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ بھی ملنے لگا تھا۔ اس کا بھی اشارہ مندرجہ ذیل رباعی میں ملتا ہے۔

صد شکر کہ قوم قدرداں ہے مری　　اک عمر یہ آج ہم زباں ہے مری
پیری میں ریاضت کا ملا ہے ثمرہ　　کیا پھول کھلے کہ جب خزاں ہے مری

اخلاقی و اصلاحی رباعیاں

شاد نے کچھ اخلاقی رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ ان رباعیوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم کی رباعیاں ایسی ہیں جو افراد کے اخلاق کو درست کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں اور دوسری قسم کی وہ رباعیاں ہیں جن کی تخلیق جماعت کی اصلاح کے لئے کی گئی ہے۔

شاد کے یہاں اخلاقی رباعیوں کے مضامین وہی ہیں جو ان سے قبل نظم کئے جا چکے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ رباعیاں اپنی فرسودگی کی وجہ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ دراصل شاد کا انداز بیان نہایت پختہ ہے اور وہ اپنی کہنہ مشقی کی وجہ سے پرانی بات سے نئی بات ضرور نکال لیتے ہیں۔ یہی حال ان کی اخلاقی رباعیوں کا ہے جو طرز بیاں کی وجہ سے جدت و ندرت کی حامل ہیں۔

ایک رباعی میں شاد نے ریاکاری کی مذمت کی ہے اور مذمت کرنے کا انداز یہ ہے کہ کینہ کشی اور مے کشی کا تقابل کیا ہے۔ یہی چوتھا مصرعہ جس میں کینہ کشی اور مے کشی کا تقابل کیا گیا ہے۔ شاد کے انداز بیان کو دیگر شعرا کے انداز بیان سے جدا کرتا ہے۔ چوتھا مصرعہ ایک واعظ کی ریاکاری پر ضرب کاری ہے ؎

واعظ جب تک کہ بر سر منبر ہے　　رندوں کی طرف روئے سخن اکثر ہے
انصاف سے اتنا تو بتادے کوئی　　کیا کینہ کشی سے مے کشی بدتر ہے

ایک دوسری رباعی میں تکبر کی مذمت دکھائی ہے۔ مگر مذمت سیدھے سادے انداز میں نہیں ہے۔ چوتھا مصرع یہاں بھی رباعی کو اونچا اٹھا کر ہم دوش ثریا کر دیا ہے۔ اس میں "بے بہادر" کا لفظ رباعی کی جان ہے اور تیسرے مصرع کے ساتھ پڑھنے سے تجنیس کی ایک حسین مثال پیش کرتا ہے ؎

معدوم خیالات تکبر نہ ہوئے　　مفقود تعلی کے تصور نہ ہوئے
کیا شاد ملا خان بہادر ہو کر　　افسوس یہ ہے کہ بے بہادر نہ ہوئے

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ رباعی تجنیس کی خوبی کے لحاظ سے امیر خسرو کی اس رباعی سے میل نہیں کھاتی ہے ؎

رفتم بہ تماشا بہ کنار جوئے　　دیدم بہ لب آب زن ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے مو یت　　فریاد برآورد کہ دُر دُر موئے

ایک رباعی میں شاد نے دنیا کی آلودگی سے پاک رہنے کی تلقین کی ہے۔

دنیا ہے عجب ایک تماشہ خانہ — سمجھا ہے اسے جس نے وہ ہے فرزانہ
ظاہر میں ہوا ارتباط و الفت سب سے — باطن میں بہر طور رہے گا بیگانہ

مندرجہ ذیل رباعی میں شاد نے "دو رنگی" سے بچنے کی ہدایت کی ہے ؎

بدلے نہ، صداقت کا نشاں ایک رہے — ہر حال میں پنہاں و عیاں ایک رہے
انسان وہی ہے جو اس دو رنگی سے بچے — لازم ہے کہ دل اور زباں ایک رہے

اب شاد کی چند رباعیاں ایسی بھی ملاحظہ فرمائیے جن کا مقصد جماعت کی اصلاح کرنا ہے۔ ایک رباعی میں انھوں نے تعصب کی مذمت کی ہے کیونکہ جس قوم میں تعصب آ جاتا ہے اس قوم سے انصاف مفقود ہو جاتا ہے۔

جس دل میں غبار ہو وہ دل صاف کہاں — پھر خلق کہاں، وفا و الطاف کہاں
جس قوم میں آ گیا تعصب کا قدم — اس قوم میں اے شاد پھر انصاف کہاں

شاد، اکبر اور حالی ہی کے دور کی پیداوار ہیں۔ انھیں شعراء کی طرح انھوں نے بھی قوم کی بے حسی، غفلت، کاہلی اور تساہل کو محسوس کیا اور عمل کی تلقین کی۔ اگرچہ اس قسم کی رباعیات شاد کے یہاں بہت کم ہیں۔ لیکن جو کچھ بھی ایسی رباعیاں ہیں ان میں جوش و عمل کی اس طرز سے تلقین کی گئی ہے جو اکبر و حالی کی رباعیات کا طرۂ امتیاز ہے۔ مثال کے طور پر ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

وہ سوچ نے ہر طرح سے جو بزم میں آئے — ایسا نہ ہو ایں آں میں یوں ہی رہ جائے
ساقی نے تو بھر کے رکھ دیا، اس کو کیا — ساغر ہے اسی مست کا جو ہاتھ بڑھائے

اسی خیال کو شاد نے غزل کے ایک شعر میں اس سے حسین تر انداز میں نظم کیا ہے جو اس قدر مشہور ہو گیا ہے کہ اب ضرب المثل کا حکم رکھتا ہے۔

یہ بزم مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر ہاتھ میں لے لے یہاں، مینا اسی کا ہے

عشقیہ رباعیاں

شاد کے یہاں عشقیہ رباعیاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے جذبۂ عشق کو رنگ تصرف میں بدل دیا تھا اس لئے عشقیہ رباعیوں کے بجائے صوفیانہ رباعیاں کثرت سے ملتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جذبۂ عشق سے محروم تھے۔ وہ عشق کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے اور ساتھ ہی دوسروں کو عشق سکھانے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

دم الفت معشوق کا بھرنا سیکھے — ہم زندہ دلوں سے آ کے مرنا سیکھے
نالوں کی صدائیں بھی خوش آئند نہیں — بلبل سے کہو بات تو کرنا سیکھے

خمریہ رباعیاں

شاد کے یہاں اگرچہ عشقیہ رباعیوں کی کمی ہے مگر خمریہ رباعیاں کافی پائی جاتی ہیں۔ ساغر و جام کے خیالات سے ان کو خاص مناسبت تھی۔ مختلف طریقوں سے انھوں نے مے کش، میخانہ، جام، ساغر، مینا اور صہبا کا ذکر کیا ہے اور ان سے دلکش اور حسین نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان خمریہ رباعیوں میں کیف و سرور اور سرمستی کی لہریں موجود ہیں۔ ایک رباعی میں تو مدہوشی کے عالم میں پائے ساقی پر گرنے کی حسرت کا اظہار کیا ہے۔

کیوں بات چھپاؤں رند مے نوش ہوں میں — دنیا کہے کہ دین فراموش ہوں میں
حسرت ہے کہ گروں تو پائے ساقی پہ گروں — جب خوب شراب پی کے مدہوش ہوں میں

مندرجہ ذیل رباعی میں ایک مے نوش کی بے تابی دکھائی ہے جو دست ساقی سے شراب حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے۔

ساقی کے کرم سے فیض یہ جاری ہے | یا پیر خرابات کی غم خواری ہے
صف توڑ کے بٹ رہی ہے رندوں کو شراب | معلوم نہیں میری کب باری ہے

شراب ملے اور پھر دست ساقی سے! کون ایسا بد ذوق ہے جو انکار کرے گا۔ ایسے عالم میں تو جب تک ساقی پلاتا رہے گا رند پیتا رہے گا۔ شاد کی بھی بلا نوشی کا یہی عالم ہے ؎

دی جتنی حیات، ہم جئے جائیں گے | جو دیں گے اسے خرچ کئے جائیں گے
مے بھی ہے انھیں کی جن کے بس میں دل ہے | جب تک وہ پلائیں گے پئے جائیں گے

مگر اس بلا نوشی میں بھی شاد کو ہوش رہتا ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اس خوشی کے بعد غم بھی ہے اور وصل ساقی کے بعد فراق بھی ہے ؎

ساقی مرا عیش تلخ کر دیتا ہے | مینا میں شراب خام بھر دیتا ہے
در پردہ نہاں ہے اس خوشی میں غم بھی | یہ وصل فراق کی خبر دیتا ہے

المیہ رباعیاں

شاد صاحب ایک انقلابی دور میں پیدا ہوئے اور انقلاب کے بعد انسان جن مصائب و تکالیف سے دو چار ہوتا ہے ان سے شاد بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ شاد صاحب کا تعلق درمیانی طبقہ سے تھا۔ وہ درمیانی طبقہ جو ابتدا ہی سے نہایت ہوشیار، ذہین اور ذکی رہا ہے لیکن ساتھ ہی ہمیشہ سے صید آلام روزگار بھی رہا ہے۔ شاد صاحب پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ شاد صاحب آلام روزگار کے شکار ہوئے اور ہمیشہ مالی مشکلات میں گرفتار رہے۔ اگرچہ انھیں ادبی خدمات کے صلے میں ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا مگر یہ رقم بھرے پرے گھر کے لئے ناکافی تھی اور وہ ہمیشہ اخراجات کی تنگی کی وجہ سے عاجز رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض رباعیوں میں مایوسی اور دنیا بیزاری کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

دنیا میں جو ہیں بھی تو نہ ہونے کی طرح | جاگے بھی اگر کبھی تو سونے کی طرح
ہنسنا تو بڑی بات ہے اس کا کیا ذکر | رونا ہے کہ روئے بھی نہ رونے کی طرح

گزری جس طرح زندگانی تیری | میں سن چکا تھا قصہ خواں زبانی تیری
سوتا سنسار، جاگتا پاک خدا | سچی تھی اس قدر کہانی تیری

دل وضع جہاں سے سخت آزردہ ہے | آفت میں پھنسا ہوا ہے، افسردہ ہے
اس باغ میں پھول ایک ہی تھا وہ بھی | کچھ ایسا ہوا چلی کہ پژمردہ ہے

اس افسردہ خاطری اور پژمردہ دلی کا نتیجہ ہے کہ ان کو اپنے بیگانے نظر آنے لگے۔

تنہا ہے چراغ اور پروانے ہیں | اپنے تھے جو کل، آج وہ بیگانے ہیں
نیرنگیٔ دنیا کا نہ پوچھو احوال | قصے ہیں، کہانیاں ہیں، افسانے ہیں

اس غم دنیا سے بچنے کے لئے شاد نے موت کو پکارا۔ وہ خیام کی طرح غم دوراں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ساغر و صہبا کا سہارا نہ لے سکے لیکن جہاں تک فراریت کا الزام ہے وہ دونوں پر یکساں عاید ہوتا ہے۔ عمر خیام نے میخانے کے سایہ میں پناہ لی۔

اور شاد نے موت کی چھاؤں میں سر چھپایا۔ ملاحظہ ہو ؎

کوہ الم و غم سے دبا جاتا ہوں
ناحق پس کارواں رہا جاتا ہوں
اس تن کے شکنجے سے نکل جلد اے روح
تو کرتی ہے دیر، میں گھٹا جاتا ہوں

شاد کی رباعیات کی مقبولیت اور ان کا اثر

شاد کی رباعیات ان کی زندگی ہی میں مقبول ہو گئی تھیں اور پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی رباعیوں کی شہرت اور بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی کیا گیا۔

شاد کی رباعیات کا خاص موضوع تصوف اور فلسفہ ہے۔ وہ ایک طرف تو حافظ سے متاثر نظر آتے ہیں اور دوسری طرف عمر خیام کے بھی خوشہ چیں معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں اساتذہ فن کی جھلک ان کے یہاں صاف طور سے نمایاں ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں بلند تخیل اور پاکیزہ جذبات کی کمی نہیں ہے۔ ساتھ ہی ان خیالات کو انھوں نے حسین الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ ان کی رباعیاں اپنی سادگی، سلاست اور شیریں بیانی کی بدولت ایک خاص کشش اور جاذبیت رکھتی ہیں۔

شاد کی وہ رباعیاں جو در حال پیری ہیں سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کا مقابلہ اس وادی میں انیس اور رشید سے تو نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان حضرات کی رباعیاں اس موضوع پر حرف آخر کا حکم رکھتی ہیں، تاہم چونکہ شاد ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ اس لئے ان کے قلم نے یہاں بھی ایسی گلکاریاں دکھائی ہیں جن پر تھوڑی دیر کے لئے نظر ضرور ٹھہر جاتی ہے۔

جس طرح پیارے صاحب رشید نے اپنی رباعیات کے لئے پیری کا مضمون منتخب کر لیا اور اپنے ماحول کی عکاسی سے بیگانہ رہے اسی طرح شاد نے بھی تصوف و فلسفہ کا مضمون اپنے لئے مخصوص کر لیا اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے نیاز رہے۔ شاد کا زمانہ وہ تھا جب انقلاب کا سورج نمودار ہو چکا تھا۔ جس کی سرگرمی اور روشنی کو اکبر اور حالی نے محسوس کیا۔ لیکن یہ احساس شاد کے یہاں بہت کم ہے اور رشید کے یہاں تو قطعی نہیں ہے۔

شاد نے اپنی فخریہ رباعیوں میں بھی حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں مگر چونکہ ان کے مزاج میں شگفتگی کم تھی اور افسردگی زیادہ تھی اس لئے وہ فخریہ رباعیوں کا حق ادا نہ کر سکے۔ فخریہ رباعیوں کے مقابلہ میں ان کی وہ المیہ رباعیاں زیادہ کامیاب رہیں جن میں خود ان کے دل کی پکار گونجتی ہے۔ یہ رباعیاں انھوں نے حالات زمانہ اور گردش دوراں سے مجبور ہو کر کہی ہیں۔ ان میں تاثر بھی ہے اور سوز و گداز بھی ہے۔ یہ رباعیاں قارئین کے دل پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔

شاد کی رباعیاں مغرب میں مقبول ہوں یا نہ ہوں مشرق میں ضرور مقبول ہیں۔ ان کی رباعیات نے تصوف کی راہوں کو اور زیادہ واضح کر دیا اور نئے چلنے والوں کے لئے آسانیاں پیدا کر دیں۔ ان کی رباعیات کا اثر دیگر اردو شعرا نے قبول کیا۔ خصوصاً امجد حیدرآبادی کے یہاں شاد کا رنگ جھلکتا ہے۔ اب اگرچہ امجد اس میدان میں شاد سے آگے نکل گئے ہیں اور اب وہ جہاں ہیں تنہا نظر آتے ہیں مگر شاد کا اثر ان کے ہاں صاف نمایاں ہے۔

نئیں عالم

از:- جناب ظفر عالمگیر صاحب

وہ دیہاتی تھا۔

وہ ایسے علاقے میں پیدا ہوا تھا جہاں جدید تہذیب و تمدن کی ایک بھی کرن نہ پہنچی تھی ـــ ریل گاڑی گذرتی تو لوگ کام کاج چھوڑ کر شہری بچوں کی مانند اسے تکنے لگتے، تالیاں بجاتے اور سیٹیاں پھونکتے اور حیرت کرتے کہ بیلوں کی جوڑی کے بغیر ڈبے کیوں کر حرکت کرتے ـــ اور ہوائی جہاز دندناتا ہوا گذر جاتا تو حیرت میں ڈوب جاتے اور دو منٹ تک سطح پر نمودار نہ ہوتے ـــ وہ اس علاقے کا رہنے والا تھا، چھوٹا سا گاؤں تھا۔ لوگ کھیتی باڑی کرتے۔ شہر سے ایجنٹ آتے اور اونے پونے داموں پر اجناس خرید لے جاتے ـــ

گاؤں کے چند ہی لوگوں نے شہر کی زیارت کی تھی اور وہ شہر بھی کوئی بڑا شہر نہ تھا بلکہ تجارتی منڈی تھی لیکن اس کے زائرین گاؤں بھر میں عزت اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھے جاتے جیسے عام طور پر حاجی احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس نے اسی گاؤں میں پرورش پائی اور زندگی کا بڑا حصہ گذار دیا ـــ اس کا ہمسایہ جو اکثر شہر جاتا آتا تھا ایک بار کسی غرض سے دارالسلطنت جا رہا تھا ـــ دونوں کا بڑا یارانہ تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ دارالسلطنت دیکھنے کا شوق لئے چل پڑا۔

دونوں مسافر خانے میں قیام پذیر ہوئے ہمسایہ اپنے کام پر روانہ ہوا ـــ کام ختم ہونے پر دو ایک دن دارالسلطنت گھومنے کا پروگرام تھا۔ بیچارا دیہاتی مسافر خانے میں اکیلا تھا۔ رات کو وہ کوئی گیارہ بجے آیا تھا اور صبح اس کا دوست اسے چھوڑ کر اپنے کام پر چلا گیا تھا۔ کوئی سہ پہر کو وہ تنہائی سے اکتا کر مسافر خانے سے نکلا ـــ مسافر خانے کے سامنے سے انتہائی وسیع اور پرشکوہ شاہراہ تھی ـــ جو تا حد نظر سیدھی چلی گئی تھی ـــ وہ دارالسلطنت کا منظر دیکھ مبہوت رہ گیا ـــ اس کا جی چاہا کہ کچھ دور تک ٹہل آئے ـــ مسافر خانے کے سامنے سڑک پر کھڑے ہوئے بڑے بھاری نیم کے درخت کو اس نے ذہن نشین کر لیا ـــ تاکہ بھٹک نہ جائے اور دھیرے سے چل پڑا ـــ ہر قدم پر ٹھٹک رہا تھا۔

شاندار اور فلک بوس عمارتیں!
تعمیر اور آرائش و زیبائش کے نت نئے انداز!!
وسیع اور بل کھاتی ہوئی پرشکوہ شاہراہیں!!
خوبصورت اور نئی نئی وضع کی کاریں!!
دندناتی ہوئی بسیں!!
گرجتی ہوئی لاریاں اور ٹرک!!
گھڑگھڑاتی ہوئی ٹرامیں!!
کھلونوں کے مانند دوڑتے ہوئے آٹو رکشے!!

سائیکل رکھئے ــــ سائیکلیں!!
آراستہ پیراستہ دُکانیں!!
پرہجوم بازار!!
عجیب و غریب لباس!!
دل موہ لینے والے حسینوں کے چھوٹے چھوٹے قافلے!!
سَو قدم کا فاصلہ اس نے اٹھارہ منٹ میں طے کیا!!
وہ چوراہے پر رک گیا ــــ پولیس کانسٹیبل کھڑا ہوا تھا اور ٹریفک اس کے اشاروں پر چل رہی تھی ــــ چوراہے کے درمیان لائٹ سگنل تھا ــــ وہ ہری سفید اور لال روشنیوں کو جلتا اور بجھتا ہوا اور اسی اعتبار سے ٹریفک کی نقل و حرکت کو کوئی دس منٹ تک ایک محویت کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا ــــ ایک بار پولیس کانسٹیبل نے اس پر نگاہ ڈالی۔ دیہاتی نے گھبرا کر نظریں جھکالیں اور دل میں سوچا ــــ "راجہ ہے راجہ!!"
اس نے پلٹ کر نگاہ دوڑائی۔ مسافر خانہ کا پھاٹک اور نیم کا درخت اسے نظر آرہا تھا ــــ وہ کچھ اور قدم آگے بڑھا۔ ایک شاندار عمارت پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔
ــــ اسے اپنے وجود اور اپنی زندگی پر شک ہونے لگا جیسے وہ زندگی کو خیرباد کہہ کر موت کے سہارے جنت الفردوس جا پہنچا ہو ــــ اس نے ایسی پرشور اور پرہجوم شاہراہ اور ایسی عمارت کبھی نہ دیکھی تھی۔ اپنے گاؤں کے آس پاس کے دیہاتوں میں اس نے بارہا سفر کیا تھا لیکن دارالسلطنت کے منظر اس کے تصور کی دنیا سے زیادہ حسین اور عجیب و غریب قسم کے تھے ــــ سرخ پتھر کی عظیم الشان عمارت پر وہ بڑی دیر تک نگاہیں جمائے جانے کیا کیا سوچتا رہا۔
اونچے اونچے خوش نما ستون!
پتھروں کی سلوں کی نفیس ترتیب!!
دروازوں اور دریچوں کی دلفریب کمانیں!!
ہرا بھرا باغ ــــ مسکراتے ہوئے پھول اور بیچ میں کی محفل میں اڑتا ہوا فوارہ!!
گیٹ پر چھوٹے چھوٹے ستون جن پر پتھر میں مہارت اور نفاست سے تراشے ہوئے شیر نصب تھے ــــ!!
وہ حیران تھا کہ عمارت کیوں کر بنی ہوگی اور انسانوں نے کیونکر بنائی ہوگی۔ اس کے گاؤں کے زمیندار کا مکان جو وہاں کا سب سے بڑا اور عالیشان مکان تھا اس عمارت کے ایک گوشے میں سما سکتا تھا اور عجوبہ سا محسوس ہو رہا تھا۔!!
اس کا خیال جن اور پریوں کی طرف گیا جن کے رحم و کرم پر کھیتوں میں فصل اگتی تھی!!
حیرت اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے کسی راہگیر کو مخاطب کیا ــــ "اس مکان میں کون رہتا ہے؟" ــــ وہ راہگیر تیزی سے کہیں جا رہا تھا اور یوں بھی نہ وہ اس دیہاتی کی بولی جانتا تھا اور نہ سمجھ سکتا تھا اس نے چہرے پر شکن ڈالتے ہوئے کہا ــــ
"نیئں مالم" (نہیں معلوم)۔ راہگیر نے لمحہ بھر رکنا بھی گوارا نہ کیا۔ دیہاتی اس کی زبان سے ناواقف تھا وہ سمجھ بیٹھا کہ "نیئں مالم" (نہیں معلوم) نے یہ عمارت بنوائی ہے۔
"کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے نیئں مالم۔" اس نے سوچا اور اس کے زمیندار کا تصور دماغ میں آیا جس کی دولت کو وہ ہمیشہ رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اسے مسرت ہوئی کہ اگر وہ اپنے زمیندار سے زیادہ مالدار نہیں تو کیا ہوا دنیا میں کوئی تو ہے جو مالدار ہے اور اس کے زمیندار سے زیادہ مالدار ہے۔
دیہاتی نے قدم آگے بڑھائے چلتے چلتے وہ کوئی دو میل نکل گیا ــــ شہر کے بابو لوگ دو گام بھی چلتے ہیں تو تھک جاتے ہیں۔ گاؤں کے جاہل اور گنوار منزلیں طے کر جاتے ہیں اور ان کو کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ اپنے بدوضع

اور دیہاتی جوتوں سے شاہراہ کو روندتا ہوا وہ بندرگاہ کے قریب جا پہنچا ــــ

کئی جہاز کھڑے دھواں اڑا رہے تھے اور سمندر کی موجیں ان کی اوٹ میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا ایک سلسلہ اسے نظر آیا ــــ اور بندرگاہ پر مال و اسباب کی کثرت اور مزدوروں کا ہجوم نظر آیا۔ وہ پریشان تھا کہ دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آخر کیا کیا دیکھے ــــ اس کے ساتھی نے سفر کے دوران بربیل تذکرہ کہا تھا کہ یہ جہاز دور دراز ممالک سے مال و اسباب لاد کر لاتے ہیں اور ساری تجارت کا دارو مدار ان پر ہے۔ ہلکی پھلکی کشتیوں کی طرح ان دیوہیکل جہازوں کو پانی کی سطح پر تیرتا ہوا دیکھ کر اسے بے حد حیرت ہوئی۔ وہ کافی دیر تک فٹ پاتھ پر کھڑا جہازوں کو تکتا رہا۔ جہازوں سے مال و اسباب اتارا جا رہا تھا اور اتارنے کے لئے عجیب عجیب طریقے استعمال کئے جا رہے تھے۔ بندرگاہ کسی زبردست میلے کا منظر پیش کر رہی تھی۔

"کیا دولت سمٹ آئی ہے" ــــ وہ کافی دیر تک کھڑا سوچتا رہا ــــ آخر اس سے نہ رہا گیا اور بندرگاہ کے احاطہ میں قدم رکھا۔ لیکن دو چار قدم چل کر ایک نامعلوم خوف نے اسے روک دیا۔

"یہ کس کے جہاز ہیں۔ یہ ساری دولت کہاں سے اٹھا لائے ہیں" اس نے دیہاتی زبان میں ایک مزدور سے پوچھا۔

"نیئں مالم!" مزدور نے سیدھا سا جواب دیا وہ اپنی پیٹھ پر لدے ہوئے بوجھ سے مرا جا رہا تھا۔

"تب ہی تو نیئں مالم نے ایسی عمارت کھڑی کی ہے جس کے ستون آسمانوں سے باتیں کرتے ہیں جس کا پتھر سرخ ہے جیسے تازہ خون دوڑ رہا ہو۔ سمندروں کی دولت اس کے جہاز سمیٹ لاتے ہیں" ــــ سوچتے ہوئے وہ ایک بار پھر شاہراہ پر آ کھڑا ہوا ــــ یکایک اس کا جسم سنسنا اٹھا۔

جنازہ آ رہا تھا!!

بیسیوں انسانوں کا ہجوم ایک بے جان پیکر کو آخری آرام گاہ کی طرف لئے جا رہا تھا ــــ چہروں پر عجب سی سنجیدگی اور خاموشی طاری تھی ــــ بے چارے دیہاتی کو بڑا دکھ ہوا اس نے سر پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ اسے فوراً کھینچ ڈالا اور احتراماً فٹ پاتھ پر دونوں ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہجوم کو تکتے ہوئے، اس کے لمبے لمبے خشک بال سمندر کی ہوا کے تیز جھونکوں پر لہرانے لگے۔

چند لمحوں میں ہجوم اس کے برابر سے گذر گیا ــــ جنازہ کے ساتھ ساتھ ہجوم کے پیچھے پیچھے ایک شخص خاموش جا رہا تھا جیسے وہ اس ہجوم کا آخری آدمی ہو۔ اس شخص کو مرحوم کا عزیز سمجھ کر دیہاتی نے دو قدم آگے بڑھائے اور قریب پہنچ کر اپنی دیہاتی زبان میں پوچھا "یہ کس کا جنازہ ہے وہ آپ کے کون تھے"

"نہیں معلوم" اس شخص نے بات ٹال دی۔ اس کا جنازے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ کسی لڑکی کو دام محبت میں پھانسنے کی ترکیب سوچ رہا تھا اور اسے شاید علم بھی نہ تھا کہ اس کے آگے جنازہ جا رہا ہے۔

"نیئں مالم" دیہاتی بڑبڑایا ــــ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور اس کے میلے دامن سے ٹکراتے ہوئے فٹ پاتھ کی آغوش میں سما گئے۔ اسے بڑا دکھ ہوا۔

"آہ نیئں مالم!" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"آہ اس کی دولت کس کام آئی۔ وہ سرخ عمارت، پھولوں کا باغ، ساز و سامان سے لدے ہوئے جہاز کس کام کے" ــــ ان خیالات کا ہجوم لئے وہ جنازہ کو جاتا ہوا دیکھتا رہا ــــ اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے اس نے ہاتھ اٹھائے اور نیئں مالم کیلئے دعائے مغفرت کی۔ جیسے وہ اس کے متعلقین میں سے ہو۔

وہ منظر بڑی دیر تک اس کی آنکھوں میں رقص کرتا رہا ــــ آخر وہ مسافر خانے کی طرف لوٹ گیا ــــ شام ہو چلی تھی!! شام کا کھانا اس نے اپنے ہمسائے کے ساتھ ڈٹ کر کھایا۔*

---

* ــــ اس کے بعد زندگی میں جب بھی اس کو اپنی غربت کا دلفگار احساس ہوتا اسے نیئں مالم (نہیں معلوم) کی شاندار عمارت اور تنگ و تاریک قبر یاد آ جاتی ــــ پھولوں کا لہلہاتا ہوا باغ اور نیئں مالم کی لاش کے کفن پر بکھرے ہوئے پھول یاد آ جاتے اور وہ مطمئن ہو جاتا!!

(صرف پلاٹ جان پیٹر ہیبل کی جرمن کہانی سے ماخوذ)

تخفیف

انشا:- محترمہ شاکرہ فضل اللہ صاحبہ (بی۔ اے، لائبریرین ویمنس کالج)

شیخ رحمان جب سویرے کلمہ پڑھتا ہوا اٹھا تو ایک دم موسم بدل چکا تھا۔ رات کی گرمی اور حبس کا پتہ نہیں تھا۔ انگڑائی لیتے ہوئے اس نے ایک فخریہ نظر اپنے باغیچہ پر ڈالی۔ اس کے مکان کا صحن کافی سے زیادہ بڑا تھا۔ آدھے حصے میں کلی کے بھٹے بوئے گئے تھے۔ اب بھٹے قریب قریب تیار تھے۔ دیوار پر مختلف پھلیوں کی بیلیں لگی تھیں۔ چھت پر کدو کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں بڑا سا جامن کا درخت تھا۔ دوسری طرف جام کا۔ یوں تو دکن کی سطح مرتفع پر موسم معتدل ہی رہتا ہے۔ بارش کا موسم شروع ہوتے ہی چاہے بارش نہ ہو موسم میں ٹھنڈک آجاتی ہے۔ لیکن پچھلے تین چار سال سے یہاں غضب کی گرمی ہونے لگی اور بارش ہونے پر ٹھنڈک ہوتی ہے۔ شیخ رحمان نے انگڑائی لیتے لیتے سوچا اگر اس کارتی میں بھی بارش نہ ہوتی تو یقیناً اس کے بھٹے سوکھ جاتے۔ بیلیں مرجھا جاتیں۔ حالانکہ محلہ کے پنڈت جی نے بتایا تھا کہ بارش اب کے ہاتھی پر سوار ہے۔ مگر مرگ لگنے پر بھی گرمی کا وہی حال رہا۔ خیر شکر ہے دوسری کارتی آردرا اچھی شروع ہوئی ہے۔ ایک دو برساتیں اچھی ہو جائیں تو کلی کے سارے بھٹے اچھے نکل آئیں گے اور بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کو تحفہ دیدینے کے بعد بھی اس کے نو بچوں، بیوی اور بہن کو بھی مل جائیں گے۔ بیلوں پر بھی خوب اچھی پھلیاں آئیں گی۔

اس کی بیوی باورچی خانے میں تھی۔ بڑی بیٹی اس کو مدد دے رہی تھی۔ سب سے چھوٹی بیٹی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ دوسری بکرے کو ہرے پتے کھلا رہی تھی۔ بقیہ چاروں لڑکیاں بھی ایسے ہی کاموں میں لگی ہوئی تھیں یا اسکول کا سبق یاد کر رہی تھیں۔ بڑا لڑکا اپنے کمروں کی دیکھ بھال میں لگا تھا۔ آخر اسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ شیخ رحمان نے اس کی تعلیم میں پوری دلچسپی لی تھی۔ کالج کے لکچراروں سے ٹیوشن دلایا تھا۔ آخر اس نے اچھے نمبروں سے انٹر کامیاب کر لیا اور کل ہی اس کا نام میڈیکل کالج کے بورڈ پہ شریک لڑکوں کی فہرست میں آگیا۔ اب ایک سو پانچ روپے اس کی فیس کے داخل کرنے تھے۔

شیخ رحمان کی جمع پونجی ان بچوں کی تعلیم میں تیزی سے گھٹ رہی تھی۔ مگر مستقبل کا خیال کرکے وہ تعلیمی اخراجات میں کبھی تنگ دلی سے کام نہ لیتا۔ ابھی اس کے پاس تین چار سو جمع تھے۔ بڑے لڑکے کی فیس اور کتابوں کا خرچ تو آسانی سے نکل سکتا ہے۔ آئندہ کے لئے اللہ مالک ہے۔ شیخ رحمان کو ایک دم یاد آگیا کہ منجھلے لڑکے کی بھی تو فیس دینی ہے۔ منجھلا بیٹا اس وقت اندر کمرے میں ریڈیو پر کوئی اسٹیشن ملا رہا تھا۔ شیخ رحمان جھنجھلا اٹھا۔ باوجود ہر مہینے بجلی کی بل بتا بتا کر ڈانٹنے کے بھی یہ شیطان ہر وقت ریڈیو کے پیچھے

گار رہتا ہے۔ شیخ رحمان کی دلی خواہش تھی کہ اس کو
ائلٹ بنائے مگر اسے تو وقت ضائع کرنے کا شوق ہے۔
نڑ میں سرکاری کالج میں داخلہ نہ مل سکا۔ اب خانگی کالج
یں (۱۴۱) روپے دینے پڑیں گے۔ کتابوں کا خرچ علاوہ۔
یخ رحمان کو ابھی سے اپنی تھیلی خالی دکھائی دینے لگی۔ آئندہ
رچ کیسے چلے گا۔ بڑی بیٹی کی شادی سر پہ ہے۔ یوں تو
س کی کفایت شعار بیوی نے بہت کچھ انتظام کر رکھا ہے۔
اہم دو ڈھائی سو کی ضرورت تو ہوگی ہی۔ ایک لمحہ کے لئے
س کی آنکھیں بے نور ہوگئیں۔ لیکن اس کا جھٹکوں میں لڑا
وا دل اپنے آپ کو تسکین دینے لگا کہ بڑے لڑکے کو ضرور
چھ نہ کچھ وظیفہ ہو جائے گا جس سے دونوں بھائیوں کی پڑھائی
خرچ تو نکل جائے گا۔ رہا گھر کا خرچہ تو اس کی موجودہ
نخواہ ساڑھے باسٹھ روپے۔ اردلی کا وظیفہ ۱۱ روپے ۸ آنے۔
وہتر روپے کی یہ آمدنی تو یقینی ہے۔ باغیچہ سے بھی کچھ نہ کچھ
ل ہی جاتا ہے۔ جامن اور جام، مکئی کے بھٹے، بکری کا دودھ
اب تحفہ تحائف اور گھر ہی میں خرچ ہو جاتا ہے۔ آئندہ سے
سب فروخت کر دیں گے۔ دو سال بعد چھوٹے کو کہیں نہ
یں ملازمت مل جائے گی اور جب بڑا بیٹا ڈاکٹر بن جائے گا
بس آرام ہی آرام۔

شیخ رحمان پہلی جنگ عظیم میں جب عام بھرتی ہو
ہی تھی تو ماں باپ سے ذرا سی بات پر جھگڑ کر فوج میں بھرتی
و گیا۔ وہ فرانس کے محاذ پر لڑا تھا اور بہت دنوں تک
نگلستان میں رہا۔ گاروں کی گرم وادی میں جہاں گیہوں،
چقندر اور آلو کی کاشت ہوتی ہے، اس نے کچھ دن گزارے
ے۔ دریائے سین کے کنارے گھوم چکا تھا۔ شہروں کی
لہن پیرس کی زندگی دیکھی تھی اور صحیح سلامت واپس وطن
گیا تھا۔ اس کی بہادری پہ اسے چاندی کا تمغہ ملا۔ واپسی
ر اسے دو مربع زمین انعام میں ملی اور صاحب عالیشان
رنڈنٹ بہادر کی پیشی میں اردلی کی جگہ مل گئی۔ چونکہ اسے
انگریزی میں بات چیت کرنی آتی تھی اس لئے صاحب عالیشان
کی خاص پیشی میں مقرر کیا گیا۔ انعام واکرام کی شکل میں
اسے خاصی آمدنی ہو جاتی۔ P.W.D. کے گتہ دار کی خوشامد
کر کے اپنی زمین پر تھوڑی سی رقم خرچ کر کے اس نے ایک
چھوٹا سا خوش وضع مکان بنا لیا۔ بجلی اور نل بھی لگائے۔
اسٹاف کے ایک عہدہ دار نے جاتے ہوئے اپنا ریڈیو سیٹ
اسے دیدیا۔ بیوی اور بچوں کی آسانی سے ہی بسر ہونے
لگی۔ بیوہ بہن کو بھی اس نے اپنے پاس بلا لیا۔ اب اس کا
ارادہ ہونے لگا کہ بقیہ زمین پر ایک مکان تعمیر کر کے
کرایہ پر اٹھا دیا جائے تاکہ ہمیشہ کے لئے آمدنی کا ذریعہ
ہو جائے مگر اسی اثناء میں دوسری جنگ چھڑ گئی اور اس
کے بعد آزادی اور پولیس ایکشن نے حالات بدل دئیے۔
صاحب عالیشان رخصت ہو گئے۔ ہولناک گرانی نے
سب کو دبوچ لیا۔ مگر صبر و شکر سے وہ اپنے کنبہ سمیت
گذارا کرتا رہا تھا۔ خاص سفارش کی بنا پہ اسے ایک دفتر
میں چوکیداری کا کام مل گیا۔

جلد ہی اسے اپنے دفتر میں مقبولیت حاصل ہو گئی۔
صبح سویرے جب سب چپراسی جمع ہو جاتے اور اپنے اپنے
کاروبار سے فارغ ہو کر صاحبوں کے انتظار میں بیٹھ جاتے
تو وہ سب کو اخبار پڑھ کر سناتا۔ کبھی فرانس یا انگلستان
کے کسی شہر کا ذکر آ جاتا تو وہ اپنے جنگ کے تجربات بڑی
دلچسپی سے سناتا۔ کبھی کسی چپراسی کو راشن خریدنے کیلئے
روپے دو روپے کی ضرورت ہوتی تو وہ بغیر منافع کے
قرض دیدیتا۔ بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کے لئے
وہ اپنے باغیچہ کی چیز بطور تحفہ لے آتا۔ نیز چپراسیوں اور
اہلکاروں کے لئے علاوہ لے آتا۔

آج پہلی تاریخ تھی۔ یہ معلوم رہنے پر بھی کہ آج
گھر پر دھوبی، مہتر، مکاندار، بنیا وغیرہ وغیرہ کا قرضہ
چکانے کے بعد بہت کم رقم اور کافی قرضہ باقی رہ جائے گا

دفتر میں بھی مسرور نظر آتے ہیں۔ شیخ رحمان تو ایسی سب فکروں سے دور تھا۔ وہ تنخواہ لے جاکر اپنی بیوی کے حوالے کر دیتا۔ پہلی تاریخ کو اس کی بیوی ضرور کوئی اچھی چیز پکاتی اور سارا گھر ہنسی خوشی دن گذارتا۔ آج بھی وہ شام کے مزیدار کھانے کا تصور کر کے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ چپراسی نے آکر اسے صاحب کا بلاوا دیا۔

وہ جانتا تھا کہ پہلی تاریخ کو صاحب کے بلانے کا کیا مقصد ہوتا ہے۔ بات در اصل یہ تھی کہ بیگم صاحبہ کے سامنے صاحب کو پہلی تاریخ کو پوری تنخواہ پیش کر دینی ہوتی۔ ان کو اس کی اجازت نہیں تھی کہ اپنی بیوہ ماں کو جنھیں صرف پچیس روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا کچھ دے سکیں۔ ظاہر ہے پچیس روپے میں ان کا گذر نہیں ہو سکتا تھا۔ صاحب اپنے دورہ کی بھتہ کی رقم سے ماں کی مدد کیا کرتے۔ کبھی کبھی بھتہ کی رقم ملنے میں دیر ہو جاتی تو پہلی تاریخ کو شیخ رحمان سے چالیس، پچاس روپیہ قرض لے لیتے اور بھتہ کی رقم ملنے پر اس کا قرضہ ادا کر دیتے۔ اپنی اسی خدمت کے معاوضہ میں شیخ رحمان کو فی الحال تخفیف کا ڈر نہیں تھا حالانکہ اس کی عمر پچپن سال پوری ہو چکی تھی اور ہر طرف تخفیف کا زور بھی تھا۔ مگر صاحب نے سفارش کی تھی کہ اسے نئی ملازموں میں شامل کر کے ۶۰ سال تک کارگذار رکھا جائے اور اس کے لئے تو ابھی پانچ سال باقی تھے۔ تب تک اس کے دونوں بیٹے ملازم ہو جائیں گے۔

مگر آج صاحب کا مطالبہ بہت زیادہ تھا۔ بات در اصل یہ تھی کہ ان کی ماں حج کو جا رہی تھیں۔ کچھ رقم انھوں نے خود جمع کر رکھی تھیں، کچھ بیٹے نے فراہم کر دی تھی۔ تاہم چار پانچ سو کی اور کمی ہو رہی تھی صاحب کو معلوم تھا کہ شیخ رحمان اسامی آدمی ہے۔ اس سے پہلے بھی چھوٹی موٹی ضرورتوں میں وہ صاحب کو سو ڈیڑھ سو روپیہ قرض دے چکا ہے جس کو صاحب بہ سہولت ڈیڑھ دو سال میں ادا کر چکے تھے۔ پر اب ایک دم چار سو روپیہ۔ اگرچہ یہ رقم اس کے پاس موجود تھی مگر اس کے بیٹے کو ڈاکٹری میں داخلہ لینا تھا۔ اس کے دوسرے بیٹے کو انٹر کی فیس داخل کرنی تھی۔ اس کی بیٹی کی بارات آنے والی تھی۔ ان تمام خرچوں میں اس کی جمع کی آخری پائی بھی لگ جانے والی تھی۔ صاحب کو تو دوسرے ذرائع سے بھی قرض مل سکتا ہے، کیا میں ہی غریب رہ گیا ہوں۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اپنی مفلسی جتائی۔ صاحب نے بڑی متانت سے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ بات اتنی آسانی سے ٹل جانے پر اسے اطمینان ہو گیا۔

دوسرے دن اول وقت تخفیف کی نوٹس اس کے ہاتھ میں تھی۔

اردو امتحانات

ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات اردو فاضل، اردو عالم، اردو زباندانی، اردو دانی شہر حیدرآباد کے علاوہ اضلاعی مرکزوں میں ۱۱ تا ۲۴ جون ۱۹۵۵ء ایک ساتھ منعقد ہوں گے۔ فیس اور درخواستیں بھیجنے کی آخری تاریخ ۵ مئی مقرر کی گئی ہے۔ ہر اس مقام کو مرکز بنایا جائے گا جہاں سے کم از کم (۲۰) امیدوار شریک ہوں۔

تبصرے

ناقابلِ فراموش مصنفہ سردار دیوان سنگھ مفتون۔ ایڈیٹر "ریاست" دہلی۔
رائل سائز، حجم (۶۱۵) صفحے۔ قیمت مجلد دس روپے۔ گرد پوش سے مزین۔

"ناقابلِ فراموش" مجموعہ ہے سردار جی کی چند یاد داشتوں کا جو چند سے گزر کر اتنی بڑھ گئیں کہ ایک دفتر ہو گیا۔ اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات سے لے کر تا ایں دم وہ جس قابلِ ذکر واقعہ سے دوچار ہوئے ضبطِ تحریر میں لا لیا۔ پھر سردار جی کی زندگی جیسی ہنگامہ خیز، ہنگامہ پرور، مخالفین کے لئے جاں گسل، دوستوں کے لئے فرحت نواز اور سکون بخش، محتاجوں اور ضرورت مندوں کے لئے گرہ کشا اور حاجت بر آر، روسا عظام اور راجوں مہاراجوں کے لئے خارِ مغیلاں بنی رہی ہے اس کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ان کی تحریر کی دلآویزی، جگہ جگہ شوخی، کہیں رحم کا اظہار، کہیں خشونت کے آثار عجیب لطف پیدا کرتے ہیں۔ ان واقعات میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ملتی ہیں جنھوں نے اپنے بلند کردار کا مظاہرہ کر کے عوام کے قلوب کو مسخر کر لیا تھا۔ سردار جی کے موقلم نے ان کی حسین تصویریں پیش کر کے انھیں حیاتِ دوام عطا کر دی۔ اس مرقعے میں انگریز، مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی ہر مذہب و ملت کے افراد کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ سادہ لوحوں کی بھی چند دلچسپ تصویریں ملتی ہیں جن میں شیر خاں، نیتاجی نیم چند اور نا ہر ملیاوی شامل ہیں۔ علم دوست اصحاب میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مدظلہٗ کے بھائی مولوی شیخ ضیاء الحق، ملا واحدی، خواجہ حسن نظامی، بھیا احسان الحق وغیرہ ہیں۔ مولانا آزاد رح، مولانا ظفر علی خاں اور ہارنیمن جیسے مشہورِ زمانہ صحافی کے خاکے بھی موجود ہیں۔ ایسے وکلاء اور ججس کے مرقعے بھی ملیں گے جنھوں نے اپنی کارکردگی اور انصاف پرستی میں ہندوستان گیر شہرت حاصل کی تھی۔ کتاب گوناگوں خصوصیات کی حامل اور بوقلموں شخصیات کی آئینہ دار ہے۔

مختصر یہ کہ یہ نگار خانہ ایسا ہے جس میں "کیا ہے جو یہاں موجود نہیں" کے سوال کا جواب نفی اثبات میں ملتا ہے۔ سردار جی ہندوستان کے جرنلسٹوں کی صفِ اول میں شمار کئے جاتے ہیں اس لئے ہر جرنلسٹ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے بعد "ناقابلِ فراموش" ہر پیشہ اور فن سے تعلق رکھنے والے حضرات خواہ وہ وکیل ہوں یا جج، ادیب ہوں یا شاعر، روسا عظام ہوں یا عوام، حتیٰ کہ قیدی ہوں یا جیلر سب کے لئے یکساں دلچسپ۔ اس لئے ہر کتب خانے کی زینت بننے اور بار بار مطالعہ کئے جانے کے قابل ہے۔

عام اردو داں کو بعض چیزیں کھٹکیں گی۔ مثلاً کتاب میں اکثر مقامات پر مضامین اور واقعات کی تکرار ملے گی، دوسرے مختلف جملوں کا استعمال بالکل انگریزی انداز میں ہوا ہے اور تیسرے زبان میں پنجابیت زیادہ ہے۔ لیکن تکرارِ مضمون اس لئے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ یہ چنداں گراں نہ گزریں گے بلکہ واقعہ کی مزید تصدیق کریں گے اور بلحاظ زبان اردو لکھنو،

دہلی اور پنجاب کی حد کو توڑ چکی ہے۔ اس لئے سردار جی بھی اپنی زبان لکھنے پر مجبور تھے۔ غرض کہ کتاب انتہائی دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔

جوش ملسیانی (ابھنندن گرنتھ) | مرتبہ ابھنندن گرنتھ کمیٹی۔ قیمت ۱۰ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مرکز تصنیف و تالیف نکو دَر جالندھر۔

یہ ایک خوبصورت ہدیہ ہے جو کمیٹی کے اراکین نے ملک کے مشہور شاعر جناب لبھو رام جوش ملسیانی کی خدمت میں (پیش کیا ہے)۔ کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصہ کا نام تاریخی ہے۔ پہلا حصہ "پیغام خلوص و نیاز مندی" (۱۹۵۷) کے تحت (۹۶) صفحات پر ملک کے مشاہیر اور ادیبوں کے پیغامات جمع کئے گئے ہیں جس میں صدر جمہوریہ، وزیر اعظم اور ملک کی دیگر سیاسی ادبی شخصیتوں کے پیغامات جمع کر دیئے گئے۔ ان کا مطالعہ بھی حضرت جوش کی ہر دلعزیزی کا ایک ثبوت فراہم کرتا ہے۔

مقالات کو "کثرت قدر و منزلت" (۱۹۵۷) کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ حضرت جوش کی سوانح اور ان کی شاعری پر (نظر) آفریں اور بصیرت افروز مقالے شامل ہیں۔ خصوصاً پنڈت ہری چند اختر مرحوم، جگن ناتھ آزاد، سید فاضل شاہ زیدی، اسد ملتانی، گوپی ناتھ امن اور عرش ملسیانی (فرزند جوش) کے مقالے نہایت وقیع اور قابل مطالعہ ہیں۔ یہ حصہ ۹۷ تا ۲۷۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ جناب زیدی صاحب کا مضمون متروکات کے تعلق سے نہایت اہم ہے اور نوجوان شعرا کے لئے مشعل ہدایت۔

تیسرے حصہ کا نام "رباض دلپذیر" (۱۹۵۷) ہے جس میں حضرت جوش کے تلامذہ کا تذکرہ ۲۹۱ سے ۴۵۲ صفحات تک۔ اور "تحفۂ ریاض جنت" (۱۹۵۷) تلامذہ کے تلامذہ کا تذکرہ ہے۔ اس طرح یہ کتاب حضرت جوش کی ادبی خدمات کی مکمل آئینہ دار (ہے)۔

حضرت جوش ملسیانی پنجاب کے ایک دور افتادہ مقام کے رہنے والے ہیں لیکن ذوق شعر نے انھیں آج اہل زبان کی صف لا کھڑا کیا۔ داغ کے شاگرد سے زیادہ وہ فطرت کے شاگرد ہیں۔ ان کے ذوق نے داغ سے زیادہ رہنمائی کی۔ داغ کے توسط سے شاگردی اور استادی کا تعلق معلوم۔ داغ کی چھاپ ان کے کلام کو زبان کے اعتبار سے تو ممتاز کر سکی ہے لیکن بلحاظ وضع قدیمانہ داغدار ہے اور جوش کی شاعری بالکل بے داغ۔ جہاں رنگینی ہے وہ انتہائی دلآویز چاہے کسی محفل میں پڑھئے کہیں محجوب ہونے کی نوبت نہ آئے۔ بعض اشعار اپنی بے ساختگی، سلاست، روانی، رفعت تخیل اور بلند پروازی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ فرماتے ہیں ؎

میری رسوائی کا حال اے داور محشر نہ پوچھ　　میں بھری محفل میں یہ قصہ سنا سکتا نہیں

مدت ہوئی کہ باب اثر بند ہو گیا　　میں نے دعا سے ہاتھ اٹھایا نہیں ہنوز

اک فقط میں ہی ترا کام نہ آیا ظالم　　خاک اڑاتی ترے کوچے سے صبا بھی آئی

عشق نے ہم کو زیارت گاہ عالم کر دیا　　گرد غم سے ہو گیا تعمیر کعبا ایک اور

جوش کی صداقت پسند اور جدت طراز طبیعت نے ایسے ایسے جواہر اگلے ہیں کہ پڑھتے اور سر دھنتے رہیئے۔ کمیٹی ارکان قابل صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایک مغتنم ہستی کی خدمت میں ابھینندن گرنتھ پیش کیا اور اپنے متعلق ایک زندہ قوم کے افراد ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

دیوان غالب | مرتبہ الک رام۔ ناشر آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی۔ قیمت ۵ روپے ۵۰ نئے پیسے۔

غالب کے دیوان کی ترتیب مالک رام صاحب نے کی ہے۔ مالک رام صاحب کا نام ہی اس کی صحت کے لئے معیارِ شہادت ہے۔ غالب کے عین حیات ان کے جو دیوان شائع ہوئے ہیں اس پر ایک تفصیلی مقدمہ لکھا ہے اور متن کے ضروری اختلافات جو دوسرے مطبوعہ دیوانوں میں پائے جاتے بتلائے ہیں۔ اس طرح یہ ایک صحیح اور مکمل نسخہ کہا جاسکتا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب اور روشن اور گرد و پوش سے مزین ہے۔

فریادِ داغ

مرتبہ تمکین کاظمی۔ ناشر آئینہ ادب۔ چوک انارکلی۔ لاہور۔ مجلد اور گرد و پوش سے مزین۔ قیمت ۳ روپے۔

فریادِ داغ نواب مرزا خاں داغ کی مثنوی ہے۔ داغ کی زبان اور ان کے بیان کے متعلق کچھ کہنے کی حاجت نہیں البتہ فریادِ داغ پر جو مقدمہ جناب کاظمی صاحب نے لکھا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ حجاب اور داغ کے تعلقات پر داغ کے خطوط اور روزنامچوں سے مواد فراہم کر کے ترتیب دیا گیا ہے اور اس کام میں مرتب نے کافی محنت اٹھائی ہے۔ مقدمہ داغ کے معاشقہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے انتہائی کارآمد ہے اور داغ کی زندگی کے ایک پہلو کو پوری طرح اجاگر کرتا ہے۔ کتابت اور طباعت روشن اور دیدہ زیب ہے۔

نوائے آزادی

ادبی پبلشرز بمبئی ۸۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی۔ صفحات (۴۰۰) قیمت ۵ روپے۔

آزادی کی ادبی تاریخ ہے جس کو مرتبین نے بڑی خوش سلیقگی سے مرتب کیا ہے اور جامعہ ملیہ نے ٹائپ میں نہایت محنت کے ساتھ شائع کیا ہے۔

کتاب کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں سرسید اور ان کے ساتھیوں کی آزادی کی کوششوں کے ادبی اقتباسات ہیں دوسرے حصے میں سیاسی بیداری کے آغاز پر مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ تیسرے حصے میں عوام میں بیداری کا احساس، خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے تعلق سے مضامین انتخاب کئے گئے ہیں۔ چوتھے حصے میں سول نافرمانی سے ۱۹۴۷ء تک کی ادبی کاوشوں کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اس طرح اس کے مطالعہ سے آزادی کی تحریک پوری طور پر ارتقاء پائی ہوئی ہمارے سامنے آتی ہے۔ مرتبین لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے آزادی کے تعلق سے مضامین کا ایک حسین گلدستہ تیار کیا جو ہر کتب خانہ کی زینت بن سکتا ہے۔

جواہر لال نہرو

مرتبہ خورشید احمد جامی۔ نامی پریس پبلیکیشنز بیورو۔ حیدرآباد۔ قیمت ایک روپیہ ۸/

یہ پنڈت جی کی مختصر سی سوانح عمری ہے جس کو آسان زبان میں بچوں کے لکھا گیا ہے۔ اس میں متعدد اصحاب کی تقریظیں ہیں جو (۳۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں اور ۳۷ تا ۹۶ صفحات میں پنڈت جی کی زندگی کے اہم واقعات پیش کر دیئے گئے ہیں ـــ بچوں کے لئے جب یہ کتاب لکھی گئی تھی تو اتنی زیادہ تقریظوں کا شریک کرنا محلِ نظر ہے۔ اس سے نہ صرف ضخامت پر اثر پڑا بلکہ قیمت بھی بہت زیادہ ہوگئی۔

کتابت و طباعت اور ٹائٹل دیدہ زیب ہے۔ مندرجہ بالا پتہ سے مل سکتی ہے۔

غذا اور اس کی اہمیت

مصنفہ محمد عبد اللطیف خاں۔ ۳-۴-۸ شکر باغ۔ نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد۔ قیمت ۳ روپے۔

اس کتاب میں مختلف قسم کے اجناس، ان کے فوائد، مختلف میوے اور ان کے اثرات، حیاتین کے متعلق تفصیلات، دودھ، انڈے، مچھلی وغیرہ سب پر تفصیلی معلومات دی گئی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب صرف نصابی ضروریات کے لئے ہی نہیں بلکہ عام مطالعے کے لئے بھی مفید ہے۔ قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

(ا - ص)

اساس عربی

محمد نعیم الرحمٰن ایم۔اے، لکچرار عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی ۔ ناشر نور محمد کارخانہ تجارت۔ آرام باغ کراچی۔
صفحات (۲۳۰) ۔ قیمت پانچ روپے۔

قواعد عربی کو نعیم الرحمٰن صاحب نے بڑی محنت سے جمع کیا ہے ۔ صرف اور نحو کے مختلف اصول بڑی خوبی کے سا
ایک جگہ کر دیئے گئے ہیں مشقیں اور عربی کے جملے دے کر معلم عربی کے فرائض کی تکمیل کی گئی ہے ۔ جو طالبعلم پوری کتاب پڑ
ھ جائے وہ صرف و نحو کے بیشتر مسائل سے آگاہ ہو جائے گا ۔ یہ کتاب اس کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی ۔ قواعد
بعض اجزاء جو مبتدی کے لئے پریشانی کا باعث ہوتے ہیں ان میں سہولت پیدا کی جاتی تو بہتر ہوتا ۔ مثلاً

۱۔ صفحہ (۲۷) ۔ ال کے تعارف میں ضمایر واحد کا ذکر اور اسی سلسلہ کی مشق میں خبری اور وصفی جملوں کا صرف
مبتدیوں کے لئے ذہنی انتشار کا باعث ہے۔

۲۔ صفحہ (۶۰) ۔ زمانہ کی تقسیم ماضی، مضارع، امر اور نہی کو بتلایا گیا ہے حالانکہ یہ فعل کی تقسیم ہے اور مضا
کو مضارع کہنے کا مقصد یہی ہے۔

۳۔ ترجمہ میں اردو جملوں کو غلط لکھا جانا مناسب نہ تھا۔ مثلاً (لکھا اس ایک مرد نے)۔

۴۔ جب ہر جگہ اردو میں سمجھایا جا رہا ہو تو اردو جملوں کے دوران میں "ال" داخل کر کے الجملۃ الاسمیہ یا ال
کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

۵۔ صفحہ ۶۹ پر مضارع کی علامتیں بتلائی گئی ہیں لیکن کونسی علامت کن کن صیغوں کے لئے آتی ہے اس کی وضا
نہیں کی گئی۔

۶۔ صفحہ ۸۵۔ مضارع منصوب و مجزوم کی گردانیں ایک جگہ کر دی گئی ہیں اور بلا ادخال حرف ناصب و جاز
ایسی بعض اور کمزوریاں ملیں گی۔ اگر دوسرے ایڈیشن کے موقع پر انہیں پیش نظر رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ ابو محمد عبد

رسالہ انعام

اردو زبان میں (۱۵) سال سے کم عمر بچوں کے لئے اردو رسالوں کی بہت کمی ہے۔ بچوں کے لئے لکھ
بہت مشکل کام ہے ۔ ہر لکھنے والا اس کا مرد میدان نہیں ہو سکتا ۔ وہی اہل قلم بچوں کی دلچسپی اور ترب
کے موضوع پر لکھ سکتے ہیں جو ان کی نفسیات سے بخوبی واقف ہوں ۔ اس اہمیت کے پیش نظر بچوں کے لئے جتنے رسا
شائع ہوں وہ قابل قدر ہیں ۔ رسالہ انعام بھی ایسے ہی رسالوں میں سے ایک ہے ۔ نومبر ۱۹۵۵ء کا شمارہ پیش نظر ہے جس
میں مضامین، کہانیاں، نظمیں، لطیفے اور تصویریں شامل ہیں ۔ عنوانات دلچسپ اور زبان و انداز بیان دلکش ہے ۔ اس
مدیر وقار خلیل صاحب قابل مبارکباد ہیں ۔ لیکن اس رسالہ کو اور زیادہ دلچسپ بنایا جا سکتا ہے ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے اس پ
مجلس ادارت کو بچوں کی نفسیات کے ماہروں سے مشورہ کرنا ضروری ہے ۔ اگر رسالہ کا خط ذرا جلی ہو اور تصویریں مختلف رنگ
میں شائع کی جائیں تو دیدہ زیبی میں اضافہ ہوگا ۔ اگر ادارہ ہمت کر کے (۶) ماہ تک اچھے رسالے شائع کرے تو پھر خریدارو
کی تعداد بڑھ سکتی ہے ۔ خریدار بنانے کی مہم جلد شروع کرنی چاہیئے ۔ اور ان کو یہ اطمینان دلانا ضروری ہے کہ رسالہ وقت
شائع ہوگا اور اس کی افادیت اور دلچسپیوں میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

گولکنڈہ میگزین

گورنمنٹ ہائی اسکول گولکنڈہ کے طلبہ نے یہ دلچسپ اردو رسالہ اپنے مشیر مولوی محمد احمد اللہ خاں
کی نگرانی میں خاص ذوق اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے ۔ اس میں یوں تو ہر قسم کے مضامین نظم و نثر شا

زیادہ تر طالب علموں ہی کے لکھے ہوئے ہیں لیکن مدرسہ چونکہ قلعہ گولکنڈہ میں واقع ہے جہاں یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلہ میں ایک جشن منایا گیا تھا اس لئے ایک مضمون اس مدرسہ کے ایک استاد شری جنگیا کا اس قومی تہوار پر شریک ہے اور ایک مضمون خود اس کے نگران کار مولوی احمد اللہ خاں صاحب نے کوہ نور پر لکھا ہے۔ جس میں تاریخی واقعات کے سلسلہ میں طلبہ کو عمدہ نصیحتیں بھی کی گئیں ہیں۔ طالب علموں نے بھی گولکنڈہ کی سیر اور محمد قلی قطب شاہ کے دور کے ایک دلچسپ واقعہ پر اچھے مضمون لکھے ہیں۔

یہ رسالہ اپنے معیار اور سلیقے کے لحاظ سے دوسرے ہائی اسکولوں کے لئے ایک عمدہ نمونے کا کام دے گا۔

سحاب

حسن شہیر۔ ناشر:۔ نیا ادارہ الہ آباد۔ صفحات (۱۷۶)۔ قیمت ستّے روپے۔

حسن شہیر صاحب کی نظموں اور غزلوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ غزلوں میں زندگی کے مختلف عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی غزلوں میں بھی وہی ندرت اور انوکھے پن کا انداز ہے جو ان کی نظموں میں رہا ہے۔ قدیم تصورات جو متغزلین کا سرمایہ رہے ہیں اس میں بہت کم نظر آتے ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ اس میں گہرائی اور گیرائی جتنی کہ چاہیئے نہیں ملتی۔

انسانیت

مصنفہ سی۔ ای۔ مدیراج (ط۔ ای عثمانیہ)

مصنف نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ (۵۶) صفحات پر اور دوسرا (۵۷) سے شروع ہو کر (۹۲) پر ختم ہوتا ہے۔ مصنف نے اپنے مختلف عنوانات پر چھوٹے چھوٹے مضامین کو ایک جگہ جمع کیا ہے اور ہر مضمون میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذاہب اپنی جگہ بہت بلند اصول رکھتے ہیں۔ وہ ایک انسان کو زندگی کا صحیح راستہ دکھاتے ہیں اور انسانیت پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں لیکن انسان غلط راہیں اختیار کر کے اور مذہب کی تعلیم کو غلط زاویئے سے دیکھ کر یا حاصل کر کے انسانیت سے دور جا پڑتا ہے اور اپنی آدمیت کھو دیتا ہے۔

یہ کتاب ابن الوقت اور خود غرض انسان کو نیکی کا صحیح راستہ بتلاتی ہے اور اس قابل ہے کہ ملک کے ہونہار سپوتوں کے مطالعہ میں آئے اور وہ اس سے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں اور ملک کی صحیح خدمت انجام دے سکیں۔

نورنگ

از بلقیس اختر۔ سلسلہ مطبوعات کل ہند انجمن اشاعت اردو۔ حیدرآباد۔ قیمت چار آنے۔

یہ ایک معاشرتی افسانہ ہے جس کی ابتداء بلقیس اختر نے کی اور دوسرا جز اپنی آٹھ سہیلوں سے علحدہ علحدہ لکھایا ہے۔ عرصہ دراز قبل ساقی (دہلی) نے بھی ایک افسانہ "سات تارے" شائع کیا تھا۔ لیکن اس میں ہر افسانہ نگار افسانہ کو آگے بڑھاتا ہے اور ساتوں افسانہ نگار اس کی تکمیل کرتے ہیں۔

معاشرہ میں لڑکیوں کی غلط تربیت کی وجہ سے جو نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اس پر افسانہ نگار نے اپنے نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے غیر فطری واقعات کو بھی ان میں سمو دیا ہے جس کی وجہ سے افسانہ میں وہ کشش باقی نہیں رہتی جو ابتداء میں تھی۔ ہمارے سماج میں آج بھی اس کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں اور ان کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔ اس لحاظ سے یہ افسانے قابل مطالعہ ہیں۔

(ا۔ ص)

میر محمد مومن

(دوسرا ایڈیشن چھپ گیا)

پیشوائے سلطنت قطب شاہی اور مشہور شاعر اور ادیب میر محمد مومن کے حالات زندگی اور تصنیفات و خدمات سے یہ کتاب بیس سال قبل ادارۂ ادبیات اردو سے شائع ہوئی تھی اور بہت جلد اس کے سارے نسخے فروخت ہوگئے اور روز بروز مانگ ہو رہی تھی۔ چونکہ یہ کتاب بہت ضخیم ہے اور اس میں متعدد تصویریں شریک ہیں اس لئے دوسرا ایڈیشن شائع ہونے میں کافی دیر ہوگئی۔ بالآخر اب یہ چھپ کر دوبارہ منظر عام پر آئی ہے۔ کسی بڑے کتب فروش سے یا سب رس کتاب گھر، خیرت آباد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ قیمت تین روپے۔

محمد قلی قطب شاہ کی جیون کہانی

بچوں اور ان پڑھ بالغوں کے لئے وقار خلیل صاحب ایڈیٹر "انعام" نے قلمبند کی ہے۔ اس کی زبان بہت سلیس اور سادہ ہے۔ وقار خلیل صاحب حیدرآباد سے بچوں کا رسالہ "انعام" نکالتے ہیں اور بچوں کے ادب میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔

محمد قلی کی جیون کہانی بہت دلچسپ اسلوب میں اس طرح لکھی گئی ہے کہ ہر شخص اس کو پڑھ کر ان خصوصیات اور خوبیوں سے واقف ہو سکتا ہے جن کی وجہ سے یہ بادشاہ جنوبی ہند میں اب تک یاد کیا جاتا ہے۔ آخر میں حضرت نجم آفندی کی ایک نظم بھی شریک ہے جو محمد قلی قطب شاہ پر بھی لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف پچاس نئے پیسے۔

ارمغان محمد قلی

یہ ایک باتصاویر اردو و انگریزی رسالہ ہے جس میں محمد قلی قطب شاہ اس کی محبوبہ بھاگ متی، اس کی بنائی ہوئی عمارتوں اور قطب شاہی وزراء و امراء کی تصویریں اور حالات درج ہیں۔ بہت عمدہ کاغذ پر رنگین ٹائیٹل کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

نذر محمد قلی قطب شاہ

جو قطب شاہی عہد کا باتصویر انسائیکلوپیڈیا ہے۔ تقریباً سو تصاویر اور مشاہیر ہند کے اعلیٰ پائے کے اور مستند مضامین اور نظمیں خاص اہتمام سے عمدہ کاغذ پر چھاپی جارہی ہیں۔ کیا عجب کہ اس سال کی بہترین اردو کتاب ثابت ہو۔ کچھ اور دن انتظار فرمائیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کی دیگر جدید مطبوعات

۱۔	حیدرآباد کے بڑے لوگ	از غلام پنجتن	دلچسپ تذکرہ	قیمت دو روپے
۲۔	میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام	" ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	حیات اور دیوان	" دو روپے
۳۔	سروجنی دیوی	" وزیر حسن	ایک دلکش سوانح عمری	" دو روپے
۴۔	مہاتما گاندھی	" خورشید احمد جامی	منظوم حالات	" پچھتر نئے پیسے
۵۔	تذکرہ مخطوطات (جلد سوم)	" ڈاکٹر زور	تحقیقی تذکرہ	" سات روپے
۶۔	طالب و موہنی	" سید محمد واله مرتبہ ڈاکٹر زور	اردو کی قدیم مثنوی	" ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے
۷۔	اردو میں سائنسی ادب (قدیم ترین کارنامے)	" حمید الدین شاہد	علمی تذکرہ	" پچاس نئے پیسے
۸۔	اردو دانی (حصہ اول)	" اظہر الدین	تعلیم بالغان کا قاعدہ	" پچیس نئے پیسے

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

خاص نمبر۔ یوم محمد قلی قطب شاہ

جلد (۲۲)، شمارہ (۴، ۵، ۶) ماہ اپریل، مئی، جون ۱۹۵۸ء

نگراں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

جانکی پرشاد

سالانہ چندہ چھ روپے سکہ ہند

ششماہی " تین " "

قیمت

ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے "نیشنل فائن پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ

کے حالات زندگی، خدمات شعر و ادب، اس کے بنائے ہوئے شہر حیدر آباد، اس کی سلطنت اور اس کے خاندان سے متعلق قدیم فارسی و اردو کتابوں کے علاوہ گزشتہ بیس سال میں حسب ذیل کتابیں شائع ہیں جو اس موضوع کی نسبت معلومات میں اضافہ کا باعث ثابت ہوں گی۔ ان میں سوائے چند کتابوں کے باقی سب کتابیں ادارۂ ادبیاتِ اردو نے شائع کی ہیں ـــــ

۱۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ	مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب
۲۔ حیات محمد قلی قطب شاہ	مولفہ " " "
۳۔ تاریخ گولکنڈہ	" پروفیسر مجید صدیقی صاحب
۴۔ " " (بزبان انگریزی)	" " " "
۵۔ مقدمۂ تاریخ دکن	" " " "
۶۔ حیات بخشی بیگم (دختر محمد قلی قطب شاہ)	" ڈاکٹر زور صاحب
۷۔ میر محمد مومن (پیشوائے محمد قلی قطب شاہ)	" " " "
۸۔ سیر گولکنڈہ (نیم تاریخی افسانے)	" " " "
۹۔ گولکنڈے کے ہیرے (نیم تاریخی افسانے)	" " " "
۱۰۔ حیدر آباد (بچوں اور طلبہ کے لئے)	" ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ
۱۱۔ فرخندہ بنیاد حیدر آباد	" ڈاکٹر زور صاحب
۱۲۔ داستان ادب حیدر آباد	" " " "
۱۳۔ مرقع دکن (سب رس کا دکن نمبر)	مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو
۱۴۔ نذر دکن	" محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ
۱۵۔ مسلمان شاہی خاندان اور ان کے سلسلے	" مولوی محمد عبد الرحمن خاں صاحب
۱۶۔ محمد قلی کی جیون کہانی (بچوں اور طلبہ کیلئے)	مولفہ وقار خلیل صاحب
۱۷۔ معانی سخن (منتخب کلام محمد قلی قطب شاہ)	مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب
۱۸۔ نذر محمد قلی قطب شاہ	" " "

یہ سب کتابیں سب رس کتاب گھر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد سے مل سکتی ہیں۔

فہرست مضامین

بیانات		صفحہ
۱۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان		۹
۲۔ شری سی۔ راجگوپال چاری سابق گورنر جنرل ہند		۹
۳۔ پنڈت گوبند بلبھ پنت وزیر داخلہ ہند		۱۰
۴۔ مس پدمجا نائیڈو گورنر مغربی بنگال		۱۱
۵۔ ڈاکٹر بی۔ رام کرشنا راؤ گورنر کیرالا		۱۲
۶۔ بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر		۱۲
۷۔ ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر وزارت خارجہ		۱۳
۸۔ شری پٹابھی سیتا رامیا سابق گورنر مدھیہ پردیش		۱۴
۹۔ ڈاکٹر بی۔ سرینواسا چاری ناظم محکمہ آثار قدیمہ۔ آندھرا پردیش		۱۴
۱۰۔ جلوس یوم محمد قلی قطب شاہ کا خیر مقدم	شری بی۔ کشن لال صاحب میر بلدہ حیدرآباد	۱۶
۱۱۔ خطبۂ استقبالیہ	نواب زین یار جنگ بہادر صدر استقبالیہ	۱۹
۱۲۔ افتتاحی تقریر	شری بھیم سین سچر صاحب گورنر آندھرا پردیش	۲۱
۱۳۔ قطب شاہوں کی آبرسانی (تقریر صدارت)	" جے۔ وی۔ نرسنگ راؤ صاحب وزیر آبپاشی و برقی	۲۳
۱۴۔ دور قطب شاہی کی تشکیل شہری	مولوی فیاض الدین صاحب نظامی چیف آرکٹکٹ آندھرا	۲۷
۱۵۔ قطب شاہی دور میں اردو ادب	" نصیر الدین ہاشمی صاحب	۳۳
۱۶۔ محمد قلی قطب شاہ کا ایک غیر مطبوعہ فرمان	" میر سراج الدین علی خاں صاحب (ریکارڈ آفس)	۳۹
۱۷۔ مقبرہ سلطان محمد قلی قطب شاہ	محترمہ تاج سلطانہ صاحبہ ایم اے	۴۴
۱۸۔ محمد قلی اور اس کی شاعری	" زینت ساجدہ صاحبہ ایم۔ اے	۴۷
۱۹۔ استدعائے افتتاح نمائش نوادرات قطب شاہی	مولوی محمد عبدالوہاب صاحب (بی ایس سی) معتمد اسٹیٹ سالار جنگ	۵۲
۲۰۔ تقریر صدارت	ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی وزیر خزانہ آندھرا	۵۵
۲۱۔ محمد قلی قطب شاہ اور علی برید	مولوی سید محمد صاحب بیدری	۵۷
۲۲۔ صدارتی تقریر	پنڈت ایم نرسنگ راؤ صاحب وزیر مواصلات	۶۰
۲۳۔ تقریر عشائیہ یوم محمد قلی	ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی وزیر خزانہ آندھرا	۶۲
۲۴۔ تفصیلات نمائش یوم محمد قلی	مولوی محمد عبدالوہاب صاحب و سراج الدین علیخاں صاحب	۶۵
۲۵۔ بھاگ متی اور بھاگ نگر	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۷۳

فہرست تصاویر

۱۔ جلوس یوم محمدؒ قلی قطب شاہ ہاتھی پر ماہی مراتب۔

۲۔ 〃 〃 〃 〃 قدیم سواریاں۔

۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 عوام کی شرکت۔

۴۔ 〃 〃 〃 〃 سڑکوں پر مجمع۔

۵۔ چارمینار کے پاس میر بلدیہ حیدرآباد کی تقریر۔
سرور ڈنڈا نظم سنا رہے ہیں۔

۶۔ گورنر آندھرا پردیش کا ورود گنبد محمدؒ قلی قطب شاہ پر

۷۔ نواب زین یار جنگ صدر استقبالیہ خیر مقدم کر رہے ہیں۔

۸۔ گنبد محمدؒ قلی قطب شاہ کے چبوترے پر حاضرین کا مجمع۔

۹۔ مزار محمدؒ قلی قطب شاہ پر تلاوت قرآن شریف۔

۱۰۔ گنبدان قطب شاہی کا منظر

۱۱۔ مزار محمدؒ قلی پر گورنر آندھرا پردیش چادر گل چڑھا رہے ہیں۔

۱۲۔ مزار محمد قلی سے بعد فاتحہ گورنر صاحب واپس جارہے ہیں۔

۱۳۔ شری جے۔ وی۔ نرسنگ راؤ وزیر آندھرا پہلے علمی
اجلاس کی صدارت فرمارہے ہیں۔
فیاض الدین نظامی اپنا مقالہ سنارہے ہیں۔

۱۴۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی وزیر فینانس کی صدارت میں
دوسرا علمی اجلاس۔ مولوی محمد عبدالوہاب صاحب
افتتاح نمائش کی استدعا کر رہے ہیں۔

۱۵۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی صدارتی تقریر کر رہے ہیں۔

۱۶۔ ڈاکٹر گوپال ریڈی نمائش نوادرات قطب شاہی
کا افتتاح کر رہے ہیں۔

۱۷۔ نمائش نوادرات قطب شاہی کا معائنہ کر رہے ہیں۔

۱۸۔ 〃 〃 〃 〃 کا ایک منظر۔

۱۹۔ 〃 〃 〃 〃 کا دوسرا منظر۔

۲۰۔ محمدؒ قلی قطب شاہ کا استادہ کردہ پہلا علم۔

۲۱۔ شری ایم نرسنگ راؤ صاحب تیسرے علمی
اجلاس کی صدارت فرمارہے ہیں۔ ڈاکٹر سیا ریڈی
قطب شاہی شفاخانوں پر مقالہ سنا رہے ہیں۔

۲۲۔ یوم محمدؒ قلی کی جلسہ گاہ میں حاضرین۔

۲۳۔ مشاعرہ یوم محمد قلی میں سہ نشین کا ایک رخ۔

۲۴۔ یوم محمدؒ قلی کے ڈنر میں صدر ادارہ نواب
لیاقت جنگ تقریر فرمارہے ہیں۔

۲۵۔ کلچرل پروگرام میں محمد قلی قطب شاہ کی زندگی
کے مرقع۔

۲۶۔ بھاگ متی حیدر محل

تقریب

اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سلطان محمدؒ قلی قطب شاہ حسن اتفاق سے ایک دولتمند سلطنت کا جلیل القدر اور فیاض بادشاہ بھی تھا۔ اس کے خاندان نے دکن میں تقریباً دو سو سال حکومت کی۔ اور علم و فضل اور شعر و سخن کی ایسی سرپرستی کی کہ اس خاندان کی لکھی اور لکھائی ہوئی کتابیں ہندستان کے مختلف کتب خانوں کے علاوہ ایران اور ترکی تک پہنچ گئیں۔ چنانچہ تلاش و تحقیق کرنے والوں کو آئے دن قطب شاہوں کے علمی و ادبی فیضان کے آثار دور دور مل رہے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کا اردو کلام ابھی تک پورا نہیں ملا ہے۔ اس نے پچاس ہزار اردو شعر لکھے تھے۔ اس کے کلام کا ضخیم مجموعہ اب سے بیس سال قبل راقم الحروف نے مرتب کیا تھا جو ۱۹۴۰ء میں مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے شائع ہوا۔ اس وقت سے برابر محسوس ہو رہا تھا کہ محمدؒ قلی کے کلام میں زندگی کی جو صلاحیتیں اور شگفتگی کی جو کیفیتیں ہیں ان کی بنا پر اردو دنیا میں یہ شاعر ہمیشہ ممتاز سمجھا جائے گا۔ اگرچہ قدامت زبان کے باعث عہد حاضر کے عام اردو داں اس سے صحیح معنوں میں لطف اندوز نہیں ہو سکتے تاہم صاحبانِ نظر اور اہل ذوق اس کی طرف ضرور متوجہ ہوں گے اور اس بادشاہ شاعر کی حقیقی قدر و منزلت ضرور کی جائے گی۔

۱۹۵۵ء میں جب ادارہ ادبیات اردو اور ہندی پرچار سبھا حیدرآباد کے مشترکہ مساعی سے ناگری رسم الخط میں دکنی کتابیں شائع کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم ہوئی اور دوسری کتابوں کے ساتھ کلیات محمدؒ قلی بھی ہندی میں منتقل ہونے لگی تو ہندی پرچار سبھا کے اس وقت کے معتمد پنڈت سری رام شرما نے ایک کمیٹی میں خیال ظاہر کیا کہ اس شاعر بادشاہ کی شایان شان یاد منانی چاہیئے اور یہ کام شہر حیدرآباد ہی میں بڑے پیمانے پر ہو سکتا ہے۔ حیدرآبادیوں کا فرض ہے کہ دوسرے بڑے شاعروں کی طرح اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور اپنے شہر کے بانی کو پورے اہتمام کے ساتھ خراجِ عقیدت پیش کریں۔ اس رائے کو سبھوں نے پسند کیا اور صدر کمیٹی نواب مہدی نواز جنگ نے بھی اس میں دلچسپی ظاہر کی۔ لیکن بعد کو شرما صاحب جب ہندی پرچار سبھا کی معتمدی سے علیحدہ ہو گئے تو یہ خیال بھی بھلا دیا گیا۔

نومبر ۱۹۵۶ء میں جب قدیم ریاست حیدرآباد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہندوستان کے نقشہ سے غائب ہو گئی اور شہر حیدرآباد آندھرا پردیش کا پایہ تخت قرار پایا اور آندھرا پردیش کے نقشے چھپ کر سامنے آئے تو سب کو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی ملک ہے جو محمدؒ قلی قطب شاہ کے زیر نگیں تھا اور جس کے لئے اس نے شہر حیدرآباد

بطور پایہ تخت بسایا تھا اور جس ملک کے تلگو شاعروں کی سرپرستی اور عام رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے اس فیاض بادشاہ نے بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے۔

ادارے کے صدر نواب لیاقت جنگ بہادر اور ادارے کی مجلس تاریخ و ثقافت کے معتمد پروفیسر مجید صدیقی نے اس خیال کو بہت پسند کیا اور بعد کو ادارے کے ارکان مجلس انتظامی نے بھی اس کی تائید کی۔ آندھرا پردیش کے وزیر خزانہ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی نے بھی اپنی عام علم دوستی کی بناء پر اس میں دلچسپی لی اور اس کی مجلس استقبالیہ کی نائب صدارت قبول فرمائی۔ پدما بھوشن نواب زین یار جنگ بہادر سے اس کی صدارت قبول کرنے کی استدعا کی گئی۔ نواب صاحب نے ۱۹۴۴ء میں ادارے کی طرف سے ایک کل ہند اردو کانگریس اعلیٰ پیمانے پر منعقد کی تھی اور اب چودہ سال بعد یوم محمدؐ قلی قطب شاہ بھی اسی تزک و احتشام کے ساتھ منایا۔

اس تقریب کا افتتاح کرنے کے لئے ادارے کی طرف سے ایک وفد گورنر آندھرا پردیش شری بھیم سین سچر سے ملا جس میں معتمد عمومی کے علاوہ پروفیسر مجید صدیقی معتمد مجلس تاریخ، شری جانکی پرشاد صاحب، مولوی محمد عبدالوہاب صاحب، ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ اور مولوی خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد شریک تھے۔ گورنر صاحب نے بھی اس خیال کا خیر مقدم کیا اور یوم محمدؐ قلی کے افتتاح کے لئے بہ خوشی رضامندی ظاہر کی۔

ادارۂ ادبیات اردو نے حیدرآباد کی جملہ ادبی تنظیموں کو دعوت دی کہ وہ بھی اس کام میں ادارہ کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو، آندھرا ساہتیہ اکاڈیمی، ہندی پرچار سبھا، دکنی ساہتیہ پرکاشن سمیتی، ہندی پرچار سنگھ، جائنٹ بورڈ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، آندھرا سرسوتہ پریشد اور دیگر مقامی انجمنوں نے ہر طرح سے اس میں تعاون کیا اور جیسے ہی اس کا پہلا اعلان شائع ہوا حیدرآباد کی صحافت نے بھی بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور اس سے متعلقہ خبر نامے نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کئے۔

اس کے انتظامات کے سلسلے میں مجلس استقبالیہ کے متعدد اجلاس ہوئے اور مختلف کام مختلف اصحاب کے سپرد کئے گئے۔ مثلاً ـــــ

۱۔ جلوس ـــــ شری سریواس لاہوٹی (معتمد ہندی پرچار سبھا)۔
۲۔ میلہ بمقام گنبد محمدؐ قلی ـــــ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نائب ناظم آثار قدیمہ۔
۳۔ جلسہ گاہ گنبد ـــــ مسز روڈا مستری صاحبہ صدر حیدرآباد سوشیل سروس کانفرنس۔
۴۔ روشنی بمقام گنبد ـــــ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ صاحب۔
۵۔ نمائش و ڈنر ـــــ مولوی محمد عبدالوہاب صاحب معتمد سالار جنگ اسٹیٹ کمیٹی۔
۶۔ جلسہ گاہ نظام باغ ـــــ مولوی سید مسعود احمد رضوی صاحب نائب مہتمم سالار جنگ میوزیم۔
۷۔ مقالے اور تقاریر ـــــ پروفیسر مجید صدیقی صاحب معتمد تاریخ دکن ادارہ۔
۸۔ مشاعرہ اور کلچرل پروگرام ـــــ پروفیسر خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد
۹۔ دالانیرس ـــــ پروفیسر عالم خوندمیری صاحب و پروفیسر محمد محمود حسین صاحب۔

۱۰۔ بجز اور جھنڈیاں ۔ مولوی مرزا ضامن علی صاحب غازی صفوی

ان سب اصحاب کے علاوہ مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب ، رمن راج سکسینہ صاحب ایڈوکیٹ ، رائے جانکی پرشاد صاحب ، نواب میر یٰسین علی خاں صاحب ، مولوی میر سراج الدین علی خاں صاحب ، مولوی خواجہ حمید احمد صاحب ، سری پورن چند شاکر صاحب ، نواب دوست محمد علاء الدین صاحب ، میر عابد علی خاں صاحب اور مولوی شیخ محمد صاحب (بھارت نیوز) وغیرہ نے بھی ان سہ روزہ تقریبات کے انتظامات میں بڑی مدد فرمائی ۔

اس تقریب میں شرکت کے لئے مدراس سے پروفیسر وینکٹ رمنیا ، بیدر سے مولوی سید محمد بیدری صاحب اور بالاپور سے مولوی ہادی نقشبندی صاحب ادارے کے مہمان کے طور پر حیدرآباد تشریف لائے ۔

یوم محمد قلی قطب شاہ حسب ذیل پروگرام کے مطابق تین دن تک منایا گیا ۔

ہفتہ ۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۵۸ء ۔ چارمینار تا گنبد محمد قلی

۳ بجے ۔ روانگی جلوس از چارمینار جہاں میر بلدیہ حیدرآباد مخاطب کریں گے

۳۰ ۔ ۴ بجے ۔ جلوس گنبد محمد قلی قطب شاہ پہنچے گا

۵ بجے ۔ ہزاکسلنسی گورنر صاحب آندھرا پردیش کا ورود

خطبۂ استقبالیہ ۔ پدما بھوشن نواب زین یار جنگ بہادر ، صدر استقبالیہ ۔

خطبۂ افتتاحیہ ۔ ہزاکسلنسی سری بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش ۔

پیامات ۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی

نظمیں ۔

۳۰ ۔ ۶ بجے ۔ اندرون گنبد ۔

محمد قلی کے مرثیے پڑھے جائیں گے ۔

چادر اندازی ۔

۷ بجے ۔ آتش بازی بمقام میلہ روبروئے گنبد محمد قلی قطب شاہ

۱۵ ۔ ۷ بجے ۔ قوالی ۔

اتوار ۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۵۸ء ۔ نظام باغ ۔ دیوان دیوڑھی

۱۰ تا ۱۲ بجے ۔ مقالے اور تقاریر ۔ بصدارت سری بی ۔ وی ۔ نرسنگ راؤ صاحب وزیر آبرسانی حکومت آندھرا

۱ ۔ خطبۂ صدارت (قطب شاہوں کی آبرسانی)

۲ ۔ محمد قلی قطب شاہ کی ٹاون پلاننگ از مولوی محمد فیاض الدین صاحب چیف ٹاؤن پلانر ۔

۳ ۔ قطب شاہی تاریخ کا ایک ورق (انگریزی) از نواب منصب جنگ بہادر

۴ ۔ گنبد محمد قلی کا فن تعمیر از تاج سلطانہ صاحبہ

۳ تا ۵ بجے ۔ مقالے اور تقاریر ۔ بصدارت ڈاکٹر بی گوپال ریڈی صاحب فینانس منسٹر حکومت آندھرا

۱ ۔ قطب شاہوں کا طرز حکمرانی (انگریزی) از پروفیسر وینکٹ رامنیا (مدراس)

۲ ۔ محمد قلی قطب شاہ کا غیر مطبوعہ فرمان از مولوی میر سراج الدین علی خاں صاحب

۳ ۔ قطب شاہوں کا انتظام عدل گستری از مولوی محمد عبدالحفیظ صدیقی صاحب ۔

۴ ۔ قطب شاہی فن تعمیر از مولوی خواجہ محمد احمد صاحب

۵ ۔ محمد قلی کی اردو شاعری از زینت ساجدہ صاحبہ

۱۵ ۔ ۵ بجے ۔ افتتاح نمائش از نواب مہدی نواز جنگ بہادر وزیر امداد باہمی وغیرہ ۔ (یہ نمائش ۱۹ر جنوری تک جاری رہے گی ۔ وقت ۲ تا ۶)

۳۰ ۔ ۸ بجے ۔ مشاعرہ ۔

پیر - ۱۴ جنوری ۱۹۵۸ء ـــ نظام باغ ، دیوان دیوڑھی
۱۰ تا ۱۲ بجے ـــ مقالے اور تقاریر ـــ بصدارت پنڈت
ایم ۔ نرسنگ راؤ صاحب وزیر مواصلات
۱ - محمدؐ قلی اور علی برید از مولوی سید محمد صاحب
مورخ بیدری
۲ - حفظان صحت اور طبی انتظامات (انگریزی)
از ڈاکٹر سبا ریڈی
۳ - محمدؐ قلی اور حافظ از ڈاکٹر غلام دستگیر رشید
۴ - قطب شاہی اردو مثنویاں از مولوی خواجہ
حمید الدین صاحب شاہد ایم ۔ اے ۔
۵ - تلگو ادب عہد قطب شاہی میں (انگریزی)
از مس ریگانی صاحبہ ایم ۔ اے
۶ - قطب شاہی تصاویر از سری دھرم سنگھ صاحب
۸ بجے ـــ ڈنر
۳۰ - ۹ بجے ـــ رقص ، موسیقی ، ٹیبلو وغیرہ

اس میں حیدرآباد کے عوام اور ارباب فضل و کمال سبھی نے پوری طرح حصہ لیا ۔ تمام جلسوں میں (علمی و ادبی میں بھی) جلسہ گاہ حاضرین سے پوری طرح معمور رہا ۔ اس کا اندازہ ان تصاویر سے بھی ہو سکے گا جو اس رسالہ میں شریک کی جا رہی ہیں ۔ جملہ تقاریب کو رنگین اور سادہ فلموں کے ذریعہ سے بھی محفوظ کر لیا گیا ہے اور یہ فلم خاص خاص تقریبوں میں ادارے میں دکھائے جاتے ہیں ۔

نذر محمدؐ قلی قطب شاہ کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کر کے شائع کی جا رہی ہے جو چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے جن کی تفصیل یہ ہے :-

پہلا حصہ ـــ یوم محمدؐ قلی قطب شاہ میں پیامات ، افتتاحی و صدارتی خطبے ، تقریریں اور مقالے ۔

دوسرا حصہ ـــ شعر و نغمہ ۔ نظمیں اور مشاعرہ کی طرحی غزلیں ۔

تیسرا حصہ ـــ صحافتی مضامین ـــ مقالے ، ادارئیے اور جائزے ۔

چوتھا حصہ ـــ مقالے ـــ تاریخی ، معلوماتی اور تعارفی ۔

یہ کتاب بہت ضخیم اور باتصویر ہے ۔ تقریباً سو تصاویر اس میں شریک ہیں اور یوم محمدؐ قلی قطب شاہ کی تقریبات کے دوران میں اور اس کے بعد اب تک اس کے متعلق اخباروں اور رسالوں میں مضامین شائع ہوتے رہے اور بعض اصحاب نے اپنے مضامین اور مقالے بجائے خود ہی روانہ فرمائے تو خیال آیا کہ اور اصحاب سے بھی خواہش کی جائے ۔ چنانچہ سبھوں نے اس دعوت کو قبول فرمایا اور اس طرح قطب شاہی عہد اور محمدؐ قلی قطب شاہ کے بارے میں کافی مفید اور ضروری معلومات یکجا ہو گئیں جن کو اس مجموعہ میں شائع کیا جا رہا ہے ۔ ہم نے خیال کیا کہ سب رس کے ناظرین یوم محمدؐ قلی قطب شاہ کی تفصیلات اور مناظر و تصاویر سے محروم نہ رہیں اس لئے اس یوم سے متعلق یہ خصوصی نمبر جو صرف یوم محمدؐ قلی کی رسمی تصاویر و تقاریر پر مشتمل ہے پیش ہے ۔ امید کہ اس کو پسند فرمایا جائے گا ۔

اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو ادب اور قطب شاہی دور سے متعلق حوالے کی کتابوں میں ایک اچھا اضافہ ہوگا اور اردو ادب کی تاریخ کے سمجھنے میں مدد ملے گی ۔ امید ہے کہ اس رسالہ سے جو اس کتاب کا صرف ایک مختصر سا حصہ ہے پوری کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوگا ۔

ادارہ

گوہاٹی

۱۷ر جنوری ۱۹۵۸ء

محبی نواب صاحب

مجھے افسوس ہے کہ میں "یوم قلی قطب شاہ" کے بارے میں آپ کے ۲۴ر دسمبر کے مکتوب کا جواب اس سے قبل نہ دے سکا اور پیام روانہ کرنے میں کافی دیر ہوگئی۔ تاہم اس تقریب سے میری بہترین تمنائیں وابستہ ہیں۔ شہر حیدر آباد کے بانی اور ایک بڑے شاعر کی یاد منانا ایک عمدہ خیال ہے۔

آپکا مخلص

جواہر لال نہرو

۶۰۔ بزل اللہ روڈ

تھیاگرا انگر۔ مدراس ۱۷۔

محبی نواب زین یار جنگ!

شہر حیدر آباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد منانے کا خیال نہایت اعلیٰ ہے۔ اس سلسلہ میں شخصی دعوت نامہ، معلومات اور لائحۂ عمل کے ذریعہ سے عزت افزائی کا شکر گزار ہوں۔

صرف آپ جیسے حضرات ہی ایسے "اعلیٰ خیالات" سوچ سکتے ہیں اور ان کو بہتر طریقے پہ عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے پروگرام سے نہ صرف ہر شخص ہی مستفید ہوگا، جو اس سے دلچسپی رکھتا ہے بلکہ تمام ہندوستان متاثر ہوگا۔ یہ امر انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ اس تحریک کو خصوصی تائید و تعاون حاصل ہوا۔

افتتاحی تقریب پر منتظمین جلسہ کی خدمت میں برادرانہ ہدیۂ خلوص۔

آپ کا مخلص

سی۔ راجگوپال چاری

(سابق گورنر جنرل ہندوستان)

نئی دہلی
۱۰ / جنوری ۱۹۵۸ء

مجھے خوشی ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو جو حیدرآباد کا قدیم ادبی اور ثقافتی ادارہ ہے، امسال محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں "یوم قلی قطب شاہ" منا رہا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا حکمران تھا، اس نے ۱۵۸۹ء میں حیدرآباد کی بنیاد رکھی۔ وہ اپنی رعایا کے ثقافتی رجحانات کا ترجمان تھا، اس کی زندگی اور عمل عوامی زندگی سے ہم آہنگ تھے۔ اس نے ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے نہ صرف اردو اور فارسی میں بلکہ تلنگی زبان میں بھی شعر کہے ہیں۔ یہ حقیقت اس کی وسیع النظری پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے ضخیم اردو دیوان میں کثرت سے تلنگی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ایک ایسے موقع پر جب کہ قومی اتحاد اور عوام کی تہذیبی یگانگت کی شدید ضرورت ہے ان خصوصیات کی یاد تازہ کرنا ایک کارِ نیک ہے۔ اس مقصدِ عظیم کو پیشِ نظر رکھ کر اور اس کے لئے انتھک کوشش کا عزم کر کے ہی ہم بہتر طریقے پر اس کی یاد منا سکتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کی اس مبارک تقریب پر میں اپنی بہترین تمناؤں کو پیش کرتا ہوں۔

گوبند بلبھ پنت
(وزیر داخلہ ہندوستان)

راج بھون۔ کلکتہ
۷؍ جنوری ۱۹۵۸ء

یہ امر موجب مسرت ہے کہ ماہ حال دیگر ممتاز ثقافتی انجمنوں کے تعاون سے ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد "یوم قلی قطب شاہ" منارہا ہے جس کا پروگرام ایک ہفتہ پر مشتمل ہے۔

محمد قلی قطب شاہ ایک مسحور کن شخصیت کا مالک تھا جس نے قرون وسطیٰ میں اپنی سیاسی دانشمندی، اعلیٰ ذہنی قوت اور اردو، فارسی اور تلنگی ادب پر عالمانہ عبور کے ذریعہ سے آندھرا کے وسیع خطے پر حکمرانی کی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی تحریروں میں عظمت و انصاف، تہذیب و شائستگی، جذبات اور ادراک کا عدیم النظیر التزام پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر تلنگی الفاظ و محاورات کے استعمال سے اس نے جو مقامی رنگ پیدا کیا، اس پر شہر حیدرآباد کے ہر خاص و عام نے اس سے محبت کی اور اس کو خراج تحسین پیش کیا۔ یہ وہ شہر ہے جس کا وہی بانی تھا۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد سے اب تک حیدرآباد مختلف انقلابات سے گزر چکا ہے۔ حیدرآباد کے موجودہ دور میں محمد قلی قطب شاہ جیسی تاریخی شخصیت کی یاد منانے کیلئے جو موزوں اقدام کیا گیا اور جو قابل تعریف کوشش کی جارہی اس کی کامیابی کے لئے متمنی ہوں۔

پدمجا نائیڈو
(گورنر مغربی بنگال)

ٹری وینڈرم　　　　　　　　　　　　(ٹیلیگرام)

مجھے مسرت ہے کہ ادارۂ ادبیات کی جانب سے اس ماہ کی گیارہ تاریخ کو "یوم قلی قطب شاہ" منا جا رہا ہے۔ حیدرآباد میں اس تقریب کا انعقاد بالکل موزوں و مناسب ہے کیونکہ وہ نہ صرف شہر حیدرآباد کا بانی ہی تھا بلکہ ایک عظیم شاعر بھی۔

اس تقریب کی کامیابی کا متمنی۔

بی۔ رام کرشنا راؤ
(گورنر کرالا)

سری نگر۔ کشمیر

آپ کے مکتوب اور تار کے جواب میں تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ "یوم محمد قلی قطب شاہ" منا رہے ہیں جو عوام کے سماجی اور ثقافتی اتحاد کا سب سے پہلا علمبردار تھا۔ ایسے دور میں جب کہ ہمارا ملک عوام عوام کے مختلف طبقوں کو مربوط و متحد کر کے سماجی فلاح اور معاشی آزادی کے لئے کوشاں ہے قلی قطب شاہ کے کارنامے اور اس کی زندگی ایک بہترین پیام ثابت ہوگا۔ محمد قلی قطب شاہ جیسے حکمرانوں کی قائم کردہ روایات کی حفاظت اور ان کی نشو نما تقاضائے زمانہ کے عین مطابق ہے۔

توقع ہے کہ ان تقریبات کا جوش و خروش سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

بخشی غلام محمد
(وزیر اعلیٰ کشمیر)

۳۰۔ تغلق کریسنٹ
نئی دہلی۔

اگر فرصت ہوتی تو مرحوم قطب شاہ کی تقریبات میں ضرور شریک ہوتا کیونکہ ان کے پس منظر میں ہماری تاریخ کا وہ دور ہے جس میں فرقہ وارانہ یکجہتی اور دکنی تمدن اپنے عروج پر تھا۔ قطب شاہ کی علم دوستی ساتھ ہی ساتھ مختلف زبانوں کے شعراء اور مصنفین کی فیاضانہ و مساویانہ سرپرستی اور ہر زبان سے یکساں لگاؤ اس قابل ہے کہ آج ہم سب اسے تاریخ کے اوراق سے نکال کر اپنی انفرادی، قومی اور ملی زندگی کے نصب العین میں شامل کر لیں۔

حیدرآباد ہمیشہ اس کی پالیسی پر عمل درآمد کرتا رہا۔ آج جب کہ آندھرا جو ایک زمانے میں حیدرآباد ہی کا ایک حصہ تھا پھر حیدرآباد میں شامل ہو چکا ہے تو امید کی جاتی ہے کہ حیدرآباد پھر اپنی گذشتہ عظمت و فراخدلی کو اسی طرح برقرار رکھے گا جیسا کہ بیشتر تھا۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ ابھی حال میں حیدرآباد کے وزیر اعلیٰ مسٹر سنجیوا ریڈی اور وزیر خزانہ مسٹر گوپال ریڈی نے اردو کے متعلق اپنی فراخدلی کا اظہار کر کے قطب شاہ کی پالیسی کو صاد کیا ہے۔ حکومت حیدرآباد نے سب سے پہلے یہ قدم اٹھا کر نہ صرف قطب شاہ کی روح کو خوشی بخشی بلکہ کروڑوں اردو داں پبلک کو جو ہندوستان کے ہر کونے میں موجود ہے ان کے دلوں کو مسخر کیا۔ حیدرآباد کے موجودہ گورنر شری بھیم سین سچر جن سے حیدرآباد پوری طرح واقف ہو گیا ہوگا ایسی ہی پالیسی کے حامل رہے ہیں۔

دعا ہے کہ آپ کی تقریبات کامیاب ہوں۔ والسلام

خاکسار

سید محمود
(سابق وزیر امور خارجہ ہند)

۳-۶-۵۴۷/۶ حمایت نگر
۲۴ جنوری ۱۹۵۸ء

میں نے بڑی مسرت کے ساتھ اس ارمغان کا مطالعہ کیا۔ جو یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۱ جنوری کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ یہ معلوم کرکے اور بھی خوشی ہوئی کہ اس یوم کی مجلس انتظامی اس تقریب کے تمام خطبات اور تقریریں اور مقالے جو اس کے سلسلہ میں ہند کے بڑے لوگوں نے بھیجے ہیں با تصویر مجموعے کی شکل میں شائع کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب بھی معلومات افزا ثابت ہوں گے۔

بی۔ پٹابھی سیتارامیا
(سابق گورنر مدھیہ پردیش)

یہ بڑی مسرت کا مقام ہے کہ بانی شہر حیدر آباد اور اردو کے پہلے صاحب دیوان محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں پہلی بار ریاست میں یوم محمد قلی منایا جارہا ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو نے اس خصوص میں جو رہنمائی کی ہے وہ بہت ہی قابل تعریف ہے اور اس کے منتظمین ہر طرح سے قابل مبارکباد ہیں۔

میں اس یوم کی انتہائی کامیابی کا متوقع ہوں۔

پی۔ سرینواسا چاری
ڈائرکٹر آثار قدیمہ
آندھرا پردیش

خیر مقدم جلوس یوم محمدؐ قلی قطب شاہ

از:- شری بی۔ کشن لال، میر بلدیہ حیدرآباد

(بمقام چارمینار)

بھائیو اور بہنو!

حیدرآباد شہر کے بانی بادشاہ محمدؐ قلی قطب شاہ کی یاد میں آج سے ہمارے شہر میں تین دن تک جلسے شروع ہو رہے ہیں۔ ن کا افتتاح اس جلوس سے ہو رہا ہے جو محمدؐ قلی قطب شاہ کے بنائے ہوئے چارمینار سے نکل کر اس بادشاہ کی گنبد پر پہنچے گا۔

محمدؐ قلی قطب شاہ کو انتقال کیے ہوئے قریب چار سو سال ہو چکے مگر اس فرمانروا کی یاد ابھی تک باقی ہے اور جب تک ہمارا یہ خوبصورت شہر باقی رہے گا محمدؐ قلی قطب شاہ کا نام بھی زندہ رہے گا۔ یہ پیارا شہر جس کی تاریخ ور جس کی روایات پوری دنیا میں مشہور ہیں اسی بادشاہ کا بسایا ہوا ہے۔ یہ چارمینار بھی اسی نے بنوایا تھا۔ اس ادشاہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایکتا کے لئے زبردست کوشش کی۔ اس نے اردو اور تلگو ادب کی سرپرستی کی۔ وہ خود آندھرا کا لباس پہنا کرتا تھا۔ اس کی سلطنت کی سرحدیں تقریباً وہی تھیں جو ہماری نئی ریاست آندھرا پردیش کی ہیں۔ چار سو سال پہلے کا قطب شاہی زمانہ اور آج کا آندھرا پردیش بہت ساری باتوں میں لتا جلتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قطب شاہ نے متحدہ قومیت کے تصور کو آگے بڑھایا تھا۔ محمدؐ قلی قطب شاہ نے ملی جلی تہذیب اور روایات کی جو نیو ڈالی تھی وہ اب بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ اس شہر کے پیچھے اتحاد' یل ملاپ اور بھائی چارگی کی ایک تاریخ ہے۔ یہی کارن ہے کہ آج بھی ہمارے ممتاز نیتا اور ساری نتا حیدرآباد کو پرانی اور نئی تہذیب کا اچھا مرکز سمجھتی ہے۔ اس تہذیب کو پروان چڑھانے میں محمدؐ قلی قطب شاہ نے پہل کی تھی۔ اس بادشاہ نے کل (۳۱) سال حکومت کی اور ١٠٢٠ھ میں انتقال فرمایا۔ قدرتی طور پر پ اس بادشاہ کے تاریخی حالات جاننا چاہیں گے۔ مفصل واقعات تو آپ کو اس سلسلے میں ہونے والے بلسوں میں سنائے جائیں گے لیکن مختصر طور پر میں اتنا سنا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ سلاطین قطب شاہیہ یں سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ پانچواں بادشاہ تھا۔ اس خاندان کے پہلے بادشاہ سلطان قلی قطب شاہ تھے جو سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ہمدان سے براہ خلیج فارس دکن میں وارد ہوئے اور بیدر میں سلطان محمود کے مقربوں میں شامل کرنے گئے۔ سلطان نے ٩٠١ھ میں انہیں قطب الملک کا خطاب دے کر تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ سلطان قلی نے چوبیس سال تک بہ حیثیت صوبہ دار سلطنت بہمنیہ قلعہ گولکنڈہ کو مستقر بنا کر کومت کی۔ سلطان محمود شاہ بہمنی کے انتقال پر ٩٢٤ھ میں جب دوسرے صوبے خود مختار ہو گئے تو

سلطان قلی نے بھی آزادی حاصل کر لی اور قطب شاہ کا لقب اختیار کر کے بادشاہ بنا۔ اس خاندان نے تلنگانہ میں دو سو سال تک حکومت کی اور جب ۱۰۹۸ء میں اورنگ زیب نے قلعہ گولکنڈہ فتح کر لیا تو قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جو اس خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا ۹۹۸ء میں شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی۔ سلطان کی ایک محبوبہ بھاگ متی تھی جسے سلطان نے حیدرمحل کا لقب عطا کر رکھا تھا۔ اسی کی تحریک پر چونکہ یہ شہر آباد کیا گیا اس لئے پہلے اس کا نام بھاگ نگر اور بعد میں حیدرآباد مشہور ہوگیا۔

یہ بادشاہ خود بھی شاعر تھا اور اس کے عہد میں شعر و سخن اور مشترکہ تہذیب و تمدن کو بڑا عروج نصیب ہوا۔ اس نامی گرامی بادشاہ کی یاد میں ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے یادگار جلسہ منایا جا رہا ہے اس کا شروع اس جلوس سے ہو رہا ہے جس کے لئے ہم سب یہاں جمع ہیں۔ میں اس کا افتتاح کرتے ہوئے بس اتنا ہی کہوں گا کہ محمد قلی قطب شاہ نے مشترکہ قومیت کی جو اسپرٹ پیدا کی وہ آنے والے ہزاروں سال تک باقی رہے اور حیدرآباد کا نام ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی بلند رہے۔ میں چارمینار اور حیدرآباد کے تعمیر کرانے والے پیارے بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کو اپنی شردھانجلی بھینٹ کرتے ہوئے اب چارمینار سے اس جلوس کے گولکنڈہ کی طرف گنبد تک جانے کے لئے استدعا کرتا ہوں

جے ہند

بندہ ہوں گنہ گار خدا میرا گنہ بخش

تجہ لطف کیرا فیض خدا منجہ کو سدا بخش

منجہ جیو کے پھل بن کو کر اپ شوق سوں تازہ

اپنے سے
منجہ نین کے درپن کوں تو توفیق لوا بخش

میری
منجہ بخت کے تارے کو سدا رکھ تو جھلکتا

منجہ عیش کے سورج کو مو دن دن تو ضیا بخش

(مناجات) محمد قلی قطب شاہ

خطبۂ استقبالیہ یوم محمد قلی قطب شاہ

از :- پدما بھوشن نواب زین یار جنگ بہادر

(گنبد محمد قلی قطب شاہ (گولکنڈہ) کے چبوترے پر)

فضیلت مآب شری بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش ۔ خواتین و حضرات!

مجلس استقبالیہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی طرف سے میں جناب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج کی اس تاریخی تقریب کا افتتاح کرنے کے لئے جناب والا یہاں تشریف فرما ہوئے ہیں۔

ہندوستان کے بادشاہوں میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت بعض صورتوں میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی وہ اردو، فارسی اور تلنگی کے شاعر تھے۔ اردو زبان میں انھوں نے کم از کم پچاس ہزار شعر لکھے تھے لیکن افسوس ہے کہ ان کا پورا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ اسی طرح تلنگی شاعری کا کوئی نمونہ حیدرآباد کے کتب خانوں میں باوجود تلاش حاصل نہ ہو سکا۔ امید ہے کہ اوپر سوپر آندھرا اور جنوبی ہند میں کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا۔

ان کے اردو کلام کا جو حصہ ملا ہے اس کا ایک بڑا مجموعہ نواب سالار جنگ مرحوم کی سرپرستی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی لگاتار جستجو اور انتھک محنت سے مرتب ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ اردو کے مشہور شاعر ولی اورنگ آبادی پہلے صاحب دیوان نہیں تھے کیونکہ ولی کا دیوان مرتب ہونے سے ایک سو سال پیشتر ہی سلطان قلی کا دیوان ترتیب پا چکا تھا۔ ان کی شاعری عاشقانہ ہی نہیں تھی بلکہ ان کی شاعری میں شاہی لوازم، درباری تکلفات، محلات کی رنگینیاں، باغوں کی سرسبزی و شادابی کے علاوہ غریبوں اور مزدوروں کی زندگی، عوام کے خیالات، عقاید، عیدوں، تہوار، دن، کھیل کود، تماشوں، بازاروں اور عام رسم و رواج کی جھلکیں نظر آتی ہیں۔ سلطان قلی کی زبان قدیم تھی اس لئے اغلب ہے کہ موجودہ دور کے اردو داں حضرات کو اس سے کوئی لطف حاصل نہ ہو لیکن ذرا دلچسپی لی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں چار سو سال پیشتر کے ہندوستان اور خصوصاً آندھرا کے عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سنائی دے رہی ہیں۔

چونکہ سلطان قلی کی شخصیت شاعری کے لحاظ سے پوری اردو دنیا میں مشہور ہے اس لئے ان کی زندگی کے اس پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ ان کے ایک عظیم تر کارنامہ کا ذکر کرنا میرے لئے ازبس ضروری ہے۔ وہ یہ کہ شہر حیدرآباد کی بناء ڈالنے کا کارنامہ۔ اس شہر کی بنا انھوں نے ہی ڈالی ہے۔ اس کے نقشہ اور تعمیر کے لئے ان کے ہی شاعرانہ تخیل، دل و دماغ کی ضرورت تھی۔ انھوں نے ایک ایسی مسطح زمین کا انتخاب کیا جس کے اطراف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور درمیان سے ایک ندی بہتی تھی جس کو موسیٰ ندی کہا جاتا ہے۔ اسی کے جنوب میں شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی گئی اور آخر میں وہ قرون وسطیٰ کا بہترین شہر مانا گیا۔ چنانچہ مشہور مورخ ابوالقاسم فرشتہ نے جو آگرہ، لاہور اور فتح پور سیکری جیسے عظیم الشان شہروں میں رہ چکے تھے حیدرآباد

کی لطافت اور صفائی کا بہت خوبی سے ذکر کیا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ شاہجہان بادشاہ کے کارناموں سے سو سال قبل سلطان قلی نے جو کام کیا ہے اس کے متعلق فرشتہ نے تفصیل انداز میں حیدرآباد کے بازاروں، آب و ہوا وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا ہے ۔

سلطان قلی نے اس شہر میں چودہ ہزار دو منزلہ پختہ دوکانیں تعمیر کروائیں جن کے آگے سائبان تھے اور بازاروں میں دورویہ نہریں نکالی گئیں اور چوراہے ایک ہی وضع کے بنائے گئے ۔ عوام کی آسائش کی خاطر ایسی سرکاری عمارتیں بنائی گئیں جو حماموں، اقامت خانوں، مدرسوں اور خانقاہوں کا کام دیتی تھیں ۔ شاہی محلوں اور باغوں کی تعمیر کا ذکر سوونیر میں کیا گیا ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کے علاوہ سلطان قلی کی تواضع اس سے واضح ہوگی کہ ان کے دسترخوان پر روزانہ ان کے ساتھ ایک ہزار آدمی کھانا کھاتے تھے اور ان میں غریب، امیر، دیسی اور پردیسی سب برابر تھے ۔

سلطان قلی کی انصاف رسانی مشہور تھی ۔ انھوں نے ایک وسیع چوک میں ایک محل بنایا تھا اس کا نام "داد محل" تھا ۔ ہر فریادی کو ہر وقت سلطان کے قریب تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ تھی کیونکہ اس محل کی ساخت ایسی تھی کہ اس میں عام لوگ بھی گذرتے تھے جس کے باعث عہدہ داران محل کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان میں کون فریادی ہے اور کون عوامی اور یہ شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ سے بہت پہلے کا واقعہ ہے ۔

سلطان قلی کے دور میں موت کی سزا نہیں تھی اس پر بھی بہترین امن تھا ۔ جب کبھی دشمن سے لڑائی کا موقع آیا تو انھوں نے صلح جوئی اختیار کی اور ملک اور رعایا کو خون خرابہ سے بچا لیا ۔ انھوں نے رعایا پر سے کئی قسم کے محصول اٹھائے اور صرف محصول اناج کی معافی سے کسانوں کو سالانہ چودہ لاکھ روپیوں کی ادائی سے نجات ملی ۔ اس کے ساتھ رعایا کی معاشی پریشانی دور کرنے کے لئے انھوں نے تعمیر و تخلیق کا ایک ایسا طویل منصوبہ بنایا کہ اس سے بے روزگاری رو نما نہ ہو سکی ۔

سلطان قلی کی سخاوت مشہور و معروف تھی ۔ مستند مورخوں نے جو اعداد پیش کئے ہیں ان کے لحاظ سے یہ ثابت ہوا کہ انھوں نے گیارہ کروڑ روپے غریبوں میں تقسیم کئے ۔

اپنی رعایا میں بلا لحاظ مذہب و فرقہ اتحاد پیدا کرنے کی خاطر اسلامی عیدوں کے ساتھ ہولی، دیوالی، بسنت اور دوسرے تہوار بھی انھوں نے بڑے پیمانہ پر منائے ۔ موسم برسات کے آغاز پر ایک غیر مذہبی تقریب مناتے تھے ۔ اس طرح ان کی سالگرہ کی تقریب ایک قومی عید ہوتی تھی ۔

ان کی وفات (۴۸) سال کی عمر میں ہوئی جب کہ وہ اپنی رعایا کی آسائش اور خوش حالی کے لئے بہت کمر بستہ تھے ۔ اگر حیات وفا کرتی تو ظاہر ہے کہ اور بہت کچھ کرتے ۔

آندھرا پردیش کی تاریخ میں وہ رواداری، مہمان نوازی، اخلاق و مروت اور بین قومی ہم آہنگی کی ایک ایسی فضا چھوڑ گئے جو چار سو سال سے قائم ہے اور اس کے اثرات تمام پر اور خاص کر حیدرآباد کے شہریوں پر کارگر ہیں ۔

اسی اثر کے تحت آندھرا پردیش کے قیام کے ساتھ ہی ادارۂ ادبیات اردو نے یوم قلی منانے کا اہتمام کیا تاکہ آپس میں میل اور اتحاد اور اتفاق کو تقویت حاصل ہو اور اپنی زندگی سابقہ زمانے کے لوگوں کی طرح ہنسی اور خوشی سے گذرے ۔

وقت کی کمی کے باعث سلطان قلی جیسے عظیم الشان بادشاہ، شاعر و مدبر کے شایان شان یوم منانے میں دشواریاں درپیش ہوئی ہیں تاہم ہم کو اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے اور ہم آپ کے مخلصانہ جذبے سے امید کرتے ہیں کہ آپ ہمیں معاف فرما کر ہمت افزائی فرمائیں گے اور ان تمام تقاریب میں شرکت فرمائیں گے جن کا آغاز فضیلت مآب گورنر بہادر اپنے مبارک ہاتھوں سے فرما رہے ہیں ۔ ان تقاریب کا تفصیلی پروگرام آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا ہے ۔ اب میں مجلس استقبالیہ کی جانب سے بصدق دل آپ کا استقبال کرتا ہوں اور آپ کی تشریف آوری کا ممنون ہوں ـــــ آخر میں فضیلت مآب سے استدعا کرتا ہوں کہ یوم سلطان محمد قلی قطب شاہ کا افتتاح فرمائیں ۔

افتتاحی تقریر

از :- شری بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش

(گنبد محمد قلی قطب شاہ (گولکنڈہ) کے چبوترے پر)

بھائیو اور بہنو!

ادارۂ ادبیات اردو قابلِ مبارکباد اور ہمارے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے یہ عظیم تقریب منانے کا انتظام کیا ہے۔ آج ہم ایسے بادشاہ کی یاد منا رہے ہیں جس نے اس شہر کی بنیاد ہی نہیں رکھی بلکہ اس شہر کے ذرہ ذرہ میں اپنی مذہبی رواداری کی زندہ مثالیں چھوڑی ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ اسی اتحاد اور مذہبی رواداری کو باقی و جاری رکھیں۔ میں اس موقع پر پرخلوص طور پر آپ لوگوں سے خواہش کرتا ہوں کہ جس طرح چار سو سال قبل سلطان محمد قلی قطب شاہ نے مذہبی اتفاق و رواداری کی شاندار مثال قائم کی تھی اس طرح آج بھی ہم مذہبی تقاریب عید نوروز ہو، بسنت ہو، ہولی ہو یا دوسرے مذہبی تہوار مشترکہ طور پر منائیں۔ جمہوریت کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب کہ مختلف طبقات ایک جان دو قالب کی طرح متحد ہو جائیں۔

محمد قلی قطب شاہ کو مذہبی حیثیت میں نہ دیکھئے بلکہ ان کو محبت و خلوص کی ان مٹ یادگاروں میں دیکھئے جو آج بھی اس سرزمین سے رواداری اور بین طبقاتی بھائی چارگی کا سبق دے رہی ہیں۔ میں اس انسان کو بادشاہ کے مقابلے میں زیادہ یاد کرتا ہوں جو قلی قطب شاہ کے اندر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کو ہم محدود شکل میں یا صرف بادشاہ کے روپ میں نہیں پیش کر سکتے۔ بلکہ انھیں ایسی شکل میں پیش کرتے ہیں جو تلنگانہ کے ذرہ ذرہ سے بن کر پیدا ہوئی۔ وہ ایک عظیم اور سچے عاشق تھے اور ان کا دل انسان کی محبت سے بھرا ہوا تھا۔ ہندو، مسلم، سکھ سبھی فرقے ان کی نہ صرف یاد منائیں بلکہ ان کی یاد کی قدر کرنا اپنا فرض اور سعادت سمجھیں۔

سلطان قلی قطب شاہ قوم کے سچے معمار رہے ہیں۔ انھیں غریبوں کے دکھ درد کا بڑا خیال تھا۔ جب کبھی عوام مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تو وہ اپنا آرام چھوڑ کر ان کی دست گیری اور مدد کو پہنچتے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی عوام کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ محبت کے علمبردار تھے اور انھوں نے اس سرزمین پر خلوص و محبت کے چراغ جلائے اور دلوں کو روشن کیا جس کی وجہ سے حیدرآباد بذاتِ خود روشنی کا مینار ہے۔ اگر آج کوئی اس روشنی کو نہیں دیکھ پاتا تو اس کی آنکھوں کو خدا نے بینائی سے محروم کر دیا ہے۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کسی نے چار سو سال میں ایسی تقریب منانے کا خیال نہیں کیا۔ یہ درست ہے مگر کچھ ہو چار سو سال بعد ہی سہی مگر آج یہ تقریب منعقد تو ہوئی اور ایک ایسے موقع پر جب کہ آندھرا اور تلنگانہ کے بچھڑے ہوئے بھائی اب ایک دوسرے سے ایک زمانے کے بعد پھر سے مل گئے ہیں۔ ترکی ٹوپی اور پگڑی کا میل ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ

دلوں کی دھڑکنوں کا میل ہوا ہے۔ خدا کرے کہ آندھرا پردیش کے لوگ قطب شاہ کے دور کی شاندار روایات کو جو عنقا اور ختم ہوتی جا رہی ہیں پھر سے تازہ کریں۔

اب جمہوریت کا دور ہے۔ اس میں ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے محمد قلی قطب شاہ کی طرح میل ملاپ سے اپنے فرائض انجام دے۔ جمہوریت اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ حاکم و محکوم ایک جان نہ ہو جائیں۔ نئے ہندوستان کی بنیاد دلوں کے ملاپ پر رکھنی چاہیئے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جو مثال قائم کی تھی وہ سب کے لئے نمونہ ہے

قلی قطب شاہ کی ذات میں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں یکجا نظر آتے ہیں۔ وہ ان سب کا مرقع تھے۔ اکبر کی رواداری، فراخدلی اور رعیت نوازی کی وجہ سے اکبر کا نام لیتے ہوئے ہر ہندوستانی کا سر بلند ہوتا ہے۔ یہ اوصاف قلی قطب شاہ میں بھی ملتے ہیں۔ شاہجہاں کو فن تعمیر سے جو لگاؤ تھا وہ محمد قلی قطب شاہ میں بھی ملتا ہے جس کا ثبوت حیدرآباد ہے جس کی آج بھی تعریف ہو رہی ہے۔ عدل و انصاف اور رل مل کر زندگی گزارنے کا شوق جہانگیر کی طرح ان میں بھی ملتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عوام کی زندگی محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی اور انھوں نے اپنی زندگی کو لوگوں کی زندگی کا حصہ بنا دیا تھا۔ وہ خوبیوں کا مجسمہ اور انسان کی شکل میں ایک فرشتہ تھے۔

میں ڈاکٹر زور کی لکھی ہوئی حیات محمد قلی قطب شاہ پڑھ پڑھ کر حیران ہو جاتا تھا اور سوچتا ہوں کہ اس بادشاہ میں کیسی کیسی متضاد خصوصیتیں جمع تھیں۔ وہ اپنی بارہ پیاریوں کے ساتھ بارہ اماموں کو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ محل اور دربار کی شان و شوکت کے ساتھ اپنے کلام میں غریبوں کی، کھیل کود اور رسم و رواج کی بھی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک ایسے بادشاہ، شاعر اور انسان کی یاد تازہ کر کے ادارۂ ادبیات اردو نے ملک کی بڑی عمدہ خدمت کی ہے۔ اگر میری خدمات کی ضرورت ہو تو وہ ادارۂ ادبیات کے لئے پیش ہیں اور مجھے اس ادارہ سے وابستہ ہونے میں بڑی خوشی ہوگی۔

مناجات میرا تو سن یا سمیع
منجے خوش تو رکھو رات دن یا سمیع

ابادان کر ملک میرا سو توں
بسا تس تو تو دے میرا سن یا سمیع

سکل تخت پر میرا یوں تخت کر
انگوٹھی پہ جوں ہے نگین یا سمیع

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں تو دریا میں مین یا سمیع

(یا سمیع)

محمد قلی قطب شاہ

قطب شاہوں کی آب رسانی

خطبہ صدارت از شری جے۔ وی۔ نرسنگ راؤ صاحب وزیرِ آب رسانی و آبپاشی حکومت آندھرا پردیش

(پہلے علمی و ادبی اجلاس میں بمقام نظام باغ۔ حیدرآباد پڑھا گیا۔)

خواتین و حضرات!

جس بادشاہ کا آج آپ دن منا رہے ہیں وہ ایک ایسے خاندان کا چشم و چراغ تھا جس کی ایک عرصۂ دراز تک سرزمین دکن پر حکمرانی رہی۔ یوں تو شخصی حکومتوں کے دور دورے میں اچھے بادشاہ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، ظالم بھی ہوتے ہیں اور رحم دل بھی۔ لیکن جب کئی صدیوں کے بعد مورخ کسی شاہی خاندان کے دورِ حکومت کا جائزہ لینے لگتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس زمانے میں ملک نے بہ حیثیت مجموعی کتنی ترقی کی تو ان کے سامنے ہمعصر مورخین کی تحریریں، بادشاہوں کے فرامین، سفیروں کی رپورٹیں، سیاحوں کے روزنامچے اور خانگی افراد کے خطوط وغیرہ وغیرہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان تحریری مآخذ کے علاوہ ایک محقق تاریخ بجا طور پر ایسے آثار کو بھی سامنے رکھتا ہے جو تحریری صفحات سے کہیں زیادہ قابل بھروسہ ہوتے ہیں۔ یہ ہیں اس عہد کے تعمیری نمونے، رفاہ عام کی عمارتیں، سڑکیں، تالاب وغیرہ وغیرہ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ امتدادِ زمانہ سے تاریخ کے کاغذی ثبوت تلف ہو جاتے ہیں لیکن اینٹ، پتھر اور چونے کے مضبوط گواہ صدیوں تک اپنے تعمیر کاروں کی نیکیوں اور اعلیٰ ذوق کو سراہا کرتے ہیں۔

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوتی ہے کہ آج اور کل کی علمی بیٹھکوں میں آندھرا پردیش کے مورخ، ادیب، شاعر، انجنیر اور سائنسدان قطب شاہی عہد کی تہذیبی اور تمدنی ترقیوں کا جائزہ لیں گے۔ کئی مقالے اور تحقیقی مضامین پڑھے جائیں گے اور آندھرا پردیش کے اس قدیم تاریخی دور پر ہر عنوان سے روشنی ڈالی جائے گی تاکہ آج ہم یہ جان سکیں کہ جس سرزمین کے ہم باشندے ہیں اس کے بنانے اور سنوارنے میں ہمارے پیشروؤں نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے۔

دکن کی زمین صدہا سال سے کئی تمدنوں اور تہذیبوں کا سنگم رہی ہے اور اس سنگم سے ایسے ترل اور زندہ دھارے نکلے ہیں جنھوں نے نہ صرف اس قطعہ زمین کو بلکہ اطراف و اکناف کو سیراب کیا ہے۔

یوں تو اس دور کے رفاہ عام کے کاموں پر آپ لوگ تفصیل سے روشنی ڈالیں گے لیکن چونکہ مجھے ملک کی آبرسانی اور آب پاشی سے ایک گونہ لگاؤ ہے اس لئے میری نظر انہی امور پر پڑتی ہے۔

یہ ایک خوش قسمتی ہے کہ جب کبھی محقق، دورِ قطب شاہی کے کارہائے آب رسانی کا جائزہ لینے لگتا ہے تو

اس کے سامنے تعمیری آثار کے ساتھ ساتھ کاغذی ثبوت کی بھی کمی نہیں رہتی۔ مثلاً اس دور کی اکثر تحریریں ایسی ہیں جو نہ صرف انہوں نے بطور یادگار رقعوں اور مثنویوں کی شکل میں چھوڑیں بلکہ وہ بھی جنھیں بیرونی سیاحوں اور راجدوتوں نے اپنے سفرناموں اور رپورٹوں میں درج کیں۔ ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر حیدرآباد کو بطور دارالخلافہ منتخب کرتے ہوئے قطب شاہوں نے کس بالغ نظری سے کام لیا تھا۔ یہ شہر جو وادی موسیٰ میں آباد ہے۔ اپنے قدرتی چشموں، تالابوں اور جھیلوں کی وجہ سے کبھی بھی پانی کی قلت کا ایسا شکار نہیں ہوا جس طرح شمالی ہند کی بعض راجدھانیاں ہوئیں۔ مثال کے طور پر تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس بات کی گواہی دیں گے کہ فتح پور سیکری جو ایک بے آب مرتفع پر بنایا گیا۔ عہد اکبری کے تمام شاہی وسائل کے باوجود زیادہ دنوں تک آباد نہ رکھا جاسکا۔ آج بھی اس خوبصورت شہر کے بلند اور دلکش محلوں کے کھنڈر، ویران عمارتیں اور بے آب و گیاہ میدان اپنی سوکھی ہوئی زبان سے شکایت کرتے ہیں کہ شہر کے مقام کے انتخاب میں مغلوں نے کس قدر کوتاہ نظری سے کام لیا تھا۔

یوں تو خود سرزمین دکن ہمیشہ سے اپنے قدرتی آبی وسائل کی وجہ سے مشہور رہی اور اس کی زرخیزی بیرونی حملہ آوروں کے لئے ہر زمانہ میں کشش کا باعث رہی لیکن قطب شاہوں کی آبپاشی کے انتظامات نے اسے اور بھی سرسبز کردیا۔ چنانچہ نجیب اشرف ندوی جنھوں نے رقعات عالمگیری کو مرتب کیا ہے لکھتے ہیں کہ جب اورنگ زیب نے شاہجہاں سے دکن پر حملہ کی اجازت چاہی تو اور وجوہات کے علاوہ بادشاہ کو یہ بھی لکھا کہ۔ "اس زمین پر اس قدر تالاب، اتنی نہریں اور دریائیں ہیں اور یہ ملک اس قدر زرخیز ہے کہ اس کے حصول سے مملکت دہلی کے حدود میں غیر معمولی اضافہ ہوگا"

اسی مصنف کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب اورنگ زیب پہلے پہل بہ حیثیت گورنر حیدرآباد آیا تو یہاں کی زمردیں سرزمین سے اثر پذیر ہوکر بے ساختہ کہہ اٹھا کہ

"یک قطعہ زمین بے مزرع نیست"

"No Tract of land is left uncultivated."

قدرتی وسائل کے ساتھ اسے قطب شاہوں کی آب رسانی کا اعجاز کہئے کہ جو بیرونی سیاح یا مورخ حیدرآباد آیا وہ یہاں کی سیرابی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ عہد عالمگیری کا مورخ خافی خاں (منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۳۶۸) لکھتا ہے ——

"It is not possible for me to do justice to the fountains and reservoirs, the loveliness of the weather, the beauty of darkish complexion and human form and figure of that fertile area."

اورنگ زیب کا ہم رکاب محمد ساقی شہر حیدرآباد کے بارے میں لکھتا ہے۔ (ماثر عالمگیری ص۳۲۱)

"On account of cool air, running water and

fertility of the soil, the whole area is emerald green studded with flowers that attract the eye like diamonds."

ملک کو سیراب کرنے اور شہروں کی آب رسانی کے لئے ان بادشاہوں نے قدرتی وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ موزوں مقامات پر لاتعداد تالاب بنوائے گئے جن میں اہم ابراہیم پٹن، میدک، بدھویل اور جل پلی کے تالاب ہیں۔ اس کے علاوہ ندیوں کو کئی مقامات پر روک کر ان سے نہریں نکالی گئیں۔ چنانچہ شہر کے قریب موسیٰ ندی کے ساتھ ساتھ کئی مقامات ایسے ہیں جہاں ان قطب شاہی بندوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔

قلعہ گولکنڈہ کی آبرسانی کا انتظام مقام کی بلندی کا اعتبار کرتے اس قدر آسان نہ تھا لیکن اسے جس خوبی سے سلجھایا گیا وہ اس عہد کے محدود ٹکنیکل وسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے قابل تعریف ہے۔ مثلاً قلعہ اور اطراف کی بستیوں کے لئے پانی راسئے دورگ کے تالاب سے لایا جاتا تھا۔ قلعہ کے ایک بلند مقام پر جو اس تالاب کی سطح کے برابر تھا ایک بڑا حوض بنوایا گیا تھا۔ اس حوض سے نہریں نیچی سطحوں پر بنے ہوئے حوضوں کو جاتی تھیں۔ صدر حوض سے پانی کی تقسیم بڑے بڑے ڈولوں کے ذریعہ ہوتی تھی جنھیں ہاتھی کھینچتے تھے۔

قلعہ گولکنڈہ کے کھنڈرات میں فصیلوں اور محلات کی اونچی اونچی دیواروں کے ساتھ ساتھ ہم کو مٹی کے نلوں کے باقیات نظر آتے ہیں جنھیں نہایت ہنرمندی سے نصب کیا گیا تھا۔ یہ پانی کے نل تھے جن سے تمام شہر اور محلات میں جگہ جگہ پانی پہنچایا جاتا تھا۔ اس انتظام کی خوبی یہ ہے کہ فصیلوں اور دیواروں سے جو حفاظت شہر کے لئے بنائی جاتی تھیں آب رسانی کا کام بھی لیا جاتا۔ اہل روما جو اپنے فن آبرسانی کے لئے مشہور ہیں دور دور سے آبادی میں پانی پہنچانے کے لئے علحدہ *aqueducts* تعمیر کرتے تھے لیکن قطب شاہ فصیلوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کرکے بدنما *aqueducts* کی تعمیر سے بے نیاز ہو گئے۔

مٹی کے یہ نل فصیلوں اور دیواروں کے ساتھ ساتھ پوشیدہ دوڑائے جاتے تھے اور ان پر مزید احتیاط کے لئے نمائشی کنگرے اور دوسرے آرائشی نمونے بنا دیئے جاتے تھے تاکہ دشمن کو ان کی موجودگی کا پتہ نہ چل سکے۔ ظاہر ہے کہ چونکہ اکثر عمارتیں، محلات اور مکان فصیلوں سے نیچے ہوتے تھے اس لئے ان سے پانی کی سربراہی آسان ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ پانی کے جمع رکھنے کے لئے معززین، معتبر افراد اور امرا کے مکانوں کی چھتوں پر حوض بھی ہوتے تھے جنھیں خزانۂ آب کہتے تھے۔ محلہ کے جن معتبر افراد کے مکانوں کی چھتوں پر یہ خزانۂ آب ہوتے انھیں اکثر اعزاز کے طور پر خزانچی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ اس لقب سے نہ صرف خزانہ دار بلکہ محافظ خزانۂ آب بھی مراد لی جاتی تھی۔

شہر حیدرآباد کے لئے پانی کی سربراہی تالاب جل پلی سے ہوتی تھی جس کی سطح لگ بھگ (۴۸۰) فیٹ بلند ہے۔ یہاں سے نہروں اور نلوں کے ذریعہ پانی چارمینار کی چھت پر جو تقریباً (۱۸۰) فیٹ اونچا ہے لایا جاتا تھا۔ چارمینار کی چھت پر ایک حوض میں پانی جمع کیا جاتا تھا اور یہاں سے اطراف واکناف محلوں میں اس کی تقسیم ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ چارمینار سے چاروں سمتوں میں پانی کی نہریں بہتی تھیں جن سے لوگ پانی حاصل کرتے تھے۔

اس انتظام کے علاوہ مختلف محلوں میں موزوں مقامات پر بڑے اور کشادہ سنگ بستہ کنویں تعمیر کئے گئے تھے

جن میں سے اکثر مرورِ زمانہ کے باوجود آج بھی زندہ ہیں اور جن سے آج بھی عوام مستفید ہوتے ہیں۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ اس مختصر وقت میں قطب شاہی فن آب رسانی پر سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ حقیقتاً یہ عنوان ایک مورخ کے لئے زندگی بھر کی تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے۔ میں نے اجمالاً چند خطوط کی جانب اس لئے اشارہ کر دیا ہے کہ آندھرا پردیش کی نئی نسل ان تاریخی خزانوں سے روشناس ہو۔ اب آپ لوگوں کا یہ کام ہے کہ ملک کے نوجوانوں کو تحقیق و تجسس کی ان نئی راہوں سے اور بھی واقف کرائیں۔

میں آخر میں منتظمین یوم قلی قطب شاہ اور ادارہ ادبیات اردو اور میرے دوست نواب زین یار جنگ بہادر اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ اور ڈاکٹر سکینہ کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اس علمی جلسہ کی صدارت کا مجھے موقع عطا فرمایا۔ میں ان علمی اجلاسوں کی کامیابی کی دل سے تمنا کرتا ہوں۔

گرجاے میگھ سرتے تازہ ہوا ہے بُستاں
پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار داستاں
اے خوش خبر صبا تو لے جا جواں تداں کن
چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں رے پرستاں
بے ہوش میرے دل کو میٹھے ادھر جلاتے
گلزار ہے عجب وہ ڈھو لعل شکرستاں
محمد عشق کے گدا کو اورنگ شاہی دیتا
سب عاشقاں محمد آنگے ہیں طفل جیوں دبستاں

(برسات کی آمد) محمد قلی قطب شاہ

دورِ قطب شاہی کی تشکیلِ شہری

از: مولوی محمد فیاض الدین صاحب نظامی (بہزاد دکن) چیف ٹاؤن پلانر
ڈائرکٹر ٹاؤن پلاننگ۔ آندھرا پردیش

(پہلے علمی اجلاس منعقدہ نظام باغ میں پڑھا گیا)

بڑی مسرت کی بات ہے کہ ہم آندھرا پردیش کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ ایک نیک مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں تاکہ آندھرا پردیش کے بانی اور محسن سلطان محمد قلی قطب شاہ کو خراج عقیدت پیش کریں جس نے چار سو سال قبل اپنے اکتیس سالہ دورِ حکومت میں تلنگانہ کی سرزمین کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ یہ بڑی مبارک بات ہے اس لئے کہ جو قوم اپنے بزرگوں کے سرمایہ اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا جانتی ہے وہ زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے نکل جاتی ہے۔ قطب شاہی حکومت کے کارنامے تو تاریک سے تاریک ماحول میں ایسے بلند میناروں کا کام دے سکتے ہیں جن کی روشنی میں منزلِ مقصود کی رہبری ہو جائے۔

قطب شاہی دور کے لاتعداد زریں کارناموں میں تشکیلِ شہری اور تعمیرات کو ایک خاص اونچا مقام حاصل ہے۔ بدل نہ ہو اس سلطنت کی تعمیر اور تاسیس ایسے افراد کے ہاتھوں سے ہوئی تھی جو بڑے تمدن کے حامل تھے اور بڑی خاندانی روایتوں کے ساتھ تلنگانہ کی سرزمین میں رونق افروز ہوئے تھے۔ جب سلطنت قائم ہوئی تو اس کے لئے وہ اسلوب اور ڈھنگ اختیار کیا گیا جو اس جغرافیائی اور حدودی خصوصیات کے لئے موزوں اور مناسب تھا۔ پہلے تو قطب شاہوں نے اپنے کو اس سرزمین میں ایسا پیوست کیا کہ دو پشتوں کے بعد وہ بالکل دکنی ہو گئے۔ نہ صرف تلنگی رعایا کا تمدن لیا بلکہ ساتھ ہی ان کے روایات کو بھی اختیار کر لیا۔ ملک کی رہنمائی کے لئے ہر قسم کے اہلِ کمال مامور کئے۔ نامی مہندسوں، حسن کاروں اور کاریگروں کی ہمت افزائی کی۔ ملک میں بہترین تمدنی ذخائر جمع کئے۔ بہرصورت شہروں کی تعمیر کر کے اہلِ تلنگانہ کی تمام ذہنی اور اخلاقی قوتیں ایک جگہ جمع کر دیں۔ لاتعداد مساجد، خانقاہیں، کارواں سرائیں، شفاخانے، پلوں اور تالابوں کے ایسے نمونے کھڑے کر دیئے کہ آندھرا پردیش اس پر جتنا ناز کرے جائز ہے۔ تعجب نہیں کہ عالمگیر جیسے بلند مرتبت شہنشاہ نے بھی جب اس سرزمین میں قدم رکھا تو حیرت سے دریافت فرمایا "ایں بلند بلند عمارت؟" جس کے جواب میں ان کے ندیمِ خاص نے برجستہ فرمایا "بلند ہمت بودند عمارتہائے بلند ساختند"۔ اس میں شک نہیں کہ اس مبارک شہر کی داغ بیل بڑے آب و تاب کے ساتھ عالیشان پیمانے پر ڈالی گئی جو مختلف زمانوں کا شکار ہونے کے باوجود اب بھی باقی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ باقی رہے گی۔

قطب شاہی دور کے بعد آصفجاہی بادشاہوں نے بھی شہر حیدرآباد کو نہ صرف اپنی سلطنت کا دارالخلافہ بنایا

بلکہ اس کی تعمیر اور آرائش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ خصوصاً سنہ ۱۹۰۸ء کی طغیانی کے بعد جس اعلیٰ پیمانے پر اس شہر کی تعمیر کی گئی وہ دور عثمانیہ کا زریں کارنامہ ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی، ہائیکورٹ، دواخانہ عثمانیہ، دواخانہ یونانی، سٹی کالج، جوبلی ہال، ٹاؤن ہال، آصفیہ لائبریری، نظام ساگر، عثمان ساگر اور حمایت ساگر کے علاوہ مانع گرد راستوں کی تعمیر اور ڈرینیج اسی دور کے شہکار ہیں جن کو تاریخ ہرگز فراموش نہیں کرسکتی۔

ہمیں خوشی ہے کہ حیدرآباد آج بھی نئے آندھرا پردیش کا دارالحکومت ہے۔ کیوں نہ ہو اس سرزمین کا چپہ چپہ بڑا حسین اور بارونق ہے۔ اس کے قدرتی دلفریب مناظر، آب و ہوا اور وسعت کے اعتبار سے یہ بڑی سے بڑی حکومت کی راجدھانی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی لئے حال ہی میں حکومت نے مثل اپنے پیش رو حکومتوں کے اس شہر کی تشکیل اور توسیع کا بیڑا اٹھایا ہے اور شہر کے منظم پھیلاؤ اور آرائش کے لئے ایک صدر خاکہ کی منظوری دی ہے جو عنقریب روبہ عمل لایا جائے گا۔ ایسے خصوصی موقع پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے جدید منصوبوں کو تیار کرنے سے قبل گزشتہ کارناموں کا جائزہ لیں اور غور کریں کہ ہمارے بزرگوں نے اس شہر کی بناوٹ اور آرائش میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا اور کس اولوالعزمی اور حوصلہ مندی سے اس کی تعمیر کی ہے تاکہ ہم اس کی روشنی میں ہمارے شہر کا ایسا خاکہ تیار کریں جو نہ صرف موجودہ زمانے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرے۔ بلکہ اس کی شان و شوکت اور خوبصورتی میں اضافہ کا باعث ہو۔ ہمیں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے جس سے اس کی عظمت میں فرق آئے۔ ہمیں دوسرا چارمینار تو بنانا نہیں ہے مگر کم از کم اس کو اچھی حالت میں رکھنا اور اس کے ماحول کو جاذب نظر بنانا ہمارا اولین فرض ہے۔ ایسے موقع پر مجھے اہل یونان کی حلف یاد آتی ہے جو انھوں نے شہر ایتھنز City of Athens کے متعلق اٹھائی تھی۔

"ہم شہریان ایتھنز اپنے بزرگوں کے عطا کئے ہوئے شہر کو ہرگز نہیں بگاڑیں گے بلکہ اس کو بہتر سے بہتر بنائیں گے تاکہ ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو معلوم ہو کہ ہم اپنے بڑوں کے اچھے جانشین تھے"۔ بس اس طرح ہمیں بھی عہد کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے شہر کو عمدہ سے عمدہ بنائیں گے۔ یہ مسرت کی بات ہے کہ صدر خاکہ کے تحت چارمینار اور مکہ مسجد کے اطراف و اکناف راستوں کی کشادگی اور آرائش کا ایک مکمل اسکیم تیار کیا گیا ہے جو بہر قیمت روبہ عمل لایا جائے گا۔ اسی طرح شہر کی گندہ بستیوں کی صفائی اور ناقابل رہائش مکانوں کو منہدم کرنے اور کم استطاعت والے خاندانوں کیلئے مکانوں کی تعمیر کے لئے حکومت ہند نے کثیر رقومات منظور کی ہیں جو آئندہ دو سال کے اندر پایۂ تکمیل کو پہنچائی جائیں گی۔

اب میں قطب شاہی دور کی ٹاؤن پلاننگ پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ گولکنڈہ کا قدیم شہر مثل دوسرے پندرھویں اور سولھویں صدی کے شہروں کے قلعہ کی چار دیواری میں آباد کیا گیا تھا تاکہ دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قلعہ نہایت مستحکم تھا اور اس کی تعمیر اس انداز سے کی گئی تھی کہ مغلیہ سلاطین کے زبردست حملے بھی اس کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ بادشاہ کی رہائش گاہ، امراء کی حویلیاں، فوجوں کی سکونت اور عوام کے محلے اور ضروریات سب کچھ اس میں موجود تھے تاکہ مدافعت کے وقت سب ایک ساتھ بآسانی مقابلہ کرسکیں لیکن جوں جوں آبادی بڑھتی گئی شہر نہایت گنجان ہوتا گیا حتیٰ کہ عوام کے لئے رہائشی امکنہ کی قلت اور حکومتی کاروبار میں دشواریاں ہونے لگیں۔ احمد نگر کی تباہی کے بعد پناہ گزینوں کی یورش نے تو شہر کو اور بھی ناقابل رہائش

بنا دیا تھا۔ تنگ و تاریک راستہ حمل و نقل کے لئے بے حد دشوار ثابت ہونے لگے۔ عوام کی صحت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔
ان حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بادشاہ اور ان کے مدبر وزیر اعظم حضرت میر مومن نے اس نازک صورت حال کو فوراً محسوس کیا اور ایک نئے شہر کی تعمیر کا فیصلہ کیا جو بروقت تھا۔ اس غرض کے لئے دس میل کے اندر اندر ایک مسطح اور پر فضا مقام کا انتخاب کیا گیا جو تقریباً (۵۰) پچاس مربع میل کے لگ بھگ تھا۔ واضح ہو کہ قلعہ سے متصل شمال کی طرف کا وہ حصہ جو موضع شیخ پیٹھ اور نجارہ ہل پر مشتمل ہے۔ اس لئے منتخب نہیں کیا گیا کہ یہ زیادہ تر کوہستانی تھا جو پانی کی دشواری کے علاوہ راستوں، مکانوں اور باغوں کی تعمیر کے لئے بھی غیر موزوں تھا۔ اسی لئے مسطح مقام کا انتخاب لازمی اور دانشمندانہ تھا۔ یہ رقبہ تکونی شکل کا تھا جس کی جنوبی انتہا فلک نما کی پہاڑی تھی اور اس کا ایک اہم پہلو موسیٰ ندی کا کنارہ تھا جو تقریباً بارہ میل کی لمبائی پر مشتمل تھا۔ اس زمین کے انتخاب کرنے میں حضرت میر مومن کا بڑا دخل تھا فنی نقطہ نظر سے اس کا محل وقوع، خوش منظری اور رسل و رسائل کے اعتبار سے بھی لاجواب تھا اور مکانوں اور باغوں کی تعمیر کے لئے بھی موزوں تھا۔ ظاہر ہے کہ میر صاحب ایک باغ نما شہر کی تشکیل کرنا چاہتے تھے جو ان کے دل میں تھی۔ کیوں نہ ہو یہ بزرگ شاہ عباس کے زمانے میں شہر اصفہان کی تعمیر اور آرائش کا دور دیکھ چکے تھے۔ ان کی نظریں بہت وسیع اور دور اندیش تھیں چنانچہ اس زبردست پروگرام کے لئے انھوں نے نہ صرف بادشاہ کو ہموار کر لیا بلکہ انجینئروں، معماروں اور کاریگروں کی ایک کثیر تعداد کو فراہم کیا جن میں سے اکثر و بیشتر ایران سے مدعو کئے گئے تھے جن میں میر ابو طالب، استاد کمال الدین شیرازی اور شہریار جہاں جو ایران کے مشہور و معروف ماہران فن تعمیر تھے بڑی بڑی عمارتوں کے خاکے مرتب کرنے کے لئے مامور کئے گئے۔ چنانچہ چارمینار اور دولت خانہ عالی کی عمارتوں کے سہرا میر ابو طالب کے سر ہے جن کو بادشاہ نے بعد میں ناظر الملک کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور شہریار جہاں خداداد محل، کوہ طور محل اور داد محل کے میر عمارات مقرر ہوئے۔

میر صاحب کے ذہن میں ایرانی شہروں کے خاکے موجود تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ اس نئے دار السلطنت کو بھی عالیشان شہر بنائیں جس کا اظہار انھوں نے اپنی اکثر و بیشتر نظموں میں کیا ہے جو بادشاہ کے سامنے گذرانی گئیں۔ چنانچہ ذیل کی نظم میں آپ نے محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین سے فرمایا ؎

یادگار جد و عم سلطان محمد قطب شاہ — آنکہ ہندوستاں ز فیضش گشتہ ایران نوی
وہ چہ ایران آنچناں ایراں کہ آید در نظر — رو بہر جائے کہ آری باغ رضوان نوی
سرمہ شد خاک تلنگانہ ز فرخ پائے تو — اے فدائے خاک پاکت ہر زماں جان نوی
گر صفاہان نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ — حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان نوی

یعنی اے بادشاہ تیری وجہ سے ہندوستان ایران نظر آنے لگا اور ایران بھی کیسا ایران جس میں ہر طرف نئے باغ رضوان کی شان جھلکتی ہو اور تلنگانہ کی خاک میں تیرے مبارک قدموں کی وجہ سے سرمہ کی سی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اگر شاہجہاں عباس شاہ کی وجہ سے صفاہان بالکل نیا شہر بن گیا تو اے بادشاہ تیری وجہ سے حیدرآباد صفاہان نو نظر آنے لگا۔ یہ سب باتیں اس لئے کہی گئیں کہ محمد قطب شاہ کے دل میں خیال پیدا ہو اور وہ بھی اپنے شہر کو ایرانی طرز کا بنا دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نہ صرف شہر کی تشکیل ایرانی انداز پر ڈالی گئی بلکہ اکثر و بیشتر عمارتوں اور باغوں کی تعمیر میں

ایرانی وضع اختیار کی گئی اور ساتھ ہی مقامی طرز تعمیر اور موسمی حالات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مورخین کے مطابق نبی باغ اور باغ محمد شاہی وغیرہ کی عمارتوں کے بیان میں صاف طور پر لکھا ہے کہ بادشاہ نے یہ سب عمارتیں اور باغ ایرانی طرز پر بنائے اور اس طرح میر صاحب کی دلی آرزو پوری ہوئی۔ تشکیل شہری کے اصولوں کے مطابق شہر کے خاکے میں ندی کے پر فضا کناروں اور قدرتی مناظر سے پورا پورا استفادہ کیا گیا۔ شہر کی تعمیر شروع کرنے سے قبل گولکنڈہ کی آبادی سے ملانے کے لئے پل تعمیر کیا گیا جو پرانے پل کے نام سے موسوم ہے۔ سب سے پہلے شہر کے بیچوں بیچ چارمینار کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور شطرنج نما خاکے کی وضع پر اس کے چاروں طرف وسیع راستے بنائے گئے جن کی چوڑائی تقریباً (۶۰) گز تھی۔ راستوں کی دونوں جانب نہریں نکالی گئیں۔ چارمینار کے اطراف وسیع رقبہ مربع کی شکل میں رکھا گیا تھا جن کے اطراف خوبصورت دکانیں تھیں۔ چورا ہے کی مرکزی عمارت کے اعتبار سے چارمینار نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

مجھے یاد ہے جس وقت پروفیسر بیاٹلی (Professor Batley) آنجہانی نے جو ایک مشہور و معروف آرکیٹکٹ تھے جب پہلی مرتبہ چارمینار کو دیکھا تو بے ساختہ فرمایا ــــ

"Deccan proudly wears Charminar as the best gem upon her Zone."

چارمینار کے فن تعمیر میں یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ اس عمارت کی عالیشان جسامت اور بلندی کے ساتھ ساتھ اونچی کمانوں اور بلند میناروں کا تناسب اس انداز سے قائم کیا گیا ہے کہ عمارت سبک دکھائی دے۔

شہر کی تشکیل میں چارمینار کے چاروں رخ چار بازار ترتیب دئیے گئے تھے جن میں چودہ ہزار خوبصورت دو منزلہ دکانیں تھیں جن میں اوپر کی منزل، رہائشی کمروں اور گوداموں کے لئے اور نیچے کی منزل دوکانوں کیلئے استعمال کی جاتی تھیں۔

عوام کے لئے رہائشی املہ کے بارہ منطقے مختص کئے گئے تھے جو تقریباً دس مربع میل پر مشتمل تھے۔ ہر منطقہ میں ہزار ہزار مکانوں کی گنجائش تھی۔ ان محلوں میں مدارس، شفاخانے، مساجد، مسافرخانے اور باغیچے بنائے گئے تھے تاکہ ہر محلہ عوام کی ضروریات کے لئے خود مکتفی ہو۔ ان محلوں کے قرب وجوار میں میوے اور ترکاری کی منڈیاں قائم کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ چارمینار اور دولت خانہ عالی کی تعمیر کے زمانے میں قلی قطب شاہ کی ایماء پر میر صاحب نے مزدوروں، معماروں اور کاریگروں اور مختلف قسم کے فنکاروں کی رہائش کے لئے مختلف مقاموں پر چار محلے آباد کئے تھے جن میں تقریباً دس ہزار آرام دہ مکانات تعمیر کئے گئے تھے۔ شاہی عمارتوں کے مکمل ہو جانے کے بعد یہ محلے شاہی فرمان سے مستقل طور پر قائم کر دیئے گئے۔

ندی کے کنارے اور مرکزی راستوں کے رخ پر بڑے بڑے باغیچوں کے اندر محلات شاہی، دفاتر، امراء کی حویلیاں اور سفارت خانے تعمیر کئے گئے جن کے متعلق خود بادشاہ نے بڑی خوبصورتی سے فرمایا ہے ؎

سنوارے جگت سب جنت جوں جڑت سوں بنا — نگارے سو بازار قصراں محلاں

چارمینار کے جانب شمال مغرب دولت خانہ عالی تعمیر کیا گیا جس کے جلو خانہ میں چاروں طرف چار بلند کمانیں

جو آج بھی شہر کی ناک ہیں قائم کی گئیں اور وسط جلو خانہ میں ایک زبردست ہشت پہلو حوض تعمیر کیا گیا جو اب مختصر ہو کر سوکھا حوض رہ گیا ہے۔ دراصل دولت خانہ عالی کی داغ بیل ڈالتے وقت اس جگہ پنج مارک قائم کیا گیا تھا۔ تعجب نہیں کہ اسی وجہ سے اس کو چار سو کے حوض سے موسوم کیا گیا۔ جنوب کی طرف دفتر خانہ شاہی اور مغرب کی طرف جاندار خانہ اور کارخانہ ہائے عامرہ بنائے گئے۔ دوسری طرف چندن محل، گگن محل اور سجن محل بنائے گئے جن میں دکنی، ترکی اور عربی سلحدار رہتے تھے اور بڑے بڑے ہال جن میں علماء اور شعرا اور ادیبوں کے اجتماع اور علمی مظاہرے ہوتے تھے۔ بادشاہ کا اصلی محل اور قیام گاہ خدا داد محل تھا جس میں شاہی کتب خانہ، آرٹ گیلری اور مہمان خانے بھی تھے۔ اس کی ہر منزل از خود ایک عالیشان محل تھی جن کے علحدہ نام تھے۔ پہلی منزل موسوی محل، دوسری منزل جعفری محل، تیسری اور چوتھی منزل حسنی اور حسینی محل، پانچویں منزل حیدر محل، چھٹی منزل محمدی محل اور ساتویں منزل الہی محل سے موسوم تھیں۔ اس کے علاوہ داد محل، ندی محل، کوہ طور محل، اعلیٰ محل، قطب مندر اور حنان محل کی عالیشان عمارتیں جو عموماً سہ منزلہ اور چار منزلہ تھیں اپنی آپ نظیر تھیں۔ ان محلوں کے اندر بڑے بڑے کھلے صحن اور خانہ باغ تھے جو ہمیشہ آب رواں کے ساتھ نہروں، آبشاروں، فواروں، حوضوں، چمن بندیوں اور رنگ برنگ کے پھولوں کے تختوں سے آراستہ تھے۔ شہر کی تشکیل میں ہر محل اور اس کے گرد و نواح کو اس سلیقہ سے ترتیب دیا گیا تھا کہ ہر منطقہ اپنی جگہ ایک عالیشان شہر کا جز و بنا ہوا تھا جیسے کہ سانچے موتیوں کے ہار کا ایک آبدار موتی۔

یہ خوبصورت اور عالیشان محل تقریباً سات مربع میل کے رقبہ پر باغوں کے اندر پھیلے ہوئے تھے اور ان سب عمارتوں میں بڑے بڑے حوضوں اور فواروں کے ذریعہ اونچی اونچی منزلوں پر پانی سربراہ کیا گیا تھا اور پورے رقبہ میں زمین دوز نالیوں کا جال بچھایا گیا تھا۔ ان سب کی تفصیل ڈاکٹر زور نے اپنی مختلف کتابوں میں نہایت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے جس کو اس قلیل عرصہ میں بیان کرنا دشوار ہے۔

ان محلوں کے علاوہ مفاد عامہ کی عمارتوں میں متعدد حمام، مساجد، عاشور خانے، لنگر خانے، مدرسے، مہمان خانے، کارواں سرائیں اور دواخانے بھی بنائے تھے جن کے آثار اب بھی باقی ہیں اور اس شکستہ حالت میں بھی محمد قلی کے اعلیٰ ذوق تعمیر اور شان و شوکت کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ نزاکتوں سے زیادہ شکوہ اور بڑائی کا دلدادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد اور گولکنڈہ کی عمارتیں جسامت، مضبوطی اور بلندی کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس مضبوطی کے ساتھ خوبصورتی اور لطافت کا بھی خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ گچ اور چونے میں میناروں، برجوں، جالیوں، بارہ دریوں اور شہ نشینوں کے وہ کمال تبلائے کہ ان کے سامنے سنگ مرمر اور سنگ سرخ کے کام بھی ماند پڑ گئے۔

ابو القاسم فرشتہ جس نے اکبر اعظم کے بنائے ہوئے لاہور، آگرہ اور فتح پور سیکری جیسے عظیم الشان شہروں میں بود و باش کی تھی حیدرآباد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس شان و شوکت کا شہر ہندوستان میں کہیں نہیں تھا۔ شہروں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ قطب شاہی دور میں دیہاتوں کی آبادی کو فراموش نہیں کیا گیا۔ میر مومن صاحب چاہتے تھے کہ ملک کے اندرونی حصوں میں بھی ثقافتی اور تعمیری ترقی ہو اور دیہات کے باشندے ان سے مستفید ہوں۔

چنانچہ شہر کے اطراف و اکناف میں جہاں چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں ان میں تالاب، سرائیں دیگر عمارتیں

اور متعدد ثمرہ دار درختوں کے باغ اور ترکاریوں کے کھیت لگوائے۔ جن کی بدولت شہر میں میوے اور ترکاری کی افراط رہتی تھی۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ شہر میں اور اس کے اطراف تقریبا پندرہ سو بڑے بڑے باغ تھے جن کو تالابوں اور کنوؤں سے بافراط پانی دیا جاتا تھا۔ ان باغوں میں عوام کے لئے خاص خاص اوقات پر مینا بازار لگتے تھے۔ بہرصورت بادشاہ اور اس کے وزیر اعظم کی نیک نیتی اور تمناؤں کے بموجب ایک قلیل عرصہ میں ہر اعتبار سے یہ سولھویں صدی کا بہترین باغ نما شہر بن چکا تھا جس میں امیر و غریب دونوں چین اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان تمناؤں کا اظہار بادشاہ نے اپنے مناجات میں کیا ہے ؎

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھا جوں توں دریا میں من یا سمیع

آدھار دے آدھار اب تجھ بن نہیں کوئی یا علی
منجہ کوں سنبھالن ہار اب تجھ بن نہیں کوئی یا علی

سب جگ گدا سلطان توں تو انبراں کا بھان توں
میرا سو لشتی وان توں تجھ بن نہیں کوئی یا علی

بندہ قطب شاہ داس ہیں بخشش منگوں تجھ پاس میں
پکڑیا ہوں تیری آس میں تجھ بن نہیں کوئی یا علی

(یا علی) محمد قلی قطب شاہ

محمد قلی قطب شاہ کا غیر مطبوعہ فرمان

از:- میر سراج الدین علیخاں صاحب۔ بی۔ اے (عثمانیہ) سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد دکن

(دوسرے علمی اجلاس میں یہ مقالہ پڑھا گیا)

محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ شہر حیدرآباد کے بانی، اردو کے بلند پایہ شاعر، دکنی تمدن کے معمار اور فنون لطیفہ کے سرپرست کی حیثیت سے اس کا قطب شاہی سلاطین میں ممتاز مقام ہے۔ اس نے ادب ثقافت اور تاریخ میں جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں ان کی بدولت اس کو شہرت دوام حاصل ہے۔

میں یہاں اس عظیم المرتبت بادشاہ کے جس فرمان پر مقالہ سنا رہا ہوں اس کا اصل متن یہ ہے:-

"فرمانِ جہاں مطاع واجب الاتباع از دیوانِ ہمایوں خلافت مشحون بجانب کارکنان و دیسایانِ پرگنہ پٹلچور رحجاں شرف اصدار یافت کہ قوم و فرزندانِ عبدالکریم مرحوم در بندگی مقربانِ درگاہ معلوم نمودند کہ در موضع کاچہ یڈپلی اعمال پرگنہ مذکور یکچاور زمین بدل انعام بر وجہ مددِ معاش می رود انست۔ و در آنجا مرحومی چا ہیہا از رعایا و بعضی مردم زر دادہ خرید کردہ است۔ و تمسک و خطِ باسکہ شریعت پناہ قاضی جمال الدین دارد۔ و درین وقت موضع مذکور بہ کارگیرانِ مقاصا روان شدہ کارگیرانِ مذکور بہ زمین انعام و چاہہا خریدی لایعنی مزاحم می شوند۔ تاکید باید فرمود۔ بنا بر علیہ بخاطر اشرف اعلیٰ آوردہ امر عالی شدہ کہ ایشان کارگیران را تاکید نمایند و نگذارند کہ بزمین انعام و چاہہا و آنچہ زمین خریدی او باشد بہیچ وجہ مانع و معارض شوند۔ دریں باب تاکید بلیغ دانند۔ برحکم فرمان عالی روند۔"

فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ عبدالکریم مرحوم کے فرزندوں نے محمد قلی قطب شاہ کی خدمت میں اس مضمون کا شکایتی معروضہ پیش کیا کہ موضع کاچہ یڈپلی پرگنہ پٹلچور میں ان کے والد کی ایک چاور انعامی زمین اور زر خرید باولیاں موجود ہیں۔ باولیوں کی خریدی سے متعلق ان کے پاس دستاویز ہے جس پر شریعت پناہ قاضی جمال الدین کی مہر ثبت ہے۔ اب یہ موضع کارکنانِ مقاصا کے حوالہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اس انعامی زمین اور زر خرید باولیوں پر مزاحمت کر رہے ہیں ان واقعات کے اظہار کے ساتھ استدعا کی گئی کہ کارگیرانِ مقاصا کی اس بے جا مداخلت کا انسداد فرمایا جائے۔

اس معروضہ کی بناء پر پرگنہ پٹلچور اور دیسایوں کے نام حکم عالی صادر ہوا کہ وہ کارگیرانِ مقاصا کو سخت تاکید کریں کہ عبدالکریم مرحوم کی انعامی زمین اور باولیوں پر بے جا مزاحمت سے باز آئیں

اور احکام کی تعمیل کریں۔

زیر بحث فرمان سنٹرل ریکارڈز آفس میں محفوظ ہے۔ فرمان کے کاغذ کی تقطیع ۲۳×۶" ×ا۱۴" ہے۔ فرمان میں تیرہ سطریں اور ہر سطر میں اوسطاً گیارہ الفاظ ہیں۔ بین السطور تقریباً ایک انچ کا فاصلہ ہے۔ ناصیہ کے تقریباً درمیانی حصہ میں مہر ثبت ہے جو عبارت سے مل گئی ہے۔ مہر سے ڈیڑھ انچ کے فاصلے پر ناصیہ کے بائیں جانب "یا علی مدد" کے الفاظ سنہری روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ کاغذ کا تقریباً ایک تہائی حصہ چھوڑ کر عبارت کا آغاز ہوا ہے۔ فرمان کے اختتام پر کاغذ کے سیدھے جانب کے گوشہ میں "پروانگی امین خاں" اور عبارت کے ختم پر "تاریخ ۲ شہر ربیع الثانی سنہ ۱۰۰۱ھ" کے الفاظ درج ہیں۔ عبارت معمولی نستعلیق خط میں لکھی گئی ہے۔

فرمان میں بعض فنی اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔ فرمان میں لفظ "دیسایاں" آیا ہے۔ دیسایاں دیسائی کی جمع ہے۔ دیسائی کو دیسکھ بھی کہتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں دیسائی یا دیسکھ پرگنہ کا حاکم یا اعلیٰ عہدہ دار مال ہوتا تھا جس کی خدمت موروثی ہوتی تھی۔ اس کو خدمت کے معاوضے میں زمینات وغیرہ بطور انعام دی جاتی تھیں۔ کئی پرگنوں پر ایک سردیسائی یا سردیسکھ مقرر ہوتا تھا۔

پرگنہ پٹلچور، موضع کاچریڈ پلی :-

پرگنہ کو آن کل تعلقہ کہتے ہیں۔ جس طرح تعلقہ کئی مواضعات پر مشتمل ہوتا ہے اسی طرح زمانہ قدیم میں کئی گاؤں کا مجموعہ پرگنہ کہلاتا تھا

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ پٹلچور موجودہ پٹن چیرو کی اس عہد کی شکل ہے۔ جو شہر حیدرآباد سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ پٹلچور سے پٹاچرو اور پٹلچرو سے پٹن چیرو بنا۔ کاچریڈپلی اسی پرگنہ پٹن چیرو میں واقع ہے۔ چنانچہ سنٹرل ریکارڈز آفس حیدرآباد کے قدیم "دیہہ جھاڑہ صوبہ فرخندہ بنیاد" میں سرکار محمدنگر کے تحت پرگنہ پٹاچرو اور اس کے تحت موضع کاچی ریڈی پلی تبلایا گیا ہے جس کا محاصل اس زمانے میں سالانہ دوہزار چار سو ایک روپیہ تھا۔

"بدل انعام" بمعنی بطور انعام، "تمسک و خط" بمعنی دستاویز، "سکّہ" بمعنی مہر اور "اعمال" علاقہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "یکچادر زمین" سے مراد (۱۲۰) بیگھے زمین ہے۔ "چادر" زمین کا ایک پیمانہ ہے جو زمانۂ قدیم میں استعمال ہوتا تھا۔ "ایک چادر" میں (۱۲۰) بیگھے ہوتے تھے۔

"کارگیران مقاصا" سے مراد مکاسہ داران ہے۔ مقاصا مکاسہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ زمانہ قدیم میں پورا موضع یا زمین کا کچھ حصہ کسی شخص کو بطور انعام معمولی لگان پر یا بمعافی لگان عطا ہوتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک موضع کے رقبہ کا نصف، دو ثلث، ربع یا سہ ربع

حصہ کسی شخص کو بطور جاگیر دیا جاتا تھا اور باقی رقبۂ زمین دوسرے شخص کو بطور انعام بمعاوضۂ خدمت یا بلا معاوضۂ خدمت سرفراز ہوتا تھا۔ اس رقبۂ زمین کے محاصل کے وصول کرنے کا حق بالکلیہ مکاسہ دار کو ہوتا تھا۔ اس محاصل کا ایک حصہ حکومت کو ادا کیا جاتا تھا جو لگان یا ایک قسم کا ٹیکس تھا۔ حکومت بعض اوقات یہ لگان یا ٹیکس معاف بھی کردیتی تھی۔ بعض اوقات موضع کے جاگیردار ہی کو یہ حق دے دیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو جوڑ داں جاگیر بھی کہتے تھے۔

"پروانگی امین خاں" سے مراد بحکم امین خاں ہے۔ اس زمانے میں قاعدہ یہ تھا کہ فرمان کی اجرائی کے بعد فرمان کی تکمیل متعلقہ اعلیٰ عہدہ دار کے توسط سے ہوتی تھی جس کا حوالہ فرمان کے حاشیہ پر دیا جاتا تھا۔

فرمان میں "امین خاں" اور "عبدالکریم" کا ذکر آیا ہے جن پر تبصرہ بے محل نہیں۔ بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ "عبدالقادر امین خاں" کے والد کا نام شیخ ہمایوں یا ہمایوں میاں تھا جو پٹن چیرو کے حاکم تھے۔ "عبدالقادر امین خاں" ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں بلند پایہ عہدہ دار اور "دبیر" جیسی اہم خدمت پر معمور تھے۔ ابراہیم قطب شاہ کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ یہ تلنگی ادب کے سرپرست تھے۔ اس عہد کے تلنگی زبان کے ایک مشہور شاعر نے ایک طویل نظم لکھ کر "امین خاں" کے نام سے منسوب کی تھی۔ اس نظم میں شاعر نے امین خاں کے سلسلۂ نسب پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ امین خاں کے بارے میں یہ بیان کرتا ہے کہ انھوں نے قصبہ امین پور بسایا، ایک تالاب کی تعمیر کروائی اور پٹن چیرو میں ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ وہ رفاہ عام اور سماجی و اصلاحی کاموں میں کافی حصہ لیتے تھے۔ ان کو باغبانی کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ان کے باغ کی سرسبزی و شادابی کے بارے میں شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "امین خاں کے باغ میں داخل ہونے کے بعد بوڑھوں میں جوانی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں اور شیرخوار بچے جوان ہوجاتے ہیں۔"

"عبدالقادر امین خاں کے پانچ فرزند تبلائے گئے ہیں جن کے نام یہ ہیں :۔

عطاظاخاں (جن کو کہیں حفاظ خاں کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے)، عبدالعلی، فاضل خاں (جن کا نام فضل اللہ خاں بھی تبلایا گیا ہے)، شیخ ابراہیم اور عبدالکریم۔

عطاظاخاں (یا حفاظ خاں) کے بارے میں تبلایا گیا ہے کہ وہ عربی، فارسی، گجراتی اور تلنگی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ ابراہیم قطب شاہ کے پاس ان کی بڑی وقعت تھی۔ ان کی علمی قابلیت اور دیگر اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت انھیں شہنشاہِ اکبر سے قرب حاصل ہوگیا تھا۔

عبدالعلی ایک بلند پایہ خطاط ہونے کی حیثیت سے دربار گولکنڈہ کے شاہی خوشنویس کے عہدہ پر فائز تھے۔

فاضل خاں (یا فضل اللہ خاں) نے وجیانگر اور گولکنڈہ میں اتحاد کرانے اور ملک کے امن و امان کے قیام میں بڑی مدد دی تھی۔

شیخ ابراہیم کے بارے میں صرف یہ معلوم ہو سکا کہ وہ فوجی ملازمت میں تھے۔

عبدالکریم کے بارے میں شاعر کہتا ہے کہ وہ ذی وجاہت اور ظریف الطبع شخص تھے۔ وہ بعض اوقات تمام اہل دربار کو ہنسا ہنسا کر لٹا دیتے تھے ان کی فیاضی اور دریا دلی کی داستانیں زبان زد خاص و عام تھیں۔ ان کو دربار سے انعام میں زرین پگڑیاں، جواہردار کلاہیں، گھوڑے اور پالکیاں سرفراز ہوئیں۔

پٹن چیرو میں ایک گنبد پر عہد ابراہیم قطب شاہ کا ایک کتبہ ۹۸۴ھ کا موجود ہے جس کی عبارت سے بھی ان امور کی توثیق ہوتی ہے۔

یہاں بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ "پردانگی امین خاں" سے "عبدالقادر امین خاں" مراد ہیں یا ان کے کوئی اور فرزند ہیں جن کو "امین خاں" کا خطاب ملا ہو۔ اس لئے کہ عبداللہ قطب شاہ کے فرمان مورخہ ۲۹ جمادی الثانی ۱۰۳۸ھ میں (جو سنٹرل ریکارڈز آفس میں محفوظ ہے) "عبدالکریم امین خان" کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک قیاس تو یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں فرامین میں عبدالکریم سے مراد ایک ہی شخص ہے اور "پردانگی امین خاں" سے مراد "عبدالقادر امین خاں" نہیں بلکہ "عبدالقادر امین خاں" کے کوئی اور فرزند ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ ہر دو کے فرامین میں "فرزندان عبدالکریم" یکجا در زمین موضع کاچی ریڈی پلی اور پرگنہ پٹن چیرو مشترک ہے۔ اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ دونوں فرامین میں جن عبدالکریم کا ذکر آیا ہے وہ ایک ہی شخص ہے۔ اول الذکر فرمان میں خطاب کا حوالہ نہیں ہے اور آخر الذکر فرمان میں عبدالکریم کے نام کے ساتھ خطاب کا حوالہ موجود ہے۔ ممکن ہے کہ اول الذکر فرمان میں خطاب "امین خاں" کی وضاحت ترک ہو گئی ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ "عبدالقادر امین خاں" کے انتقال کے بعد ان کے پانچ فرزندوں میں عبدالکریم کو "امین خاں" کا خطاب ملا ہو، "عبدالکریم امین خاں" کے انتقال کے بعد ان کے کوئی بھائی اس خطاب سے سرفراز ہوئے ہوں اور انھیں کی "پردانگی" کا حوالہ محمد قلی قطب شاہ کے فرمان میں دیا گیا ہو۔ کیوں کہ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ دونوں فرامین میں جن عبدالکریم کا ذکر ہے وہ ایک ہی شخص ہے اور ان کا خطاب "امین خاں" ہے تو ایسی صورت میں ان کے والد "عبدالقادر المخاطب بہ امین خاں" کی زندگی میں ان کو والد کا خطاب کیونکر مل سکتا ہے۔

اگر "پردانگی امین خاں" سے "پردانگی عبدالقادر امین خاں" مراد لی جائے تو عبدالکریم نامی دو الگ شخصوں کو علحدہ کرنا پڑے گا۔ یعنی محمد قلی قطب شاہ کے فرمان میں جن عبدالکریم کا ذکر آیا ہے ان کو کوئی دوسرا شخص سمجھنا ہوگا اور عبداللہ قطب شاہ کے فرمان میں جن عبدالکریم کا ذکر ہے وہ "عبدالقادر امین خاں" کے فرزند متصور ہوں گے۔

فرمان میں شریعت پناہ قاضی جمال الدین کا ذکر آیا ہے جن کے بارے میں کسی قسم کی معلومات فراہم نہ ہو سکیں

زیر بحث فرمان کئی وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں قاضی رجسٹرار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ زمینات کی خرید و فروخت کی دستاویز پر قاضی کی مہر ثبت ہونے کے بعد وہ مسلمہ تصور کی جاتی تھی۔ زمانۂ قدیم میں "مہرانہ" کے نام سے قاضی کے پاس ایک معینہ رقم بھی داخل کرنی پڑتی تھی جو آجکل فیس رجسٹری کہلاتی ہے۔ یہ قدیم طریقہ محکمۂ رجسٹریشن کے قیام تک جاری رہا۔

فرمان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں مکاسہ داری نظام قائم تھا۔ اگر کوئی موضع مکاسہ کے طور پر دے دیا جاتا تھا تو اس موضع کی انعامی زمینات مکاسہ دار کے عمل و دخل سے مستثنیٰ ہوتی تھیں۔ مکاسہ دار انعام داروں سے نہ کچھ حاصل کرسکتا تھا اور نہ ان پر کسی قسم کی دست درازی کرسکتا تھا۔

بہرحال زیر نظر فرمان محمد قلی قطب شاہ کے عہد کی ایک بیش بہا دستاویز ہے جس سے اس کی سلطنت کے انتظامی امور پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے بخوبی یہ واضح ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کو اپنی رعایا کے حقوق کی حفاظت کا انتہادرجہ خیال تھا۔ اس کا دربار ہر ایک کے لئے اور ہر چھوٹے اور بڑے معاملہ کے تصفیہ کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ معمولی ناانصافی و بدنظمی کو بھی کسی طرح برداشت نہیں کرتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ ایک قابل، بیدار مغز اور منصف مزاج فرماں روا تھا جس کے عہد کو اگر عہد زریں کے نام سے یاد کیا جائے تو نا داجبی نہیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بدولت اس کا نام اور اس کے کارنامے دکن کی تاریخ میں زندہ جاوید ہیں ـــــ

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

توہی جگ کا سامیا یا حفیظ	توہی جگ کو سرجا ئیا یا حفیظ
جو کوئی ہیں درماندے ان کو سدا	توہی کرنے ہارا دِیا یا حفیظ
ترے دوست کی بات کی گرد سے	دے منجہ نین کو توتیا یا حفیظ

(یا حفیظ) محمد قلی قطب شاہ

مقبرہ سلطان محمد قلی قطب شاہ

از :- محترمہ تاج سلطانہ صاحبہ (ایم - اے)

(پہلے علمی اجلاس میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔)

سلطان محمد قلی قطب شاہ جس کے مزار کی عمارت پر میں فن تعمیر کے نقطہ نظر سے روشنی ڈالنا چاہتی ہوں سلاطین قطب شاہیہ میں ایک ایسا اولوالعزم فرمانروا گذرا ہے جس نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لے کر اہل دکن کے ماضی کو اس قدر شاندار اور روشن بنا گیا کہ مورخین اور سیاحوں نے اپنی تحریروں میں اس کے اعلیٰ کارناموں کو اس کے ہم عصر بادشاہوں کے کارناموں کے ساتھ مقابلہ کیا، اور اس کی بعض کارگزاریوں کو برتر قرار دیا۔ جس طرح شمالی ہند میں شاہ جہاں اپنی مملکت کو سنوارنے اور مزین کرنے میں مشہور و معروف ہے اسی طرح دکن میں محمد قلی قطب شاہ اپنے ملک و قوم کو ہر جہتی ترقی دینے میں نام آور اور سرآمد روزگار ہے۔ قدرت نے سطح مرتفع دکن کو جغرافیائی ارتقا بخش کر سربلند کیا اور سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس سطح مرتفع پر بسنے والی قوم کی ذہنی سطح کو تمدنی ارتقا بخش کر یہاں کے مٹی پتھر کو Fine Art میں نمودار کر کے قدرت ہی کا ایک اعلیٰ منشاء پورا کیا۔ ہمارے موجودہ دارالحکومت کا بانی یہی بادشاہ ہے جس نے اس شہر کو اشجار و انہار اور بازار سے مرصع کیا اور اپنے اعلیٰ ذوق کو ان مادی اشکال میں اس خوبی سے ظاہر کیا کہ آج جب اس جلسہ کے بانیوں نے اپنے ماضی کی یاد کو تازہ کر کے اس سے محظوظ و مسرور ہونا چاہا تو محمد قلی قطب شاہ ہی کی یاد ان میں تازہ ہوئی۔

قطب شاہی طرز تعمیر دکنی طرز تعمیر کا تیسرا اور آخری ترقی یافتہ مرحلہ ہے۔ اس کی نمائش و نمود ارکی شاہان قطب شاہیہ کی عام عمارتوں میں محسوس کی جا سکتی ہے مگر بدقسمتی سے گولکنڈہ نے جو مصائب مغلیہ بادشاہوں کے ہاتھوں برداشت کئے ان کے نتیجہ میں یہاں کے بہت سے تعمیری نمونے ضائع و برباد ہو گئے۔ اب ہمارے لئے جو عمارتیں رہ گئیں انہی میں ہم اس طرز کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔ قطب شاہی گنبدوں میں اسی طرز تعمیر کو ملحوظ رکھا ہے جو بیدر کے بہمنی گنبدوں میں پایا جاتا ہے۔ البتہ قطب شاہی مقبروں میں تعمیری زیب و زینت خصوصاً گلکاری کی اقسام اور تعمیر کی نزاکتوں کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ بعض ماہرین نے قطب شاہی طرز تعمیر پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے دو اعتراضات کئے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان اعتراضات کو معرض بحث میں لاؤں۔ لیکن جہاں تک مجھے اس فن کا علم ہوا ہے اس کے لحاظ سے مجھے ان اعتراضات پر کچھ شک و شبہ ضرور ہے۔

مثلاً ایک اعتراض تو یہ ہے کہ بہمنی طرز تعمیر میں جو خاموش سنجیدگی اور حسرت آمیز سکوت اس فن میں ظاہر کیا گیا ہے وہ قطب شاہی گنبدوں میں نہیں ہے۔ برخلاف اس کے یہاں کی گلکاری، منبت کاری اور شوخ رنگ سازی نے وہاں کے حقیقی کیفیت کو بے اثر کر دیا ہے جو مناسب نہیں تھا۔ میرے خیال میں قطب شاہوں نے اپنے گنبدوں کو اداسی اور دنیا سے بیزاری کا مرقع بنانا ضروری نہیں سمجھا۔ فن کے کمال کو اگر اس پر قیود عاید کر کے ابھرنے نہ دیا جاتا تو آج "تاج محل" جیسی حسین عمارت شہر خموشاں کے اجڑے ہوئے گوشہ سے بڑھ کر نہ ہوتی۔ دوسرا اعتراض نقادوں کا یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے گنبد کے برآمدے میں جو نازک ستون بنائے گئے ہیں وہ اس عظیم الجثہ گنبد کے مقابلہ میں بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ اعتراض بھی چنداں اہم نہیں ہے۔ اس لئے کہ شاید نقشہ کھینچنے والوں نے ان نازک ستونوں کو ارادتاً اس مقام پر اس لئے رکھا کہ اگر یہ نہ ہوں تو واقعی گنبد کا وہ پہلو جس پر دیکھنے والوں کی پہلی نظر پڑتی "ایک ہیبت ناک منظر پیش کرتا۔ گنبد کی بلندی اور اس کا عرض و طول اس قدر بڑا ہوا ہے جس نے فن کار کو مجبور کیا کہ وہ منظر کے اس دباؤ کو اپنی نازک فن کاری سے ہلکا کر دے۔

محمد قلی قطب شاہ کا مقبرہ ایک چوکور دوہرے چبوترے پر بنا ہے جس کا ہر ضلع (۲۰۰) فیٹ طویل ہے اور سطح زمین سے اس کی بلندی (۱۳) فیٹ (۶) انچ ہے۔ چبوترے میں ہر جانب (۲۸) کمانیں بنی ہوئی ہیں چبوترے کے شمالی اور مغربی جانب اوپر چڑھنے کے واسطے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔

پہلے چبوترے کے وسط میں دوسرا چبوترہ (۳) فیٹ (۸) انچ بلند ہے جس کا ہر ضلع (۱۲۶) فیٹ (۳) انچ طویل ہے۔ دوسرے چبوترے کے وسط میں خاص روضہ کی مربع عمارت ہے۔ اس عمارت کی بیرونی جانب کی تعمیر کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ طرح انداز نے پہلے ہی اپنے ذہن میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اصلی ڈھانچہ کو مکمل کرنے کے بعد یونہی چھوڑ دیا جائے تو سادہ اور عریاں رہ جائے گا اس لئے اس کے چاروں طرف چار برآمدے بنا دیئے گئے اور چاروں کونوں پر عمارت کے متناسب ستون قائم کر کے برآمدے کی چھت کے گوشوں کو ان پر ٹکا دیا۔ ہر برآمدے کی پیشانی اور پہلوؤں کو بند کر کے درمیانی حصہ کھلا رکھا ہے۔ اس کھلے حصہ میں ستون قائم کر کے ان پر کمان ڈالنے کے بجائے ہندو طرز پر شہتیر رکھ دیا ہے اس طرح سے ہندو مسلم طرز کا امتزاج پیدا کر دیا گیا ہے۔ اصل عمارت کی دیواروں پر بیرونی جانب بند کمانوں کا ڈیزاین ہے۔ ان کمانوں پر نہایت ہی نفیس و نازک نقش و نگار کیا گیا ہے۔ مقبرہ کے اندر داخل ہونے کے لئے مشرقی اور جنوبی جانب دو چھوٹے دروازے رکھے گئے ہیں۔ یہ دروازے pillar and lintle اسٹائل کے ہیں۔ دروازے کے دونوں جانب اور اوپر نہایت ہی خوش نما نقش و نگار کیا گیا ہے۔ مقبرہ کی اصل عمارت ایک مربع کمرے پر مشتمل ہے۔ اس کمرہ کی ہر دیوار کی اندرونی سطح پر تین بند کمانیں ہیں۔ ہر کمان کا عرض سات فیٹ ہے۔ گنبد کی تعمیر کی خاطر کمرہ کی چار دیواری کو بلندی کے قریب ہشت پہلو میں تبدیل کرنے کے لئے کمانیں بنائی گئی ہیں۔ اس طرح سے کمرہ جو نیچے چوگوشہ تھا اوپر جا کر ہشت پہلو ہو گیا۔ ہر پہلو کے پیشانی کے تسلسل میں نقش و نگار کر دیا گیا۔ اس

کے اوپر کنگرے بنا دیئے گئے ہیں۔ اس کے اوپر squenches ہیں جو گنبد کے زیریں دائرے کو سہارے ہوئے ہیں۔

کمرے کے وسط میں محمد قلی قطب شاہ کی قبر کا تعویذ ہے جس کا طول (۱۰) فیٹ (۱۲) انچ اور عرض (۵) فیٹ (۹) انچ ہے۔ یہ تعویذ سنگ سیاہ کا بنا ہوا ہے۔ اس پر کلمہ شریف، آیۃ الکرسی اور درود شریف کے علاوہ حسب ذیل عبارت کندہ ہے:۔

"اعلیٰ حضرت جنت مکانی عرش آشیانی محمد قلی قطب شاہ بن ابراہیم قطب شاہ انار اللہ برہانہما۔ بتاریخ روز شنبہ ہفت دہم ماہ ذی القعدہ الحرام عشرین والف ہجری بہ رحمت حق واصل شد۔ سن شریف چہل و نہ سال و مدت سلطنتش سی و یک سال رحمۃ اللہ تعالےٰ رحمتاً کاملۃً۔"

محمد قلی قطب شاہ کی اصلی قبر نیچے تہہ خانے میں ہے۔

مقبرے کے چاروں گوشوں پر دالانڈے کی چھت کو تھامنے کے لئے چار ستون قائم کئے گئے ہیں دالانڈے کی چھت کے کنارے پر چھجا ہے جس کو براکٹ کے ذریعہ سہارا دیا گیا ہے۔ یہ چھجہ نہایت ہی نفیس منبت کاری سے آراستہ ہے اور نقش و نگار کے فنی کمال کو ظاہر کرتا ہے۔ برآمدے کی چھت کے چاروں گوشوں پر اوپر کی طرف چار خوش نما چھوٹے مینار ہیں۔ ہر دو میناروں کے بیچ میں ایک دیوار ہے جس کا نچلا طول کمانوں سے بنایا گیا ہے۔ ان کمانوں کے اوپر عمدہ گل بوٹوں سے مزین ایک پٹی چلی گئی ہے۔ اس پٹی کے اوپر کنگرے ہیں۔

اصل عمارت کی چھت ایک بڑے اور شاندار گنبد پر مشتمل ہے جو ایک مدور دیوار پر رکھا ہوا ہے۔ اس دیوار میں ہوا اور روشنی کی آمد کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر جالی دار کھڑکیاں ہیں کچھ اوپر جاکر ایک گول منقش کنگن بنادیا گیا ہے۔ اس کنگن میں اوپر کی طرف گنبد کے نچلے دور کو گھیرے ہوئے کنول کی پتیاں بنادی گئی ہیں۔ اس گنبد کی ساخت کردی ہے جو اطراف سے ابھر کر بتدریج کلس کے مقام پر مل گیا ہے جہاں پر ایک طویل اور خوبصورت کلس نصب کر دیا گیا ہے۔

سکی تال دے مجہ ٹھنکتی کھڑی
جو ڈھاں ڈھکنی کے کھیلن آئی من
محمد شاہ ہے اس زمانے کا شاعر
(بھوکڑی بھو کھیل)

کہ ڈھاں ڈھکنی کھیل کر ہلکتی کھڑی
نہ سکھ بھوکڑی بھو کھیل مسکتی کھڑی
نبی صدقے اس نیہ ٹھمکتی کھڑی
محمد قلی قطب شاہ

رکھی جائیں۔ اور نقشہ جات سلطنت بھی پیش کیے جائیں۔

یہ ایک اہم ذمہ داری تھی جو میرے دوش پر رکھی گئی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پورا کرنے میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی۔ بہر حال میں نے اپنے شرکا کار کی مدد اور تعاون سے کوشش کی ہے کہ حتی الامکان زیادہ سے زیادہ نوادرات نمایش میں رکھی جائیں۔ مختصر طور پر میں ان اشیا کا ذکر کروں گا جو اس نمایش کے لئے جمع کی گئی ہیں۔ نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ مرحوم کے قیمتی خزانۂ نوادرات سے (۴۲) عربی اور فارسی کی اور (۲۲) اردو کی قلمی کتابیں۔ تلوار۔ بھالے برچھے اور چند تصاویر رکھی گئی ہیں۔ ان میں اکثر نایاب ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کا اصل دیوان بھی نمایش کے لئے پیش کیا گیا ہے جس پر خود مصنف کے دستخط موجود ہیں۔ حکومت حیدر آباد کی منظوری کے بعد ہم نے سنٹرل ریکارڈ آفس سے چار اصل فرامین اور دو قلمی کتابیں حاصل کی ہیں۔ کتب خانۂ آصفیہ سے (۱۲) قلمی کتابیں حاصل ہوئی ہیں۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے اصل سکے۔ عمدہ تصاویر اور چند نادر اشیا عطا کی ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو سے قلمی کتابوں اور فرامین کے علاوہ قطب شاہی کتبوں کے چربے ملے ہیں اور مشاہیر کی تصاویر بھی ادارہ کے البم کی مرہون منت ہیں۔ مسٹر ہرمز کاؤس جی کے جمع کردہ نادر سکے بھی یہاں رکھے گئے ہیں۔ مولوی عبدالعلی صاحب سیکر و کلکٹر بلدیہ نے تانبے کے برتن نمایش کے لئے عطا فرمائے ہیں جن پر عربی و فارسی عبارت نمایاں ہے۔ مولوی سرتاج میرزا صاحب نے بھی اپنے والد آغا حیدر حسن میرزا صاحب کے جمع کردہ نوادر حوالہ فرمائے ہیں جن میں ایک قلمی کتاب کے علاوہ عمدہ تصاویر موجود ہیں اور زیادہ اہمیت کشمشی رنگ کی غوری celedan plate کو حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس رنگ کی غوری کمیاب ہے۔ مولوی محمد اشرف صاحب انجنیر سے حاصل کردہ اشیا بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن میں ایک فرانسیسی مصور کی بنائی ہوئی مکہ مسجد کی قدیم تصویر اور قلمی نسخہ کے علاوہ ماہی مراتب اور علم موجود ہیں۔ ماہی مراتب اور علم کل کے جلوس کا ایک اہم جز تھے۔ ان کے بغیر جلوس نامکمل ہی رہتا۔ جلوس میں میانہ، پالکی اور ہوادار وغیرہ موجود تھے۔ ان کو بھی نمایش میں رکھا گیا ہے تاکہ اطمینان سے ان قدیم سواریوں کو دیکھنے کا موقع ملے۔ بادشاہوں اور مشاہیر کے علاوہ قدیم عمارتوں اور گولکنڈہ کے کھنڈرات کی تصاویر بھی رکھی گئی ہیں۔ سلطنت قطب شاہی کے نقشہ جات بھی مرتب کرائے گئے ہیں اور شہر حیدر آباد کے محل وقوع کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے مولوی فیاض الدین صاحب کی مہربانی سے دو نقشے مرتب ہوئے ہیں۔ چار مینار کا ماڈل جو کل جلوس کی رہنمائی کر رہا تھا نمایش میں موجود ہے۔ یہ ماڈل بطور خاص وزیر سلطان ٹوباکو کمپنی نے اس نمایش کے لئے ہماری درخواست پر تیار کرایا ہے۔ یوں تو قطب شاہی زمانہ کی اور بہت سی کتابیں اور تصویریں مل سکتی تھیں اور پیش بھی کی گئیں۔ لیکن اس کا التزام کیا گیا کہ صرف قطب شاہوں سے متعلق چیزیں رکھی جائیں۔

نمایش کی ترتیب اور سجاوٹ میں مولوی مسعود رضوی صاحب شریک مہتمم سالار جنگ میوزیم نے

اپنے عملہ کے ساتھ غیر معمولی محنت سے کام لیا ہے۔ اور ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے بھی اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید کیا ہے۔

نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے ازراہ کرم اس نمایش کا افتتاح فرمانے سے نہ صرف اتفاق فرمایا تھا بلکہ اس نمایش کے انتظامات سے متعلق بھی مجھے اجازت عطا فرمائی۔ لیکن اس امر کا افسوس ہے کہ وہ ناسازئی مزاج کی وجہ مدراس سے واپس تشریف نہ لا سکے۔ بناء براں ہمارے ملک کے محبوب وزیر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی صاحب سے افتتاح نمایش کی درخواست کی گئی۔ صاحب معزنے باوجود دیگر مصروفیات کے اس سے اتفاق فرمایا جس کے لئے منجانب نمائش کمیٹی میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

جن جن حضرات نے تعاونِ عمل فرمایا ہے ان سب کا بے حد شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور جناب صدر سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ نمایش کا افتتاح فرمائیں۔

حیدر محل میاتے تابات گھول ساجے — دن دن انند سیتے طبلاں مدن کے باجے

اس سرو قد کے اوپر جلوہ ہے نور تن کا — عشق کے پاتراں سب اس کاس دیکھ لاجے

چادر عشق کا اوڑھے جوں برہوئی ڈھلیے — تیرے عشق کے لاجوں دیکھے ہیں لاجوں بھاجے

اودے سو مرد بن کر برداں سوں ناچے نرتن — اودے روماں اڑتے ہیں راج کرنے راجے

صدقے نبی شکر کر تجھ کو ملی یہ پاتر

حیدر غلامی سیتے تجھ سیس تاج ساجے

(بھاگ متی حیدر محل) محمد قلی قطب شاہ

تقریر صدارت

اسن:۔ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی (وزیر فینانس)

(دوسرے علمی اجلاس کی آخری تقریر)

ہم دو دن سے حیدرآباد میں گولکنڈہ کے شاندار ماضی کو یاد کر رہے ہیں اور یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ تقریباً چار سو سال سے یہ دن کیوں نہیں منایا گیا۔ لیکن اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب ڈاکٹر زور کی شکل میں قطب شاہی بادشاہوں کو "ابن مریم" مل گیا ہے۔ اس یوم کی ساری کامیابی کا کریڈٹ ڈاکٹر زور کو جاتا ہے اور وہ اس کے لئے لائق ستائش اور قابل مبارک باد ہیں۔

اب جب کہ تمام تلگو اضلاع پھر سے متحد ہیں اور تمام آندھرائی مل گئے ہیں اس یوم کو بجواڑہ، والٹیر، گنٹور اور آندھرا پردیش کے دوسرے مقامات پر بھی عزت و احترام سے منانا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ تلگو بولنے والوں کو بھی اس میں حصہ لینا چاہیئے کیونکہ اس قسم کی تقاریب سے تلگو اور اردو والوں کو ماضی اور حال کو اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ملنے اور یکجا ہونے کا موقع ملتا ہے۔

یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب اور محمد قلی قطب شاہ کی زندگی سے ہمیں یہ سبق سیکھنا ہے کہ زبان اور کلچر ہمیں ملاتے اور متحد کرتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ تلگو والے زیادہ سے زیادہ اردو کی سرپرستی کریں اور اردو والے زیادہ سے زیادہ تلگو کی سرپرستی کریں۔ حیدرآباد کے لوگ تلگو کو "اطراف بلدہ" سمجھ کر فراموش نہ کردیں۔ اس لئے کہ تلگو شہر حیدرآباد کے باہر آندھرا میں بہت زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

کوئی مادری زبان دوسری زبانوں کے سیکھنے سے کمزور نہیں ہوتی۔ تلگو والوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور عربی سیکھنے میں بھی عار محسوس نہ کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم کلاسکی زبانوں سے تاثر حاصل کریں اور ان کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوں کیونکہ زبانیں اس دروازے کی طرح ہوتی ہیں جن کے ذریعہ سے دلوں میں اترا جاسکتا ہے۔ زبان یا کلچر ہمیں تقسیم یا جدا نہیں کرسکتے۔ یہ وہ "پرانے پل" ہیں جو ہمیں آپس میں ملاتے ہیں۔

اس کا امکان ہے کہ آندھرا پردیش کی تینوں یونیورسٹیوں میں زبانوں کے متعلق شعبے قائم کئے جائیں تاکہ ریاست میں بولی جانے والی زبانوں کی ترقی کے لئے مزید حوصلہ افزائی ہو۔ خوشحال مملکت کا

مفہوم باہمی رواداری، خوش حال گھرانے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہے اور ان لوازمات کے لئے چار سو سال پہلے کے حکمران محمد قلی قطب شاہ سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے جن کے دور میں مثالی فرقہ وارانہ اتحاد تھا۔ وہ بیک وقت اردو، فارسی اور تلگو کے بہترین شاعر تھے اور انھوں نے اردو کے ساتھ تلگو کو بھی مساوی طور پر فروغ دیا۔ اپنے اقتدار کے زمانہ میں ہی موجودہ ہندوستان کے چوتھے بڑے شہر حیدرآباد کی بنا ڈالی اور رواداری کا بلند ترین مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کے نام پر اسے بھاگ نگر قرار دیا۔

محمد قلی قطب شاہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کی قائم کی ہوئی یادگاریں اور عمارتیں بھی سیکڑوں سال بعد معدوم ہوسکتی ہیں لیکن شاعری اور ادب ہمیشہ باقی رہنے کی چیزیں ہیں اور ان کے اوصاف اور خوبیوں کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

محمد قلی قطب شاہ نہ صرف حیدرآباد کے بانی اور دکن کی ملی جلی تہذیب کے معمار تھے بلکہ ادب نواز اور عظیم شاعر بھی تھے۔ شاہجہاں نے اپنی محبوبہ کی یادگار کے طور پر حسین اور خوبصورت روضہ تاج محل تعمیر کرایا تھا، محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبوبہ کی یادگار کے طور پر یہ عظیم اور جیتا جاگتا شہر حیدرآباد چھوڑا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ اس لحاظ سے شاہجہاں سے بھی بڑھ جاتے ہیں کہ شاہجہاں نے یہ یادگار اپنی جس محبوبہ اور بیوی ممتاز محل کے لئے قائم کی تھی وہ مساوی درجہ اور رتبہ رکھنے والی اور اونچے گھرانے کی قابل خاتون تھیں لیکن محمد قلی قطب شاہ نے ایک معمولی عورت اور گلی کی ایک ادنیٰ رقاصہ بھاگ متی کے لئے یہ عظیم شہر آباد کیا۔ شاہجہاں نے بیوی کی وفات کے بعد غم و الم کے جذبات کے تحت یادگار بنائی اور محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبوبہ کی زندگی ہی میں ایک عمدہ شہر بساکر اس کے نام سے مشہور کردیا۔

میری تجویز ہے کہ یوم محمد قلی قطب شاہ ہر سال سارے آندھرا پردیش کے یوم کے طور پر منایا جائے۔ جس طرح یکم نومبر کو آندھرا پردیش کے قیام کی سالگرہ سرکاری دن کے طور پر منائی جاتی ہے یوم محمد قلی قطب شاہ اپنی تہذیبی اور ادبی اہمیت کے لحاظ سے ریاست کے غیر سرکاری دن کی حیثیت سے منایا جاسکتا ہے۔ جس طرح پورے ہندوستان میں ۱۵ اگسٹ اور ۲۶ جنوری دونوں تاریخوں کو قومی عید منائی جاتی ہے اسی طرح آندھرا پردیش میں یکم نومبر اور ۱۱ جنوری کے دن قومی عید قرار پائیں گے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ اور علی برید شاہ بیدر کے تعلقات

از:۔ مولوی سید محمدؐ صاحب بیدری مورخ

(تیسرے علمی اجلاس منعقدہ نظام باغ میں یہ مضمون پڑھا گیا۔)

ہند کا جنوبی حصہ جو دکن کے نام سے موسوم ہے اپنی جغرافیائی خصوصیات کے اعتبار سے شمالی ہند کے مقابلے میں جو اہمیت رکھتا ہے اس سے کہیں زیادہ اس خطہ کو ہر دور کی انقلابی تاریخ کی روشنی میں شمالی ہند کی تاریخ سے مقابلتاً ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

دکن سے متعلقہ تواریخ کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس خطہ کے مختلف ہمعصر حکمران خاندانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ اختلافی مسائل رہنے کے علاوہ خود حکمران خاندان کے بعض افراد آپس میں جان لیوا دشمن ثابت ہوئے ہیں۔ ہمسایہ حکومتوں میں ہو یا حکمران خاندان کے افراد میں مخالفت پیدا کرنے میں حکمران کی فطری کمزوریوں کے علاوہ ذاتی منفعت اور حصول اقتدار کی خاطر خود غرض امرائے عظام نے بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ حکمران وقت کی طبیعت میں دخیل ہو کر اس کو عیش پسند، آرام طلب اور کاروبار سلطنت سے غافل بنانے میں انھوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ تاریخ کی ورق گردانی میں ایسی سیکڑوں مثالیں ہم کو ملتی ہیں۔ اس کی تفصیلات میں گئے بغیر یہاں یہ عرض کروں گا کہ بیدر کی عظیم بہمنی سلطنت کے پارہ پارہ ہونے کے اسباب بھی یہی ہیں۔ انہی پاروں میں گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیدر کی برید شاہی حکومت کا بھی شمار ہے۔

عظیم الشان بہمنی سلطنت کے بعد اس کے صوبہ داروں کی خود مختاری کا اعلان اور ان کی حکمرانی کا دور تاریخ دکن میں طوائف الملوکی کے عہد سے یاد کیا گیا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ اس دور کے حکمرانوں میں سے ہر ایک حکمران کو اپنی کمزوری کا احساس غالب رہا اور ہر حکمران خاندان دوسری حکومت کی مدد کا طالب اور محتاج بنا رہا۔ اگرچہ ہر ایک خاندان دکن میں ایک مدت تک حکومت کرتا رہا لیکن چین اور سکون سے حکومت کرنے کا سوال ان حکمرانوں میں کسی وقت بھی پیدا نہیں ہو سکا۔ چنانچہ قطب شاہی اور برید شاہی حکمرانوں کا بھی یقینی یہی حال رہا۔ لیکن دونوں حکومتوں میں قطب شاہی حکمرانوں کو ہر اعتبار سے (صولت اسلامی ہو یا دبدبہ سلطانی) جو فوقیت و برتری حاصل رہی ہے وہ شاہان بریدیہ کو کسی وقت میں بھی نصیب نہیں ہوئی۔ سلاطین قطب شاہیہ کی رواداری، نظم و نسق، سلیقہ مندی، خوش مزاجی، دادرسی، علم و ہنر میں ترقی، تعمیر فن کاری اور دولت کی فراوانی سے متعلق اس جشن کے موقع پر واجب الاحترام ممتاز مورخین اور ادبا نے مجھ سے پہلے کافی روشنی ڈالی ہے۔ البتہ میرے مفوضہ عنوان مضمون کے اعتبار سے یہ عرض کروں گا کہ علی برید شاہ ثانی کے زمانہ میں زوال پذیر بریدی حکومت کے دائرۂ مملکت میں

صرف (۸) پر گنے رہ گئے تھے جب کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مملکت قطب شاہی نارا ین کھیڑ تک پہنچ چکی تھی جہاں سے برید شاہی حکومت کا صدر مقام بیدر صرف (۲۰) میل دور رہ گیا تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی برید ثانی کا عہد بریدیہ خاندان کے انتہائی زوال کا زمانہ کہا جا سکتا ہے جب کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد حکمرانی کو قطب شاہی حکومت کا کمال عروج کا زمانہ تسلیم کیا جا چکا ہے اور علی برید کی خود مختاری اس قدر محدود علاقہ میں صرف اس وجہ سے باقی تھی کہ ہمسایہ حکومتوں کو اپنے معاملات سے فرصت نہ تھی۔

علی برید اپنی انتہائی کمزوری کی وجہ سے خاتمہ خاندان بریدیہ کا خطرہ ہمیشہ محسوس کرتا تھا۔ اس خطرہ سے بچنے کیلئے ابراہیم عادل شاہ اور برہان شاہ میں جو لڑائی ہوئی اس کا محرک علی برید ہی تھا۔ اس لڑائی کا محرک علی برید ہونے کی وجہ سے سلطان محمد قلی نے اپنے بہنوئی ابراہیم عادل شاہ کی طرف سے بیدر پر حملہ کر دیا اور اس حملہ میں برید شاہی حکومت کا بالکلیہ خاتمہ ہو جانا کچھ مشکل امر نہ تھا مگر علی برید نے اس موقع پر وینکٹادری کو اکسا کر قطب شاہی عملداری میں یورش کروادی جس کے سبب محمد قلی نے بیدر کا ارادہ ترک کر کے وینکٹادری کے مقابلہ میں کرناٹک کا رخ کیا اور قطب شاہی حملہ سے علی برید بچ گیا۔

بیدر میں علی برید کے زمانہ اور محمد قلی قطب شاہ کے زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بڑا بھائی شہزادہ عبدالقادر جو بعد میں شاہ صاحب کے نام سے مشہور ہوا جس کے مرنے کا ابراہیم قطب شاہ اور اس کے دوسرے بیٹوں کو کامل یقین ہو گیا تھا علی برید کے زمانہ میں بمقام بیدر محمد قلی قطب شاہ کے تخت و تاج کا دعویدار رہا۔

تاریخ سلسلہ آصفیہ اور دربار آصفیہ میں تاریخ قطب شاہی کے حوالہ سے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز صاحب قبلہؒ کے خاندان کے سلسلہ میں ایک لڑکی سلطان ابراہیم قطب شاہ سے منسوب تھی۔ اس سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام عبدالقادر تھا۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ نے بیدر کے ممتاز اور مشہور بزرگ حضرت شاہ خلیل اللہ صاحب بن حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب کرمانیؒ کے سلسلہ میں ایک لڑکی سے عبدالقادر کی شادی کی تھی۔ عبدالقادر بہادر، ذی علم ہونے کے علاوہ ایک اچھا خوش نویس بھی تھا۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے مقابلے میں اپنے باپ کی فراری اور دشمن کے تعاقب کو دیکھ کر عبدالقادر نے باپ سے یہ درخواست کی کہ اگر حکم ہو تو دشمن کو ایسی شکست دوں کہ دوسروں کو سر اٹھانے کی جرات نہ ہو سکے۔ لیکن ابراہیم قطب شاہ نے بیٹے کی درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ جمشید کی طرح سلوک کرنے کا بیٹے پر شبہ ہوا۔ گولکنڈہ آ کر عبدالقادر کو دیورکنڈہ میں قید کر دیا اور اس کی بیوی کو میکے میں بیدر بھیج دیا۔ لکھا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ نے عبدالقادر کو زہر کھلانے کا انتظام کر کے (۳۰) سال کی عمر میں ختم کرا دیا۔ سلطان ابراہیم اور اس کے دوسرے بیٹوں محمد قلی وغیرہ کو عبدالقادر کے مرنے کا کامل اطمینان ہو گیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ زہر دینے والوں نے بہ نظر ترحم عبدالقادر کو زہر نہیں دیا بلکہ تبدیل لباس اور وضع قطع کے ساتھ اس کو فرار کر دیا۔ عبدالقادر نے ایک زمانے تک اپنے کو عالم گمنامی میں رکھا اور اپنے کو شاہ صاحب کے نام سے مشہور کیا اور کسی طرح اپنی بیوی کے پاس بیدر آ گیا۔

سنہ ۱۰۰۴ھ مطابق سنہ ۱۵۹۵ء میں محمد قلی قطب شاہ کے مقابلے میں جو بغاوتیں ہوئیں ان بغاوتوں کو غنیمت جان کر عبدالقادر علی الاعلان حکومت قطب شاہی کا مدعی ہوا اور محمد قلی قطب شاہ کے مقابلے میں اپنے چند ہوا خواہوں کے

ساتھ بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔ سلطان محمد قلی کو عبدالقادر کے زندہ رہنے کا جب یقین ہوگیا تو علی برید کو اس کی گرفتاری کے واسطے ایک خفیہ خط لکھا۔ عبدالقادر اور اس کے ساتھیوں کو کسی طرح خفیہ خط کے آنے کا جب علم ہوگیا تو عبدالقادر کو وجیانگر کی عملداری میں فرار کر دیا گیا۔ لیکن وہاں بھی محمد قلی کے مقابلے میں بغاوت کا سلسلہ جاری رکھا اور خداوندخاں حبشی اور خیرات خاں بھی اس کی مدد کو آگئے۔ چند سواروں کو فراہم کر کے قطب شاہی عملداری میں آکر دریائے کرشنا کے کنارے چتر شاہی اس کے سر لگایا اور بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا اور دارالسلطنت کے امراء سرداروں اور تمام نائک واڑیوں کو وعدے وعید کے ساتھ خط لکھے۔ بعض اس کی بادشاہت کی طرف مائل ہو گئے اور سلطان محمد قلی کو نکالنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ سلطان محمد قلی ان کارروائیوں سے غافل نہیں تھا۔ اعتبار خاں کو سرِ راہ پانگل میں جا کر حفاظت کرنے کا حکم دیا۔ عبدالقادر عرف شاہ صاحب نے محمد قلی کے پاس ایک قاصد کے ذریعہ تخت سے دست بردار ہونے کہلا بھیجا۔ اس پر سلطان محمد قلی نے عبدالکریم، غازی خاں اور علی قلی خاں وغیرہ کو اس کی سرکوبی کے لئے پانگل کی طرف روانہ کیا مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی اعتبار خاں نے عبدالقادر کے چھ ہزار آدمیوں کو شکست دے دی تھی اور خداوند خاں حبشی کو گرفتار کر لیا تھا۔ عبدالقادر یہاں سے بھاگ کر قلعہ کم سیل میں پناہ گزیں ہوگیا اور جب دیکھا کہ یہاں بھی جائے امن نہیں ہے تو بیجاپور جا کر عادل شاہی ملازموں میں شامل ہوگیا۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ گردوپیش کے حالات اور ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے حاکم اور محکوم میں اجنبیت کی جو خلیج حائل تھی اس کو پاٹنے کے لئے سلاطین وقت نے مختلف طریقے اختیار کئے تھے۔ بعض نے بلا امتیاز مذہب و ملت مختلف النسل اور مختلف اللسان خواتین کو اپنے محل میں جگہ دی۔ ظاہر ہے کہ کسی خاتون کا شاہی محل میں داخل ہونا اس کے لئے ایک بزرگ ترین شرف و اعزاز تھا۔ حکمران کا ایسا کرنا عام طور حظ نفس کے خاطر نہیں تھا بلکہ رعایا میں اپنا قرب، اپنی ہردلعزیزی اور مقبولیت پیدا کرنا ان کا واحد مقصد تھا اور اس طریقہ کار کو اصول ہائے جہاں بانی میں سے ایک اصول قرار دے رکھا تھا۔ بہمنی دور کے اصول ہائے حکمرانی کو قطب شاہوں نے دیکھا تھا۔ ان کے دلوں میں بیدر کے ابرانی منظر کی یاد تازہ تھی۔ بغداد و قرطبہ کی طرح بیدر میں مدرسہ محمود گاواں کی شاندار عمارت ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ احمد شاہ بہمنی اور علاءالدین کی گنبدوں میں تعمیر فن کاری اور چینی گلکاری اور بے مثال خوشنویسی کا فن لطیفہ ان کے پیش نظر تھا۔ سلطان محمد قلی کا جب دور آیا تو اپنی ہمہ جہتی صلاحیتوں کی بدولت اس نے اصول تالیف قلوب کے پیرایہ میں بھاگ متی یعنی قسمت والی محبوبہ کے نام سے بھاگ نگر ایک بستی کو منسوب کرنے میں کچھ زیادہ مضائقہ نہیں سمجھا اور رواداری، وفاداری اور محبت کا عملی طور پر سلطان نے بے مثال ثبوت دیا۔ حقیقت میں قسمت والی محبوبہ کے نام کا شہر بھاگ نگر بھی خوش قسمت شہر ہے کہ خاندان قطب شاہیہ و خاندان آصفیہ کا دارالحکومت رہنے کے علاوہ حالیہ جمہوری دور میں بھی عظیم انقلاب کے باوجود آندھرا پردیش کا اب بھی اس کو دارالحکومت ہونے کا شرف حاصل ہے۔

تقریر صدارت

از:- پنڈت ایم۔ نرسنگ راؤ صاحب، وزیر مواصلات آندھرا پردیش
(تیسرے اور آخری علمی اجلاس کی صدارتی تقریر)

بھائیو اور بہنو!

ہندوستان میں مختلف مذاہب عقاید اور طبقات کے لوگ رہتے بستے ہیں اس لئے ہماری سب سے بڑی ضرورت ان میں اتحاد و ہم خیالی پیدا کرنا ہے۔ اس کے لئے ہمیں قطب شاہی دور کی مذہبی رواداری سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے کیوں کہ انھوں نے بلا تفریق مذہب و فرقہ و طبقہ تمام عوام کی خدمت کی۔

ہمارے لئے یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ موجودہ سائنسی ترقیات کے دور میں بھی ہندوستانی عوام میں زبان اور دوسرے مسائل پر ایک دوسرے سے اختلافات ہیں۔ اس لحاظ سے قطب شاہی دور بہت ہی قابل تعریف تھا۔ جب تک شہر حیدرآباد، چارمینار، دارالشفا اور پرانا پل قائم ہیں عوام قطب شاہی دور اور اس کی رواداری فن تعمیر اور نظم و نسق کو کبھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔

مجھے بھی قطب شاہوں سے ایک طرح کا تعلق ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ ابراہیم قطب شاہ سے لے کر چار قطب شاہی سلاطین تک میرے خاندانی تعلقات رہے۔ ابراہیم قطب شاہ کے دور حکومت میں رنگا راؤ پٹن چرو میں پولیس کے اعلیٰ عہدہ دار تھے۔ خزانہ شاہی کی حفاظت بھی ان کے ذمہ تھی۔ اسی زمانہ میں میرے تین بزرگ مسولی پٹم سے پٹن چرو آئے اور رنگا راؤ کے ساتھ رہنے لگے۔ ان میں سے ایک کا نام اکا راؤ تھا۔ اتفاق سے ابراہیم قطب شاہ کا گذر ادھر سے ہورہا تھا۔ بعض اشرار نے بادشاہ کے خزانہ میں چوری کی۔ بادشاہ نے رنگا راؤ کو اس کا ذمہ دار قرار دے کر ان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اسی دوران میں تحقیقات ہوتی رہی اور جلد سارقین کو گرفتار کرکے ساری مسروقہ رقم برآمد کرلی گئی۔

ابراہیم قطب شاہ ان اشخاص کو دیکھنا چاہتا تھا جنھوں نے اس قدر جلد سارقوں کو گرفتار کیا تھا۔ چنانچہ انھیں پیش کیا گیا۔ رنگا راؤ نے بتایا کہ اکا راؤ کی سراغرسانی اور کوشش سے چور گرفتار ہوئے ہیں۔ اس کارنمایاں سے خوش ہوکر بادشاہ نے اکا راؤ کو اپنے مطبخ کا مہتمم بنالیا۔ یہ خدمت ان کے خاندان میں چار بادشاہوں کے زمانے تک قائم رہی۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں رنگا چاری بھی شامل تھے جو میرے مورث اعلیٰ ہیں اور جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں مہتمم مطبخ تھے اور بادشاہ

چونکہ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے اس لئے بعض لوگ ان سے حسد بھی کرنے لگے۔ وہ اگرچہ برہمن تھے اور مطبخ میں گوشت وغیرہ بھی پکایا جاتا تھا، لیکن اس کی نگرانی کے فرائض وہ بخوبی انجام دیتے تھے۔ ایک دن جب ان کے مخالفوں کی سازش سے مطبخ کے باورچیوں اور دوسرے ملازموں نے ہڑتال کردی تو رنگا چاری نے برہمن ہونے کے باوجود خود ہی گوشت وغیرہ پکایا اور بادشاہ کے لئے خاصہ پیش کیا۔ جب بادشاہ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے فوراً ایک گاؤں دے کر انھیں دیسکھ بنادیا۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ قطب شاہی سلاطین کو اپنے ہندو ملازمین پر پورا اعتماد تھا اور انھیں کھانا تیار کرنے کے جیسے اہم کاموں پر بھی مامور کیا کرتے تھے۔

ہمارے ملک کے جغرافیہ کی خصوصیت یہی ہے کہ اس کی رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ اتحاد، ہم آہنگی اور یگانگت پائی جاتی ہے۔ ہمارا جغرافیہ کنیاکماری سے ہمالیہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مختلف مذاہب کے لوگ ہیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی سبھی ہیں لیکن ان سب میں یگانگت موجود ہے۔ محمد قلی قطب شاہ شاعر بھی تھے، منتظم بھی اور ادیب بھی۔ لیکن سب سے بڑھ کر وہ رواداری تھے۔ اب یہ رواداری ہمارے ملک کی روح بن جانی چاہیئے۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور کی تاریخ سے ہم کوئی سبق سیکھ سکتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ اتحاد و یگانگت پیدا کریں اور اس پر کاربند ہوں ــــ میں تمام اہل ہند سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ علاقہ واری مسائل میں الجھنے کی بجائے وسیع النظری، حب الوطنی، رواداری اور بھائی چارگی کے جذبات کو پروان چڑھائیں اور پورے ملک کے مفاد کو پیش نظر رکھیں اور یہی باتیں قطب شاہی دور سے حاصل کی جاسکتی ہیں ــــ اس دور میں ہندو مسلم اتحاد مضبوط تھا اور تمام فرقے اور گروہ آپس میں محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔

حیدر محل میا تے جلوہ عشق کا گاویں

پیر وانی تانت چوندھر رنگاں سیتیں بجاویں

اپ ہاتھ میں بندی ہے جلوے کے ناو کنگن

نیناں کی پتلیاں کوں پتلیاں نمن نچاویں

(حیدر محل کا رقص) محمد قلی قطب شاہ

تقریرِ عشائیہ (ڈنر)

از:۔ ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی صاحب (وزیر فینانس)

(یہ تقریر ۱۳ جنوری ۱۹۵۸ء کو یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلہ میں ترتیب دیئے گئے ڈنر کے ختم پر نواب لیاقت جنگ بہادر صدر ادارہ اور نواب زین یار جنگ بہادر صدر استقبالیہ کی تقریروں اور جام صحت کے جواب میں کی گئی)

مجھے معلوم نہ تھا کہ آج مجھے تقریر کرنی ہوگی اور نہ ہی آپ حضرات اس کے لئے تیار ہوکر آئے ہوں گے تاہم میں اس موقع کو اس لحاظ سے غنیمت جانتا ہوں کہ یوم قلی کے کامیاب تقریبوں اور مجھ سے آپ کے گہرے اور بے لوث خلوص کے جوابی تاثرات کو ظاہر کررہا ہوں۔ گولکنڈہ کا کوہ نور منظر عام پر آنے سے پہلے گرد و خاک میں پڑا ہوا نظر کی نارسائیوں کا گلہ مند رہا ہوگا۔ لیکن ایک وقت آیا کہ اس ہیرے نے پتھروں کو چھوڑ کر تاجوں میں جگہ پائی۔ گولکنڈہ کے تاجدار محمد قلی قطب شاہ کو بھی ہم اسی طرح بھولے رہے۔ لیکن جب چند صاحب نظروں نے اس خاک آسودہ کی عظمتوں کو پہچانا۔ یہ "کوہ نور سخن" ایسی ہی درخشانیوں سے ہمارے سامنے آیا جیسے یہ کبھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہی نہیں ہوا تھا۔ قلی قطب شاہ جیسے بادشاہ کا دن منانا ایک بڑا کام تھا ایسا ہی بڑا کام جیسے چارمینار کے مقابل ایک اور چارمینار کھڑا کرنا اور میں سمجھتا ہوں اسی وجہ سے ہم نے آج تک اس اقدام کی ہمت نہ کی لیکن جس ادارے کو نواب زین یار جنگ بہادر جیسا تعمیرکار مل جائے وہ تعمیر اور تخیل کے ہر خواب کی تعبیر پر قادر ہوجاتا ہے۔ نواب صاحب کے کارنامے اینٹ پتھر اور چونے کی ٹھوس اور عالی شان یادگاروں پر مبنی ہیں۔ لیکن یوم قلی کا اہتمام، خیال کی ایسی خاکہ بندی اور ارادہ کی ایسی تعمیر ہے جس کی بنیاد میں خونِ جگر اور بلندیوں میں خلوص پیہم کی کارفرمائیاں ہیں۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ ایک ایسے خیال کار انجنیر کو ڈاکٹر زورؔ جیسا قطب پرست مل گیا۔ میں داد دیتا ہوں ڈاکٹر زورؔ کی تنہا تندہی کو، میں سراہتا ہوں ڈاکٹر زورؔ کی عمل کوش عقیدت کو، میرا خراج تحسین ڈاکٹر زورؔ کے ادارہ ادبیات اردو کو کہ ادب کی خدمت میں اس شخص نے اپنی عمر کی بازی لگادی۔ اینٹ اینٹ سے ایک

ظیم الشان عمارت کھڑی کردی اور اپنے ساتھ علم اور تحقیق کے جویا لوگوں کی ایک
ماعت کو لے کر بھولی ہوئی اور مدفون تاریخ کو زندگی بخش دی۔ گمنامی کے
ندھیرے میں پوشیدہ باکمالوں کو شہرت کے آسمانوں پر ستاروں کی جگہ دی۔ یہ
ام کچھ معمولی کام نہیں تھا۔ انتھک محنت، اٹل استقامت اور عالی ظرف ایثار
س کے لئے درکار تھا۔ میں نے ادارہ کو دیکھا ادارہ کے کام کو دیکھا۔
چشم بینا کے لئے جیسے ایک دریچہ کھل گیا جس میں سے عظمت ماضی کے
شاندار نقوش ۲، ۲½ سو سال کے عرصہ پر پھیلے ہوئے نظر آئے اور
یرا دل کام کی عظمت اور کام کرنے والوں کی اولوالعزمی کے آگے جیسے
سرنگوں ہوکر رہ گیا۔ میں یقین دلاتا ہوں کل صبح جب ڈاکٹر زور نچنت ہوکر
س سہ روزہ تقریب کے بارے میں سوچیں گے تو ایک مطمئن، مسرور اور فخرآمیز
مسکراہٹ ان کی ساری کاوشوں کا انعام ہوگی۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ ڈاکٹر
ور نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے اور اب یہ ہم سبھوں کا کام ہے کہ اس
ام کو وسیع تر پیمانے پر آگے بڑھائیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کی عظمت ایک انفرادیت کی حامل ہے۔ اس
بادشاہ شاعر کے دیوان کو دیکھنے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے
، وہ اپنی رعایا میں زندہ رہا۔ ان کی خوشیاں، ان کے تہوار، تقاریب، ان
ی ریت رسمیں سب ہی شاہی زندگی کا جزو رہیں۔ یہ انسان دوستی، یہ عوامی
ندگی کا احترام اس زمانے کے ایک ایسے بادشاہ ہی سے ممکن ہو سکتا تھا
و محبت کرسکتا ہو۔ محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کی محبت میں حیدرآباد
عایا اور حیدرآبادیوں سے پیار کیا۔ اسے اگر موقع ملتا تو وہ سارے جگ کو
پنی من پیاری کے نام سے منسوب کردیتا اور کل انسانیت کو اسی طرح محبت
ی باہوں میں سمیٹ لیتا۔ وہ تخت پر بادشاہ تھا لیکن بادشاہت میں ایک سچا
ن کار۔ یہ فضیلت بہت کم بادشاہوں کے حصہ میں آئی ہے اور ہمیں فخر
ہے کہ محمد قلی اس ریاست کا بادشاہ تھا۔ مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ ان
قریبوں سے میرے نام کو بھی کچھ نسبتیں حاصل ہوگئی ہیں۔ میرا یہ فخر ڈاکٹر زور
ر نواب زین یار جنگ کی مہربان محبتوں کا مرہون منت ہے کہ انھوں نے مجھے اپنی
دمت کے قابل سمجھا۔ میں اہل حیدرآباد کا کس قدر ممنون ہوں، ان کے خلوص کے لئے
ن کی عنایتوں کے لئے۔ کاش الفاظ مجھے مل جائیں اور میری ممنونیت ادا ہوجائے۔ یہ
نونیت میرے دل کو اور بھی زیر بار اس وجہ سے کرتی ہے کہ آپ کی محبتیں سلسلہ بن گئی ہیں

اور میری طرف سے اس احسان کا بدل کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ میں نے بہ حیثیت رکن حکومت کوئی ایسی خدمت انجام نہیں دی ہے جس کو گنا کر میں سبکدوشی کا احساس پاسکوں کہ کچھ تو مجھ سے بن پڑا۔ شاید آپ لوگ مجھ سے میرے دل کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی دلچسپی کے لئے اپنے دل کی کچھ باتیں سناتا ہوں۔ میرے بچپن نے ایک علمی فضا میں آنکھیں کھولیں اور میں نے قومی مدرسوں کے علاوہ مشن اسکول میں بھی تعلیم پائی ہے۔ مشن اسکول میں میں بائبل کو اس عقیدت اور شوق سے پڑھتا تھا کہ کرسچین ساتھیوں سے زیادہ نمبر مجھے ملتے تھے۔ مجھے شوق کی وہ گھڑیاں بھی یاد ہیں جب میں چرچ پہنچنے کے لئے صبح کے انتظار میں جاگتا بیٹھتا تھا اور میں ہی سب سے پہلا طالب علم ہوتا جس کے قدم چرچ کی سیڑھیوں پر ادب بردار ہوتے۔ یہ بات شاید اس وجہ سے تھی کہ دل اپنی پاکیزگیوں میں ایک پروانہ ہوتا ہے جو ہر روشنی پر لپکتا ہے اور فرقہ واریت کی کسی حد بندی کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے بعد مجھے شانتی نکیتن کا ماحول اور ڈاکٹر ٹیگور کا اشیرواد ملا۔ اس ادارے میں ایک عالم گیر بھائی چارگی کا سبق میں نے پڑھا۔ انسانیت، ثقافت اور علم کا ایک ایسا سنگم مجھے نصیب ہوا جس نے میرے دل کو دھڑکن میری آنکھوں کو نظر اور میرے شعور کو نور بخشا۔ شانتی نکیتن سے نکل میں نے ۲۸ برس ہی کی عمر میں وزارت پائی۔ شری راجگوپال چاری کی قیادت اور رہنمائی مجھے ملی۔ ان کی زندگی نے مجھے تنگ نظری اور تعصب سے پاک کردیا اور میں رواداری کے مذہب کا پیرو بن گیا۔ ان کے بھی مسلم دوست ہیں، میرے بھی مسلم دوست ہیں۔ اگر ٹیگور نے مجھے انسان بنایا تو راجہ جی نے انسان دوست۔ ان دو بزرگوں کی شخصیتوں اور تعلیمات نے مجھے آپ کی محبتوں کے قابل بنایا ہے اور میں سب کا ممنون ہوں۔ وہ قلیل مدت جو آپ لوگوں کے ساتھ گزری میری ایک خوشگوار یاد کی ترتیب میں مصروف ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مدت کس وقت پوری ہوجائے۔ وقت کا دھارا بہہ رہا ہے۔ آج ہم یہاں ہیں کل نہ جانے کہاں ہوں۔ بہر حال جتنے دن بھی میں نے یہاں گزارے اور جو چند دن آئندہ آپ کے ساتھ گزاروں گا آپ کے خلوص کے قابل بننے کے لئے ہی ہوں گے۔ آندھرا پردیش ایک روشن مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کاروان میں آپ بھی شریک ہیں۔ آپ سبھوں کی ترقی، خوشی اور خوش حالی کے لئے میری بہترین تمنائیں ہیں۔ میں آپ کی ساری عزت افزائیوں کے لئے ایک دل ہوں جس میں شکر گزاری ہی شکر گزاری ہے۔

تفصیلات نمائش یوم محمد قلی قطب شاہ

از:- مولوی محمد عبدالوہاب صاحب و مولوی سراج الدین علیخاں صاحب

یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلہ میں جو تاریخی نمائش دیوڑھی سالار جنگ مرحوم میں ترتیب دی گئی تھی وہ قطب شاہی تہذیب و تمدن اور علمی سرگرمیوں کی آئینہ دار تھی۔ یہ نمائش قطب شاہی عہد کے فرامین، مخطوطات، مطبوعات، قلمی و عکسی تصاویر، سکے، ظروف، اسلحہ، سواریاں، ماہی مراتب، کتبات کے چربوں اور قدیم نقشوں وغیرہ پر مشتمل تھی۔

اس کا افتتاح ۱۲ر جنوری ۱۹۵۵ء کو سری گوپال ریڈی وزیر فینانس (حال وزیر اقتصادی امور حکومت ہند) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ یہ نمائش عوام کے لئے ایک ہفتہ تک جاری رہی اور ایک روز پردہ نشیں خواتین کیلئے بھی مخصوص کیا گیا تھا۔ بے شمار علم دوست اصحاب و خواتین نے استفادہ کیا۔

نمائش کی شیہ داری تفصیل درج ذیل ہے۔ اس میں بعض کتب و اشیاء کے ناموں کے آگے آئندہ تحقیق کرنے والوں کی سہولت کے لئے متعلقہ کتب خانہ یا کلکشن کے نمبر درج کر دیئے گئے ہیں تاکہ مطالعہ یا معائنہ کے وقت حوالہ دیا جا سکے۔

(۱) فرامین

۱۔ سنٹرل ریکارڈ آفس

فرمان سلطان محمد قلی قطب شاہ مورخہ ۲ر ربیع الثانی سنہ ۱۰۰۳ھ
فرمان سلطان محمد قطب شاہ " ۹ر شوال سنہ ۱۰۲۶ھ
فرمان سلطان محمد قطب شاہ " ۵ر جمادی الثانی سنہ ۱۰۳۱ھ
فرمان سلطان عبداللہ قطب شاہ " ۲۹ر جمادی الثانی سنہ ۱۰۳۸ھ
فرمان سلطان ابوالحسن تاناشاہ " ۲۷ر جمادی الاول سنہ ۱۰۹۰ھ
فرمان سلطان ابوالحسن تاناشاہ " ۲۵ر ذی الحجہ سنہ ۱۰۹۷ھ

۲۔ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو

فرمان سلطان ابوالحسن تاناشاہ مورخہ ربیع الاول سنہ ۱۰۸۳ھ

(عطیہ نواب میر لیسین علی خاں صاحب)

فرمان سلطان ابوالحسن تاناشاہ مورخہ ۷ر صفر سنہ ۱۰۸۶ھ
" " " " " ۱۴ر ربیع الثانی سنہ ۱۰۸۶ھ
" سلطان عبداللہ قطب شاہ
" سلطان ابوالحسن تاناشاہ مورخہ سنہ ۱۰۹۲ھ
تاکید عہد ابوالحسن تاناشاہ " سنہ ۱۰۸۴ھ
" " " " (معہ تلنگی) " سنہ ۱۰۸۵ھ

۳۔ دفتر پائیگاہ سر وقار الامراء مرحوم

اقرار نامہ خواجہ یوسف خواجہ سرائے سلطان عبداللہ قطب الملک والی حیدرآباد سنہ ۱۰۶۲ھ مہری خواجہ یوسف (نمبر ۲۳۵)

سند (بخشش نامہ) خواجہ یوسف خواجہ سرائے سلطان عبداللہ قطب شاہ مورخہ ۲۷ رجب ۱۰۶۲ھ (نمبر ۲۳۰)

فرمان ابوالحسن تاناشاہ مورخہ ۷ رجب ۱۰۹۹ ہجری خواجہ یوسف نمبر ۲۳۱

" " " " ۷ رجب ۱۰۹۹ ہجری خواجہ یوسف نمبر ۲۳۶

۴۔ مولوی میر عباس علی صاحب نبیرۂ میر محمد مومن

فرمان عبداللہ قطب شاہ مورخہ ۲۳ جمادی الاول ۱۰۵۰ھ بنام رکن خاندان حضرت میر محمد مومن۔

۵۔ مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی

مضمون فرمان عہد ابوالحسن تاناشاہ مورخہ ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء خطاطی

تاکید عہد ابوالحسن تاناشاہ " ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء "

فرمان عہد ابوالحسن تاناشاہ " ۱۰۹۵ھ / ۱۶۸۳ء "

تاکید عہد ابوالحسن تاناشاہ " ۱۰۸۴ھ / ۱۶۷۳ء "

۶۔ مولوی عبدالقادر صاحب (نمبر مکان ۱۴/۸ لال ٹیکری)

اصل فرمان سلطان عبداللہ قطب شاہ

(۲) مخطوطات

۱۔ سنٹرل ریکارڈز آفس

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مولف	کیفیت
تاریخ قطب شاہی	نامعلوم	سن تحریر ۱۳۶۱ھ
حدیقۃ السلاطین	مرزا نظام الدین احمد	—
تواریخ قادری	محمد قادر خاں منشی	۱۲۳۱ھ / ۱۷-۱۸۱۵ء
تواریخ فرخندہ	محمد قادر خاں منشی بیدری	۱۲۴۵ھ / ۳۰-۱۸۲۹ء ؛ سن تحریر ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۷ء

۲۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (سابق کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد)

جواہر التفسیر (تفسیر ۵۱۱)	الملا کمال الدین حسین واعظ الکاشفی متوفی ۹۱۰ھ	مطلا ومزین بہ مہر سلطان محمد قلی قطب شاہ
دستور نامہ (مثنوی ۱۲۹)	نزاری	مطلا و مزین بہ مہر سلطان محمد قطب شاہ
مطمح الانظار (مثنوی ۱۰۴)	مرزا محمد امین میر جملہ شاہی متخلص بہ روح الامین	بعہد سلطان محمد قلی قطب شاہ
غزلیات سلطان محمد قطب شاہ (نظم ۱۱۳۹)	سلطان محمد قطب شاہ	
میزان الطبایع قطب شاہی (طب ۳۶۴)	تقی الدین محمد بن صدر الدین علی	
مجموعہ الامثال (قصص ۱۱۲)	محمد علی جبل رودی	
شجرۂ دانش و دیگر رسائل (مجامیع ۳۹)	نظام الدین احمد الگیلانی	
دیوان سلطان (بزبان دکنی) (دواوین ۲۷۴)	سلطان	
دیوان غواصی (۱۰۳۷ جدید)	غواصی	بعہد سلطان محمد قلی قطب شاہ
چندا و لورک (۱۴۱ جدید)	"	
کنز المومنین (تصوف ۸۱۸)	عابد شاہ	
احکام الصلوٰۃ (فقہ حنفی ۴۲۰)	مولانا عبداللہ	
مراۃ السالکین (تصوف ۶۲۱)	عابد شاہ	
مخزن السالکین (ن ۱۵)		
منقبت مہدی اقبال	مرزا مہدی اقبال	

۳۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم

(فارسی مخطوطات)

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مؤلف	کیفیت
اختیارات قطب شاہی (طب نمبر ۱۴)	میر محمد مومن بن علی الحسینی الاسترآبادی	بعہد سلطان محمد قلی قطب شاہ (مطلا و مذہب)
ترجمہ مکارم الاخلاق (سیر نمبر ۱۳)	علی بن طیفور البسطامی	—
گلستان ناز (دیوان روح الامین) (ادب نظم نمبر ۳۵)	محمد امین میر جملہ شہرستانی متخلص بہ روح الامین متوفی ۱۰۴۷ھ	—
مطلع الانظار (نظم نمبر ۹۸۷)	"	تالیف ۱۰۱۹ھ
گنج نامہ در حل لغات شاہنامہ (نظم نمبر ۸۴)	علی بن طیفور البسطامی	تالیف ۱۰۷۹ھ (حسب خواہش رضا قلی بیگ مخاطب بہ نیک نام خاں تالیف ہوئی)
حدائق السلاطین (تاریخ نمبر ۲۱۶)	علی بن طیفور البسطامی	
تذکرۃ الکحالین (ترجمہ از عربی) (طب نمبر ۴۹)	شمس الدین علی الحسینی الجرجانی (مترجم)	بحکم سلطان محمد قلی قطب شاہ
خلاصۃ الحساب (ریاضی نمبر ۶)	—	معنون باسم سلطان محمد قلی قطب شاہ
مجموعہ قطب شاہی (مواعظ نمبر ۸۲)	—	—
خمسہ قطب شاہی (شاہنامہ منظوم حصہ اول) (نظم نمبر ۲۰۶)	—	—
ذخیرہ خوارزمشاہی (طب نمبر ۱۰۴)	(نسخہ پر سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کی مہریں ثبت ہیں)	

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مؤلف	کیفیت
اصول خمسہ امامیہ (کلام نمبر ۱۳)	—	—
تحفہ شاہی عطیہ شاہی ترجمہ الٰہیات تجرید طوسی (کلام نمبر ۲۷)	زین الدین علی بدخشی	—
دانش نامہ شاہی (کلام نمبر ۵۹)	محمد امین بن شریف استرآبادی	—
ترجمہ مصباح کفعمی (ادعیہ نمبر ۴۷)	قاضی جمال الدین بن فتح اللہ شیرازی	—
تفسیر آیات الاحکام (تفسیر نمبر ۴)	شاہ قاضی یزدی	—
مرثیہ و غزلیات وغیرہ (نظم نمبر ۶۶۵)	سلطان محمد قطب شاہ متخلص بہ سلطان و ظل اللہ	— مطلا
دیوان ظل اللہ (نظم نمبر ۴۰۹/۱)	"	نقل از تاریخ قطب شاہی
مجموعہ رسائل جمالی اردستانی (تصوف نمبر ۱۶۸/۱)	جمال اردستانی	مزین بہ تحریر سلطان محمد قطب شاہ
مفاتیح الاعجاز شرح گلشن راز (نظم نمبر ۹۹)	محمد بن علی اللاہیجی النوربخشی	مزین بہ تحریر و مہر سلطان موصوف
میزان الطبائع قطب شاہی (طب نمبر ۲۶۷)	تقی الدین محمد بن صدر الدین علی	(عہد سلطان عبد اللہ قطب شاہی)
اثبات امامت (کلام نمبر ۳۰)	علامہ ابن خاتون العاملی (محمد بن علی)	مکتوبہ ۱۰۵۸ھ
تحفہ مجلس بہشت آئین (احقاق الحق) (کلام نمبر ۲۸)	ملا معز اردستانی	—
ترجمہ قطب شاہی (حدیث نمبر ۱۳)	علامہ ابن خاتون العاملی	—

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مؤلف	کیفیت
تحفۂ مجلس بہشت آئین مناقب اہلبیت (مناقب ۱۱)	—	—
خرقۂ علما (کشکول ۴)	ابن عماد روزبہان اصفہانی	—
نفائس الفنون (مجمع العلوم ۳)	محمد بن محمود الآملی	—
ترجمہ کوک شاستر (طب ۵۲)	محمد شاہ متخلص بہ جامی برادر سلطان محمد قلی قطب شاہ	—
مکاتیب سلطان عبداللہ قطب شاہ بنام دارالشکوہ و اورنگ زیب و دیگر امراء و علماء و فرامین شاہ موصوف (ادب نثر ۳۱۲)	—	—

(عربی مخطوطات)

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مؤلف	کیفیت
تفسیر القرآن (تفسیر ۱)	مہذب الدین احمد بن عبدالرضا الدامینی الحلی البصری متوفی ۱۰۸۴ھ	—
مجموعہ رسائل (حدیث ۹۳)	"	—
رسالہ فی تحریم الغنا (فقہ ۳)	"	—
التحفۃ السلطانیہ فی شرح الارشاد (فقہ ۱۸)	احمد بن سلامۃ النجفی	مکتوبہ ۱۰۷۰ھ معنون بنام سلطان عبداللہ قطب شاہ
مجموعہ تصانیف علی الگیلانی (فلسفہ ۱۰۹)	نظام الدین احمد الملقب بہ حکیم الملک الگیلانی	—
صراط مستقیم در دین قدیم	—	معنون باسم سلطان ابراہیم قطب شاہ
حواشی علی کتاب من لایحضرہ الفقیہ (حدیث ۳۸)	نظام الدین احمد الگیلانی	—
الکلم الطیب (ادعیہ ۱۹۵)	"	—
مجموعہ العافیہ الوافیہ وغیرہ (حدیث ۴۳)	مہذب الدین احمد بن عبدالرضا الحلی متوفی ۱۰۸۴ھ	—
الزاہرات الجامعہ (فقہ ۴۲)	"	—
ادعیۃ الیوم واللیلہ (ادعیہ ۱۷)	"	—
تاریخ قطب شاہی فارسی (تاریخ ۹۵)	—	تالیف ۱۰۲۷ھ
تاریخ قطب شاہی فارسی (تاریخ ۸)	منشی قادر خان بیدری	اصل مسودہ مؤلف

(اردو مخطوطات)

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مؤلف	کیفیت
سیف الملوک و بدیع الجمال	غواصی	
سب رس	وجہی	

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مولف	کیفیت
معجزہ حضرت فاطمہؓ	—	—
پھولبن	ابن نشاطی	—
تحفۃ النصائح	قطب رازی	—
معراج نامہ	بلاقی	—
مناجات مفید الیقین	—	—
قصہ رضوان شاہ و روح افزا	فائز	—
سہاگن نامہ	—	—
طوطی نامہ	غواصی	—
رسالہ محی الدین نامہ	—	—
مراثی	—	—
مجموعہ معجزات (معراج نامہ)	—	—
نور نامہ	—	—
تمہید عین القضات	—	—
جنگ نامہ حنیف شاہ	—	—
کنز المومنین	—	—
شمائل الاتقیاء	—	—
چندر بدن مہیار، لیلیٰ مجنوں وغیرہ	مقیمی	—
معراج نامہ، وفات نامہ، قصہ بینا، ابو شحمہ وغیرہ	—	—
مراثی جمیل	—	—

۴۔ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مولف	کیفیت
مخزن طب قطب شاہی (۳۴۲)	—	حسب فرمائش عبد اللہ قطب شاہ
معراج نامہ (۹۰ ادب)	سید بلاقی	عہد عبد اللہ قطب شاہ

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مولف	کیفیت
شرح جامع عباسی (۱۸۷)	علامہ شیخ محمد بن ابن خاتون	مزین بہ مہر ہائے سلاطین اودھ
شمائل الاتقیاء (۱۱۱)	—	—
نامہ فیاض عالم (۱۴)	سید مبارک مرتضیٰ خاں بخاری قلعدار دولت آباد	روزنامچہ ابو الحسن قطب شاہ
منہج الصادقین (۸۹۲)	—	مزین بہ تحریر سید مظفر مازندرانی وزیر اعظم ابو الحسن قطب شاہ

۵۔ کتب خانہ محمد اشرف صاحب انجنیر

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مولف	کیفیت
مجموعہ رسائل طب	نظام الدین احمد الگیلانی	تصنیف عہد عبد اللہ قطب شاہ

۶۔ کتب خانہ آغا حیدر حسن مرزا صاحب

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مولف	کیفیت
برہان قاطع	محمد حسین برہان تبریزی	مطلا

۷۔ کتب خانہ سعیدیہ

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مولف	کیفیت
مواہب علیہ معروف بہ تفسیر حسینی	مولانا کمال الدین حسین واعظ الکاشفی	مزین بہ تحریر و دستخط سلطان محمد قطب شاہ

۸۔ کتب خانہ راجہ ست گرو پرشاد صاحب اڈوکیٹ

نام مخطوطہ	نام مصنف یا مولف	کیفیت
مسودہ تاریخ دکن (پانچ جلدیں)	ست گرو پرشاد صاحب	—

(۳) مطبوعات

۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ

نام	نام مصنف یا مولف	کیفیت
کلیات محمد قلی قطب شاہ	سلطان محمد قلی قطب شاہ	—
کلام الملوک	میر سعادت علی رضوی	—
سیف الملوک و بدیع الجمال	غواصی	—
طوطی نامہ	"	—
قصہ رضوان شاہ	فائز	—

نام کتاب	نام مصنف یا مؤلف	کیفیت
پھول بن	ابن نشاطی	—
میر محمد مومن	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	—
تاریخ گولکنڈہ	پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی	—
سلطان قلی قطب شاہ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	—
سفرنامہ ٹیورنر	سید علی بلگرامی مترجم	—
سفرنامہ موسیو تھیونو	" " "	—
تاریخ دکن حصہ سوم	سررشتہ علوم و فنون حیدرآباد	—

(۴) چربے

ادارۂ ادبیات اردو

سلطان قلی قطب شاہ کے فرمان کا کتبہ۔

سلطان قلی قطب شاہ بانی سلطنت کی مسجد کا کتبہ۔

اردو کے ایک قدیم ترین شاعر ملا خیالی (عہد ابراہیم قطب شاہ) کی تعمیر کردہ مسجد کا کتبہ۔

مرزا محمد امین برادر محمد قلی قطب شاہ کے سنگ مزار کا کتبہ بخط کوفی۔

مسجد شیخ پیٹھ قطب شاہی کا کتبہ ۱۰۳۲ھ۔

کتبہ مسجد قطب شاہی ہیرا خانہ گولکنڈہ۔

ابو الحسن تانا شاہ کے فرمان کا کتبہ واقع مسجد میاں مشک۔

(۵) تحریرات، منظومات و قطعات وغیرہ

یادداشت نسبت شہر حیدرآباد۔

یادداشت نسبت مکہ مسجد۔

یادداشت نسبت چارمینار۔

مناجات محمد قلی قطب شاہ نسبت تعمیر حیدرآباد (نظم)

"مقابر گولکنڈہ" از علامہ اقبال مرحوم (نظم)

"گولکنڈہ" " محمد علیخاں میکش مرحوم (نظم)

(۶) نقشے

نقشہ حیدرآباد سترھویں صدی عیسوی ـــ بصراحت حدود شہر، پبلک عمارات، باغات شاہی، پہاڑیاں نہریں، محلات وزراء، شاہی محلات ـــ مرتبہ شاہ منظور عالم صاحب لکچرار جغرافیہ چادر گھاٹ کالج۔

نقشہ حیدرآباد سترھویں صدی عیسوی (بعہد محمد قلی قطب شاہ ـــ بصراحت حدود، باغات شاہی، محلات شاہی عمارات وزراء، نہریں، بازارات، پبلک عمارات ـــ مرتبہ شاہ منظور عالم صاحب لکچرار جغرافیہ چادر گھاٹ کالج۔

(۸) تصاویر (قلمی قدیم)

۱۔ حیدرآباد میوزیم

محمد قلی قطب شاہ	بھاگ متی
محمد قطب شاہ	تارا متی
پیاما متی	تانا شاہ (زریں)
ابو الحسن شاہ معہ ہندو وزراء	قطب شاہی بادشاہ کی محفل رقص
قطب شاہی شہزادی	شہزادیاں جھول رہی ہیں
حکیم الملک نظام الدین گیلانی (جس پر غلطی سے بادشاہ لکھ درج ہے۔)	

۲۔ کتب خانہ جناب آغا حیدر حسن مرزا صاحب

مرقع عبداللہ قطب شاہ ہاتھی پر معہ فریم۔

قطب شاہی عہد کی پیاری نے نواز۔
عبداللہ قلی قطب شاہ مع دو سہیلیاں۔
شجاعت خاں۔
پیامتی۔
مادنا۔
بھاگ متی۔
عبداللہ قطب شاہ۔
قطب شاہی شہزادہ مع موسیقی و سناوری۔
سلطان ابراہیم قطب شاہ (۲ عدد)
جمشید قلی قطب شاہ۔
سلطان ابوالحسن تانا شاہ۔
شبیہ محمد قلی قطب شاہ۔

۳۔ ادارۂ ادبیات اردو
حضرت شاہ راجو (بعہد جوانی گھوڑے پر سوار)
حضرت شاہ سید اکبر حسینی (مصنف تلگو کتاب نثر نگار مجزی)۔

۴۔ مولوی محمد اشرف صاحب الخنیر
پینٹنگ مکہ مسجد (واٹر کلر) مرتبہ فرانسیسی پینٹر ۱۲۵۹ھ
پینٹنگ سید خداوند بن سید احمد بن سید خداوند خدا نما۔
پینٹنگ سید یداللہ صاحب عرف سید قبول اللہ سجادہ۔
پینٹنگ زین الدین صاحب گنج نشین قدس سرہ
" ابوالفیض سید من اللہ قدس سرہ
" سید حسین شاہ ولی قدس سرہ
" میر محمود نعمت اللہی

۵۔ مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی
فوٹو پرنٹ سلطان عبداللہ قطب شاہ

تصویر اکنّا
" مادنا
صفحہ از دیوان ملا جامی بخط سلطان محمد قطب شاہ ۱۰۲۳ھ ۱۶۱۴ء

(۹) تصاویر (عکسی)

(تیار کردہ مجلس نمائش یوم محمد قلی)
تحریر حضرت میر مومن رح مع مہر سلطان محمد قطب شاہ
کتبہ مسجد میاں مشک۔
مہر سلطان محمد قلی قطب شاہ۔
مرزا محمد امین میر جملہ۔
سید مظفر میر جملہ۔
محمد سعید میر جملہ۔
حضرت میر محمود رح
حضرت حسین شاہ ولی رح
حضرت شاہ چراغ رح
حضرت سید شاہ راجو رح
منظر گولکنڈہ۔
محمد قلی قطب شاہ کی ولادت گاہ۔
منظر گولکنڈہ و مقابر شاہان قطب شاہیہ
دیوڑھی سید احمد (داماد عبداللہ قطب شاہ) کا دروازہ۔
منظر گولکنڈہ و بالا حصار۔
منظر قلعہ گولکنڈہ۔
منظر آبادی گولکنڈہ۔
چارکمان حیدرآباد۔
مسجد بالائے بالا حصار گولکنڈہ۔
مکہ مسجد حیدرآباد۔
چارمینار۔
مسجد بالائے چارمینار

مکہ مسجد کی قدیم تصویر ۱۲۵۹ھ
گنبد سلطان قلی قطب شاہ۔
" جمشید قلی قطب شاہ۔
" ابراہیم قلی قطب شاہ۔
" محمد قلی قطب شاہ۔
" سلطان محمد قطب شاہ۔
" عبداللہ قطب شاہ۔
" بھاگ متی حیدر محل۔
" تارامتی۔
" پیامتی۔
بادشاہی عاشور خانہ۔
دارالشفاء۔
بادشاہی عاشور خانہ کے علم۔
قدیم قطب شاہی پنجہ شاہ کاروان المعروف بڑا پنجہ۔
علم بادشاہی عاشور خانہ۔
قلعہ گولکنڈہ کا پنجہ شاہ حسینی علم حیدرآباد۔
قلعہ سلطان نگر کے آثار۔
مندر رام داس قلعہ گولکنڈہ۔
مسجد حیات نگر۔
ٹولی مسجد۔

(۱۰) سکے

۱۔ حیدرآباد میوزیم
تانبے کے سکے

سیدھا رخ	الٹا رخ
سلطان جمشید قطب شاہ	ضرب محمد نگر گولکنڈہ سنہ ......

سیدھا رخ	الٹا رخ
"سلطان سبحان قطب شاہ"	غیر واضح
"عدل محمد قلی قطب شاہ ضرب دار السلطنت گولکنڈہ"	تعیر دہ فلوس شاہی پیوستہ بلعنت الٰہی
"ابو المظفر محمد قلی قطب شاہ	"ضرب دار السلطنت حیدرآباد ۱۰۱۲"
"ابو المظفر سلطان محمد قطب شاہ	"ضرب دار السلطنة شہر حیدرآباد ۱۰۲۴"
"سلطان عبداللہ قطب شاہ"	"ضرب دار السلطنة حیدرآباد"
"سلطان عبداللہ بادشاہ غازی"	"ضرب دار السلطنة حیدرآباد"
(سکہ عہد عبداللہ قطب شاہ) "ختمہ بالخیر والسعادة" ۱۰۶۸	"ضرب دار السلطنة حیدرآباد"
(سکہ عہد ابوالحسن تاناشاہ) "ختمہ بالخیر والسعادة"	"ضرب دار السلطنة حیدرآباد"

۲۔ مسٹر ہرمز کادس جی

(تانبے کے سکے)

سیدھا رخ	الٹا رخ
"فلوس جائز ابراہیم قلی	"سعادت مند ازلی ضرب گلکنڈہ ۹۷۳"
"عدل محمد قلی قطب شاہ ضرب دار السلطنة گولکنڈہ"	"تعیر دہ فلوس شاہی پیوستہ بلعنت الٰہی"
"ابو المظفر محمد قلی قطب شاہی	"ضرب دار السلطنت حیدرآباد ۱۰۱۲"

سیدھا رخ	الٹا رخ
"بادشاہ عادل سلطان عبداللہ"	"دار السلطنت حیدرآباد"
"ختمہ بالخیر والسعادة"	"ضرب دار السلطنت حیدرآباد"

(چاندی کے سکے)

"سکہ زد در جہان چو بدر منیر شاہ اورنگ زیب عالمگیر"	"سنہ جلوس میمنت مانوس ۴۷ ضرب گلکنڈہ
"ضرب حیدرآباد ۱۱۱۳"	"جلوس مبارک ۴۵

۳۔ مولوی سید علی اصغر صاحب جج بلگرامی

سکہ تانبہ عہد محمد قلی قطب شاہ

(۱۱) ظروف و لباس

۱۔ سالار جنگ میوزیم

عہد قطب شاہی کے مٹی کے بڑے برتن

۲۔ مولوی عبد العلی صاحب اسیسٹنٹ کلکٹر بلدیہ

دھات کے برتن خورد و کلاں (۴ عدد)

دھات کے پیالے (۲ عدد)

دھات کی تھالی (۱ عدد)

دھات کی مورتیاں (۵ عدد)

دھات کے گھوڑے کے ساتھ مورتی (۱ عدد)

۳۔ پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا صاحب

آفتابہ قلعی دار۔ تانبہ

مقابہ قدیم

بادلے قلعی تانبہ

عوری کشمشی رنگ

پشواز

(۱۲) اسلحہ

سالار جنگ میوزیم

نیزے

تلواریں

کٹاریں

ڈھالیں

(۱۳) سواریاں اور درباری لوازم

۱۔ سالار جنگ میوزیم

پالکی

رتھ

میانہ

ہوادار

عماری

مورچل

نشان

۲۔ مجموعہ مولوی محمد اشرف صاحب انجنیر

علم اور اس کا مخملی کپڑا۔

ماہی اور اس کا کپڑا رنگین نقشی فلس ماہی۔

مراتب اور اس کا کپڑا۔

(۱۴) ماڈل

وزیر سلطان اینڈ کمپنی

چار مینار

(۱۵) تبرکات

از مجموعہ مولوی میر عباس علی صاحب

تبرکات حضرت میر مومن رح پیشوائے سلطنت قطب شاہی

تسبیح۔ کٹورہ۔

نسخہ قرآن شریف۔

مورچل صندل۔

بھاگ متی اور بھاگ نگر

از: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے یوم محمد قلی قطب شاہ کے بعد ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس
ں بھاگ متی کی حقیقت کو عجیب افسانوی انداز تحریر اختیار کر کے واقعی ایک افسانہ بنا دینے کی کوشش کی ہے۔
وس ہے کہ ان کی بزرگی کا احترام کرنے کے باوجود ان کے اس مضمون کی غلطیوں اور صحیح ماخذوں تک ان
ارسائی اور دکنی روایات اور دکنیوں کے مزاج سے ناواقفیت کے بارے میں کچھ لکھنا پڑا۔ بڑی حیرت کی
ت ہے کہ بھاگ متی پر اپنی تحقیقات کے سلسلے میں جہاں انھوں نے بہت سی کتابوں کی چھان بین کی ہے
سیکڑوں صفحات پڑھ ڈالے ہیں اور متعدد مرحوم و مغفور مصنفوں سے استفادہ کیا ہے دکن کی تاریخ اور
ں خاص موضوع کی تلاش و تحقیق پر جن لوگوں نے عہد حاضر میں عمریں صرف کر دیں اور بڑی بڑی مستند کتابیں
ں ہیں اور جو بفضل خدا ابھی زندہ ہیں ان سے مل کر تبادلہ خیال کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ
یخ دکن کے مخلص خدمت گذار ہیں اور دیانت داری سے حقیقت کے جویا ہیں تو میں سمجھتا ہوں کے ان کیلئے
قہ کار لازمی اور ضروری تھا۔ میں تو کوئی مورخ نہیں ہوں اس لئے مجھ سے نہ سہی لیکن ڈاکٹر غلام یزدانی اور
فیسر عبدالمجید صدیقی سے تو ان کو ضرور اس بارے میں مشورہ کر لینا چاہئے تھا۔

انھوں نے اپنے مضمون میں واقعہ بھاگ متی کا واحد ماخذ فرشتہ کو قرار دیا اور ان کی نظر میں وہ ناقابل
ار ہے۔ وہ خود بھی مورخ ہیں اور شائد ایسی جراءت ان ہی کو زیب دیتی ہے۔ میں فرشتہ پر جھوٹ تراشنے
الزام نہیں لگا سکتا اور نہ سمجھتا ہوں کہ محمد قلی قطب شاہ کی وہ تحقیر کر سکتا ہے جب کہ وہ اپنی تاریخ میں اس کو ذوق
علیم کی خدائی صفات سے یاد کرتا ہے اور خاص طور پر اس کی اور اس کے شہر کی خوبیوں کا رطب اللسان ہے۔
رہی عشق و عاشقی فرشتہ بھی اس کو گناہ نہیں سمجھتا۔ محمد قلی قطب شاہ تو اس کو لازمۂ زندگی سمجھتا تھا جیسا
س کی کلیات سے ثابت ہے اور طوائف اور رقاصاؤں سے عشق و عاشقی بادشاہوں سے لے کر شاعروں اور
یاء اللہ تک نے کی ہے۔ ایک باکمال رقاصہ اور حسین ترین طوائف کو اگر فرشتہ نے فاحشہ لکھا تو لفظ "فاحشہ"
ر بار دہرا کر شروانی صاحب نے عہد حاضر کے معیار سے بھاگ متی کی وقعت کم کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ
ہ کی نظر میں گانا بجانا بھی فحش تھا اور محمد قلی کی خوبیوں میں وہ اس واقعہ کو شمار کرتا ہے کہ اس نے فاحشہ کو شریف اور
ا بنا دیا تھوڑی دیر کے لئے اگر فرشتہ جھوٹا بلکہ شیطان بھی بن جائے تو ابوالفضل اور فیضی کے بارے میں

پروفیسر شروانی نہ معلوم کیا کہیں گے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے نہ تو دکن کی تمام تحریریں اور تاریخیں پڑھیں اور دیکھیں اور نہ شمالی ہند کے مورخوں اور ادیبوں کا مطالعہ فرمایا اور بھاگ متی کے وجود کے خلاف اتنا بڑا دعویٰ کر
ابوالفضل نے اکبرنامہ میں اور فیضی نے لطیفۂ فیاضی میں بھاگ نگر اور بھاگ متی کا ذکر خود محمد قلی قطب کی زندگی میں فرشتہ سے دس بارہ سال پہلے لکھا ہے۔

(۲)

فارسی کا مشہور شاعر اور ادیب ملا فیضی شہنشاہ اکبر کے نورتن میں شامل ہونے کے علاوہ اس کا خا مشیر کار بھی تھا۔ چنانچہ شہنشاہ نے اس کو دکن روانہ کیا تھا کہ یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات معلوم کر کے آقا کو رازمیں اطلاع دے تاکہ فوج کشی کر کے اس حصۂ ملک کو مغل سلطنت میں شامل کرنے پر غور کیا جائے۔ ا کام کے لئے فیضی عرصے تک دکن خاص کر برہان پور میں رہا اور موقع بہ موقع اپنی عرضداشتوں کے ذریعہ سے کے حالات سے بادشاہ کو بصیغۂ راز واقف کراتا رہا۔ ان عرضداشتوں کا مجموعہ لطیفۂ فیاضی کے نام سے اسی زمانے میں مرتب ہوا تھا۔ چنانچہ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور ایک دوسرا قلمی نسخہ حیدرآباد کے سنٹرل ریکارڈز آفس میں موجود ہے۔ یہ قلمی کتاب آج سے دو سو اٹہتر (۲۷۸) سال قبل محمد کے نواسے عبداللہ قطب شاہ کے قاضی محمد مراد نے ۱۰۹۹ھ میں نقل کی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۱۲ پر فیضی لکھتا ہے

"محمد قطب الملک مذہب تشیع دارد و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر بنام
بھاگ متی کہ فاحشۂ کہنہ و معشوقۂ قدیم اوست۔ حالات و لایت دکن چہ از آنچہ در جاگیر ایں
بہ کس مقرر است .... اگر دے چند دیگر مہلت باشد بحضور اشرف
بہ تفصیل عرضداشت خواہد نمود۔" وغیرہ

اسی دور میں تاریخ فرشتہ سے بہت پہلے اکبر کے ایک اور رفیق اور فاضل ادیب ابوالفضل نے جو دکن آیا تھا اکبرنامہ ایک کتاب مرتب کی تھی جو ایک مشہور و معروف کتاب ہے اور جس کے قلمی و مطبوعہ نسخے عام طور پر ملتے ہیں۔ اس اکبرنامہ میں بھی ابوالفضل نے شہر بھاگ نگر کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر ریکارڈ آفس حیدرآباد کے نسخۂ ابوالفضل صفحات ۷۷۰، ۷۷۵ پر "کشائش قلعۂ احمدنگر" کے سلسلہ میں شہر بھاگ نگر کا نام جس طرح درج ہے اس کی عبارت درج ذیل ہے:-

"چوں ہمایوں رایات بجنوبی دیار جالش فرمود .... ان نزہت گاہ را
غبار آمود گردانید۔ علی قلی خاں و محمد قلی و کلب علی و شاہ بیگ و دیگر بندگان شقاوت سرشت
نزدیک بھاگ نگر آویزش نمودند۔"

اس سے بڑھ کر بھی بھاگ متی اور بھاگ نگر کے وجود کے بارے میں کسی اور سند یا ثبوت کی ضرورت ہے؟
ابوالفضل اور فیضی دونوں کو پروفیسر شروانی فرشتہ کی طرح جھوٹا کہنے کی غالباً جرات نہ کریں گے۔

(۳)

دکن کی جن تاریخوں میں بھاگ متی کا ذکر نہیں ملتا وہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کی لکھی ہوئی ہیں جو بہت بڑا زاہد اور متقی بادشاہ گزرا ہے۔ جس نے مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور جس کی تہجد کی نماز بھی کبھی قضاء نہیں ہوئی تھی۔ اس بادشاہ نے اور اس کے استاد حضرت میر محمد مومن نے مسلسل یہ کوشش کی کہ حیات بخشی بیگم ملکۂ سلطنت کی والدہ بھاگ متی حیدر محل کے بارے میں لوگ تذکرہ نہ کیا کریں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ فیضی اور فرشتہ نے اس کو فاحشہ لکھ دیا تھا۔ حیدرآباد سے باہر بیجاپور اور احمدنگر میں اس زمانے میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان کے لکھنے والے بقول پروفیسر شروانی میر مومن یا سلطان محمد کے زیرِ اثر نہیں تھے۔ لیکن تاریخ کا معمولی طالبعلم بھی جانتا ہے کہ وہاں کے دربار اور بادشاہ حیدرآباد سے دوستانہ اور سفارتانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے آپس میں شادی بیاہ کے تعلقات قائم تھے۔ ایک جگہ کے وزیر و سفیر، شاعر، ادیب اور مورخ دوسری جگہ آزادی سے آتے جاتے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ حیدرآباد میں تاریخ کے اس باب کو مصلحتاً بند کر دیا گیا ہے اور قطب شاہی بادشاہ مورخ اور شاعر نہیں چاہتے ہیں کہ تاریخ میں ان امور کو درج کریں۔ اس طرح خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے لئے لازمی تھا کہ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھا جاتا۔ چنانچہ جوں ہی قطب شاہی دور ختم ہوا حیدرآباد کے مورخوں نے بھی بھاگ متی کا قصہ لکھنا شروع کر دیا۔ ماہ نامہ کے مولف نے اس کی جو تردید کی ہے اس کی وجہ (شروانی صاحب بھی جانتے ہوں گے) یہ تھی کہ آخری قطب شاہی بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کے بھانجے اور متبنیٰ ابو محمد اس کے دوست تھے اور قطب شاہوں نے اس واقعہ کو چھپانے کے لئے کتنے جتن کئے تھے ان سے واقف تھے اس لئے انھوں نے اپنے اسلاف کی سنت کا اعادہ کیا اور اپنے دوست سے لکھوا دیا کہ یہ واقعہ غلط ہے۔

شروانی صاحب یہ بھی جانتے ہیں کہ برہان مآثر کی طباعت کے وقت سید ہاشمی صاحب فریدآبادی نے کئی حصے حذف کر دیئے تھے۔ شروانی صاحب کو چاہیئے تھا کہ اس کے قلمی نسخے دیکھتے۔ ایک مورخ سے ایسا ہو نہیں ہو سکتا جب کہ وہ صورت حال سے واقف ہو۔

حیدرآباد میں اس واقعہ پر پردہ پوشی کرنے کے لئے قطب شاہی عہد میں اتنے جتن کئے گئے کہ درباری شاعر ملّا وجہی سے ایک مثنوی بطور خاص بھاگ متی کی وفات ۱۰۱۷ھ کے بعد لکھوائی گئی جس میں اصل واقعہ کو کچھ اس طرح بدل دیا گیا ہے کہ پروفیسر شروانی اس کے مطالعہ اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے میں اب تک غلطاں و پیچاں ہیں۔ آخر ایک اجنبی سیاح ہی نے تو بھاگ نگر کو باغ نگر سمجھ لیا تھا۔ وہ بھلا کیا جانتا تھا کہ دو اسم عام ملا کر اسم خاص

نہیں بنایا جاتا۔ نگر یا باغ کے ساتھ جب تک کوئی خاص اسم یا صفت نہ ملائی جا
اسم خاص نہیں بن سکتا۔ مثال کے طور پر احمد نگر، محبوب نگر، ابراہیم باغ، گیا
باغ، پرتاب باغ وغیرہ ناموں پر غور کر لیجئے۔

افسوس اس کا ہے کہ شروانی صاحب نے ایک اجنبی کی تحریر کو باغ نگر کی حد
تو صحیح سمجھ لیا لیکن اس زمانے کے دوسرے اجنبیوں کی تحریریں اور مطبوعہ کتابیں یا
دیکھی ہی نہیں یا دیکھیں تو اپنے مقصد کے خلاف سمجھ کر ایک ذمہ دار اور دیانت
مورخ کے فریضے سے انجان بن گئے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جو فیکٹریاں قا
کی تھیں ان کے کارندوں کی مراسلت کی تفصیلی روئدادیں چھپ چکی ہیں۔ ان کو ولیم فا
نے مرتب کر کے ۱۹۲۱ء میں شائع کیا ہے۔ ۱۶۵۵ء تا ۱۶۶۰ء کے واقعات سے
جلد کے صفحہ ۲ پر لکھا ہے کہ ——

"اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ اس کتاب میں جہاں جہاں
گولکنڈہ لکھا گیا ہے اس سے قلعہ مراد نہیں بلکہ شہر بھاگ نگر ہے
جہاں سے قلعہ (۵) میل کے فاصلے پر ہے۔" (ترجمہ از انگریزی)

(۴)

محمد قلی کی کلیات میں بھاگ متی کا نام کہیں جگہ موجود ہے۔ پروفیسر شروانی کی
نظر سے نہیں گذرا تو تعجب کی بات نہیں کیونکہ شاید وہ دکنی زبان اور ادب کو سمجھ نہ
سکے۔ اگر بھاگ متی کا نام کلیات محمد قلی میں موجود نہ بھی ہوتا تو عجب بات نہ ہوتی
ہر معمولی مورخ بھی جانتا ہے کہ جب کسی دربار سے کسی کو خطاب مل جاتا ہے تو
اس کا اصلی نام استعمال نہیں ہوتا بلکہ اکثر غائب ہی ہو جاتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو
افسر الملک یا مختار الملک کے اصلی نام سے واقف ہیں۔ نور محل، نور جہاں یا ممتاز
کے اصلی نام کتنے لوگ جانتے ہیں یا تاریخوں اور نظموں میں کوئی ان کو مہر النسا یا ارجمند
کے ناموں سے یاد کرتا ہے۔

خطاب یافتہ اشخاص کا ذکر ہمیشہ خطاب ہی سے کیا جاتا ہے نہ کہ اصلی نام
جب محمد قلی نے خود ہی حیدر محل خطاب دیا تو فطری بات ہے وہ زیادہ تر حیدر
ہی اپنی نظموں میں لکھتا۔ یہ اشارہ تھا اس کی اس خواہش کی طرف کہ اس کی محبوبہ
اس کے اصلی نام سے کوئی یاد نہ کرے اور صرف خطاب یاد رکھے۔ اسی مصلحت
تو اس نے اپنے شہر کا نام بھاگ نگر سے حیدرآباد بدل دیا تھا۔ مگر اس تمام اہتمام
باوجود بعض نظموں میں بھاگ متی کا نام باقی رہ گیا ہے۔ جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا۔
کلیات محمد قلی سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حیدر محل اس کی خاص محبوبہ تھی اور

اس کا بہت دلدادہ تھا۔ بھاگ متی کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کو حیدرمحل کا خطاب نہیں دے سکتا۔ اگر کسی اور کا یہ خطاب ہوتا تو پھر ایک محبوبہ بھاگ متی سے منسوب شدہ شہر کا نام حیدرآباد نہ رکھتا بلکہ اس دوسری محبوبہ کے لئے کوئی دوسرا ہی شہر بساتا یا کسی دوسرے آباد مقام کو اس کے نام سے موسوم کرتا۔

شاہی درباروں اور شاہی محلات کے رسم و رواج سے واقف کار لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ شاہی حرم میں داخل ہونے کے بعد اکثر عورتوں کے نام بدل دیئے جاتے ہیں اور خاص کر ان میں سے کسی کے جب بچہ ہو جاتا ہے تو وہ دوسری خواتین حرم سے ممتاز ہو جاتی ہے اور خطاب سے سرفراز کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب بھاگ متی کے بطن سے ۱۰۰۱ھ میں حیات بخشی بیگم پیدا ہوئی تو بھاگ متی کو حیدرمحل کا خطاب دیا گیا اور اس وقت سے شہر کا نام بھی حیدرآباد بدل دیا گیا۔ اور یہ دونوں نام ساتھ ساتھ عرصہ تک جاری رہے۔ اسی لئے فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کہیں حیدرآباد اور کہیں بھاگ نگر لکھا ہے

(۵)

محمد قلی قطب شاہ کی مطبوعہ کلیات کے صفحہ ۲۶۸ پر ایک نظم موجود ہے جس میں محمد قلی نے بھاگ متی کے اوصاف اظہار نام کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ ــــ

" اے نازنیں تجھے اُتاولی چالیں زیب دیتی ہیں۔
تیرے بالوں کے جوڑے پر پھولوں کی مالا ایسی نظر آتی ہے جیسے
سیاہ ناگن پر اژدھا کی زبان نے چڑھائی کی ہو۔
تیرے ہونٹوں پر جو سرخی چڑھی ہوئی وہ جواہر سے زیادہ چمک رہی ہے
جب تو بال کھولتی ہے تو دن رات بن جاتا ہے اور جب تو رات
میں ہنستی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجالا ہو گیا۔
نازنینوں میں بھاگ (متی) ہی وہ نازنیں ہے جو اپنے جسم کی قربت
سے پیا کو نہال کر دیتی ہے۔
علی کے صدقے میں ہمیشہ یہ نازنیں قطب شاہ کے ہونٹوں سے
مئے کا پیالہ پیا کرتی ہے۔

اب اس نظم کے اصل شعر ملاحظہ ہوں ــــ

ناری سہے تجھ اُتاولے چالاں
سیپولی اپر بھونگ سٹیا چام — پھولے الکاں میں پھول مالا
رتن تھے ادک دپین ہوناں پہ — ادھر ان کے اپر چڑی سولالا

دن رات ہوا جو کھولے دھن کیس — نس میں جو ہنسی پڑیا اجالا
ناریاں میں جو نار بھاگ اچپل — انگ سنگ سوں کرے پیا نہالا
نت جیوے علی کے صدقے خانم — قطبا کے ادھر تھے پیالا

محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کے ساتھ شادی میں رسم جلوہ کے وقت گانے کے لئے جو گیت لکھا تھا وہ بھی مطبوعہ کلیات کے صفحہ ۱۶۱ پر موجود ہے اور اس میں بھی محمد قلی نے واضح طور پر بھاگ متی کا نام لیا ہے۔ اس گیت میں وہ لکھتا ہے ـــــ

"پریم پیاری کا سب مل کر جلوہ گاؤ۔ پریوں نے جلوہ کے لئے اسے چاند اور سورج لگا کر سنوارا ہے۔
سہاگ کے پھول بھاگ متی کی پیشانی پر کھلے ہیں۔ سہیلیوں نے اس کی آرتی میں تارے اس پر سے نچھاور کئے۔
جلوہ دینے کے لئے خوشی خوشی ایک ایسا تخت رچاؤ جس کو چاروں طرف موتیوں سے سجایا گیا ہو۔
سات سہاگنیں تیل چڑھاؤ اور زہرہ کو چاہیئے کہ مشاطہ بن کر ہاتھوں پر مہندی کے نقش و نگار بنائے۔
دولہا دلہن (محمد قلی اور بھاگ متی) کو شربت پلاکر دونوں کے ہاتھوں میں پان کے بیڑے دو اور دونوں کے دامنوں کو باندھو۔
اے خدا محمد قلی قطب شاہ اور اس پری کو اس وقت تک زندہ رکھ جب تک ستارے ہیں :"

پریم پیاری کا جلوہ گاؤ سارے — اُسے چند سورسوں پریاں سنگارے
سہاگاں بھاگ پھول متک کھلے ہیں — سہیلیاں آرتی تارے نوارے
رچاؤ تخت جلوہ کا خوشی سوں — کہ چوندہر چوک موتیاں سوں سنوارے
چڑھاؤ تیل اب ساتوں سہاگاں — مشاطہ ہو کے زہرہ ہت نگارے
پلا شربت دیو ہاتاں میں بیڑے — بنداؤ ساریاں موتیاں کنارے
محمد قطب شاہ ہور اس پری کوں — خدایا رکھ جداں لگ ہیں ستارے

عید شب برات کے موقع پر محمد قلی قطب شاہ ہر سال ایک نظم لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلق کلیات میں دس نظمیں شریک ہیں۔
صفحہ ۹۰ پر ایک نظم درج ہے جس کے آخری دو شعروں میں وہ کہتا ہے ـــــ
"چونکہ محبوب کے پھول جیسے جسم کے ساتھ شب برات کی رات میں لٹ پٹ ہونا ہے اس لئے اس کو عروسی خوشبویوں میں از سرِ نو مہکایا گیا ہے۔

نبی کے صدقے میں قطب شاہ بھاگ (متی) سے مل کر جی بھر کر عیش وصل حاصل کر کیونکہ وہ بن سج کر پھر سے خود کو قطب شاہ کی داسی کہلوا رہی ہے۔

محمد قلی کے شعر یہ ہیں ــــ

سجن کے پھول سے تن کوں لٹاپٹ ہو انندوں سوں
عروسانی سوہاساں میں ادک جھکاے بجا سر تے
نبی صدقے قطب ہو کے سوں کر سنبھوگ بھاگوں مل
قطب کی داس ہوں سج کر اپس کہواے بجا سر تے

بھاگ متی ہی کا خطاب حیدر محل ہونے کا ثبوت اس طرح سے بھی ملتا ہے کہ محمد قلی نے اپنی اردو کلیات میں جہاں جہاں حیدر محل کا ذکر کیا ہے اس کو رقاصہ بھی ظاہر کیا ہے۔ مثلاً ایک نظم کلیات کے صفحہ ۲۵۷ پر درج ہے جس میں محمد قلی حیدر محل کو ایک ایسی رقاصہ ظاہر کرتا ہے جو اس کے سر پر تاج کی طرح سجتی ہے۔ اور جو ہر روز المینان سے عشق کے طبل بجاتی ہے وہ کہتا ہے ــــ

"حیدر محل محبت سے مصری کی ڈلی گھولتی ہے اور ہر روز المینان سے عشق کے طبل بجاتی ہے۔
اس کے سرو جیسے قد پر نور تن کا جلوہ نظر آتا ہے اور عشق و محبت کی رقاصائیں اس کو دیکھ کر شرماتی ہیں۔
وہ عشق کی چادر اوڑھ کر بیر بہوٹی کی طرح سرخ نظر آتی ہے۔
نبی کا شکر ادا کر کہ تجھ کو ایک ایسی رقاصہ ملی ہے جو حیدر کی غلامی کے باعث تیرے سر پر بطور تاج کے سجتی ہے۔

اس نظم کے چند شعر یہ ہیں ــــ

حیدر محل میا تے نابات گھول ساجے — دن دن انند سیتے طبلاں مدن کے باجے
اس سرو قد کے اوپر جلوہ ہے نور تن کا — عشق کے پاتراں سب اس کاس دیکھ لاجے
چادر عشق کا اوڑے جوں بیر بہوٹی دیسے — تیرے عشق کے لاجاں دیکھے ہیں لاجوں بھاجے
صدقے نبی شکر کر تجھ کو ملی ہے پاتر — حیدر غلامی سیتی تجھ سیس تاج ساجے

ایک اور نظم میں حیدر محل کے گانے اور ناچنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ نظم ناقص حالت میں ملی ہے۔ صرف دو شعر (صفحہ ۲۵۸) مکمل ہیں جن میں محمد قلی کہتا ہے کہ ــــ

"حیدر محل محبت سے عشق کا جلوہ گائیں اور یزدانی ستار طرح طرح کے رنگ میں بجائیں۔
جب اپنے ہاتھ میں جلوہ کا گیت گانے کے لئے کنگن پہن رکھا ہے تو بہتر

ہے کہ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو بھی کھیل کی پتلیوں کی طرح نچائیں۔

اصل شعر یہ ہیں ــــ

حیدر محل میاتے جلوہ عشق کا گاویں — یزدانی تانت چوندھر رنگاں سنیں بجاویں
اپ ہاتھ میں بندی ہے جلوہ کے نادکنگن — نیناں کی پتلیاں کوں پتلیاں نمن نچاویں

محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب دینے کے بعد اپنے ایک محل کا نام بھی حیدر محل رکھا تھا جس میں بھاگ متی حیدر محل کا قیام تھا۔ یہ محل موجودہ محلہ "مٹی کے شیر" کے پاس واقع تھا اور اس کی قدیم مسجد اب بھی وہاں موجود ہے۔ اس محل میں ہر سال بھاگ متی کی شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی جاتی تھی اور محمد قلی قطب شاہ اپنی محبوبہ کو ہر سال نئے سرے سے دلہن بناتا تھا اور اس کے جلوے کی رسم کے لئے ناچنے اور گانے والیوں کو ایک نیا گیت بھی لکھ کر دیتا تھا۔ ایسا ہی ایک گیت کلیات محمد قلی کے صفحہ ۲۱۷ پر درج ہے جس میں وہ لکھتا ہے ــــ

"حیدر محل میں ہمیشہ حیدر پیاری (بھاگ متی) کا جلوہ گاؤ اور اس تقریب میں عرش آسماں اور زمیں پر خوشی کے دمامے بجاؤ۔
اے ساقی سیم ساق میری اس محفل میں صراحی مے لا اور پیالے میں شراب ڈال تاکہ مجھے پیالے کی جوت میں میری پیاری کا چہرہ دکھلائیں
اس کے رخساروں میں جو سورج کے طبق جیسے ہیں شراب کے نقل رکھو اور پیاری کے محبت کے ہار پیارے کے گلے میں ڈالو۔
نبی کے صدقے میں قطب شاہ جلوے کے تخت پر بیٹھے ہیں اس لئے حوریں اور پریاں اور سہیلیاں مل کر ان کو آئینہ دکھاؤ۔

محمد قلی کے اصل شعر یہ ہیں ــــ

حیدر محل میں دائم حیدر کا جلوہ گاؤ — عرش آسماں دھرت پر نصرت طبل بجاؤ
لا سیم ساق ساقی مجھ بزم میں صراحی — پیالے کے جوت میانے سائیں صورت دکھاؤ
سورج طبق سے گالاں میں مے نقل دھرو تم — پیاری پرت کے ہار لے پیارے کے گل میں باؤ
صدقے نبی قطب شاہ جلوے کے تخت بیٹھے — حوراں، پریاں، سہیلیاں مل آرسی دکھاؤ

دکن میں جلوے کی رسم میں دولہا دولہن کو تخت یا چوکی پر ایک دوسرے کے مقابل یا برابر بٹھاکر صندل لگاتے ہیں۔ پھول پہناتے ہیں۔ میراثنیں گیت گاتی رہتی ہیں۔ طوائف ناچتی ہیں۔ باہر نوبت اور روشن چوکی بجتی ہے۔ دولہا اور دلہن ایک دوسرے کو مصری کے نقل کھلاتے ہیں اور ایک پیالے میں پانی یا شراب بھر کے اس میں یا آئینے میں دولہا کو دولہن کی اور دولہن کو دولہا کی صورت دکھائی جاتی ہے۔ تمام حاضرین دولہا دولہن

پر سے سونے چاندی کے سکے اتارتے یعنے صدقہ کرتے ہیں۔ یہ سب امور محمد قلی نے اپنی نظموں میں بیان کئے ہیں اور یہ سب رسوم دکن میں اب تک جاری رہے۔ البتہ اب رفتہ رفتہ ان میں کمی یا تبدیلی ہوتی جارہی ہے۔

جلوہ کی ایک اور نظم (صفحہ ۱۶۴) میں بھی بھاگ متی کا نام شروع ہی میں لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے ـــــ

"قسمت والی بھاگ متی کا جلوہ تم سب گاؤ اور اس کے سہاگ کی تعریف کے دائرے بجاؤ۔"

اصل شعر ہے ـــــ

بھاگنی بھاگاں کا جلوہ گاؤ تم — اس سہاگاں کے سبد بجاؤ تم

یہ بھی واضح رہے کہ لفظ بھاگ قسمت یا حصے کے معنے و مفہوم میں بھی محمد قلی قطب شاہ نے اپنی کلیات میں کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً

حق اپ پیرت کے تیئں دو جگ بنایا — بڑے بھاگ اس کے جو یہ پنتھ پچھانے

"یعنے خدائے تعالیٰ نے (نبی کے ساتھ) اپنی محبت کے ثبوت کے لئے یہ دونوں جگ بنائے ہیں۔ لیکن اس راہ کو پہچاننے والے قسمت والے ہی ہوتے ہیں۔"

ایک جگہ لکھتا ہے ـــــ

قطب شاہ بھاگی توے مندر چلا — ص ۱۶۵

ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ خدا نے تیری قسمت کے ستارے کو شرف بخشا ہے اس لئے تو اپنے روئیں روئیں کی زبان سے شکر ادا کر۔ شعر ہے ـــــ

ہر اک روم کی جیب سوں شکر کر — کہ تجھ بھاگ تارا شرف سوں بنایا

محمد قلی نے اپنی محبوبہ کے لئے بھاگ متی اور حیدر محل دونوں نام زیادہ تر مخفف کرکے یعنے بھاگ اور حیدر استعمال کئے ہیں۔ بے تکلفی اور پیار میں ایسا ہی کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا جلوہ کی نظم کے علاوہ کئی اور نظموں میں بھی اس نے بھاگ متی کے لئے بھاگ اور حیدر محل کے لئے حیدر لکھا ہے۔ ایسے اور دو شعر یہ ہیں ـــــ

رتن قطبا کے ہیں نرمول نیں کس شہر میں مول اس
لے کر آؤں جو تجھرا ہوے اس کا شہر حیدر میں

"یعنے قطب شاہ کے موتی (شعر) لاقیمت ہیں۔ کسی شہر میں ان کے صحیح دام نہیں مل سکتے۔ اگر حیدر محل کے شہر میں ان کی فروخت کی توقع ہو تو لے آؤں۔"

بریاں نظراں تھے اس اسپند اتارو — کہ حیدر نگر ان انداں بھرایا

یہ شعر صفحہ ۳۲۱ پر ایک نظم کے درمیان ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ـــــ

"نظر بد سے بچانے کے لئے اسپند کے دانے اس پر سے آتار کر جلاؤ کیونکہ حیدر محل کا شہر اس نے عیش و انند سے بھر دیا ہے۔"

بھاگ متی حیدر محل کے متعلق کلیات محمد قلی میں اتنے واضح اور اتنے زیادہ ثبوتوں کے بعد بھی کوئی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ کلیات میں ذکر ہی نہیں ہے۔

یوں تو محمد قلی نے خود ہی کہدیا تھا کہ اگر ہمارے بھید کو نہیں سمجھ سکتے ہو تو پھر ہمارے اور ہماری پیاری بھاگ متی کے درمیان مت آؤ (دیکھو مطبوعہ کلیات صفحہ ۳۱۲)

شاید ایسے ہی لوگوں کے جواب میں محمد قلی نے یہ شعر لکھا تھا۔

ہمارا بھید نیں بوجھتے نکو آؤ ہمارے اور پیا کے درمیانے

(۶)

شروانی صاحب کا یہ بیان کہ پرانے پل کی تعمیر کے وقت محمد قلی آٹھ برس کا تھا اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ پرانے پل کا مادۂ تاریخ "صراط مستقیم" تدخلہ کا محتاج ہے۔ پروفیسر شروانی کو شاید پورا قطعۂ تاریخ نہیں ملا۔ اس کا ایک اور مادۂ تاریخ "گذر گہہ ما" بھی ہے جس سے ۹۸۶ھ برآمد ہوتا ہے جب کہ محمد قلی کی عمر ۱۴، ۱۵ سال کی تھی۔ شروانی صاحب نے پرانے پل کی تعمیر کے مشہور و معروف مادۂ تاریخ کو چھوڑ دیا جس میں لکھا ہے کہ:

ز تحت او گذرد ماہ و ما براو گذریم ازیں سبب شدہ تاریخ او گذرگہہ ما
۹۸۶ھ

تلنگانہ کے دیہات میں اب بھی بھاگ متی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ حیدرآباد کے ایک قدیم اور مشہور محلہ ناگل چنتا میں آج بھی بعض لوگ ایسے ہیں جو خود کو بھاگ متی کے اہل قرابت اور خاندانی عزیزوں کی اولاد سمجھتے ہیں۔ اس کے بھائی کے نام محصول آبکاری معاف رہنے کے جو فرامین محمد قلی قطب شاہ نے جاری کئے تھے دس سال قبل تک نظامت آبکاری کی اسمثلہ میں موجود تھے اور غالباً اب بھی ہوں گے۔

بھاگ متی کا گنبد اس وقت بھی نہایت عمدہ حالت میں موجود ہے۔ اس کو خود محمد قلی قطب شاہ نے اپنے زیر تعمیر گنبد کے پہلو میں بنایا تھا جس میں بعد کو اس کے داماد سلطان محمد قطب شاہ نے اپنی دختر کلثوم بیگم کو (اس کی نانی کے پہلو میں) دفن کیا تھا اور اب یہ گنبد کلثوم بیگم کہلاتا ہے اور جمشید قلی قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے گنبدوں کے درمیانی میدان میں محمد قلی کے گنبد کے قریب احاطے میں موجود ہے اور اس کا کتبہ بھی اسی احاطۂ لنگر فیض آثار میں محفوظ ہے۔

بھاگ متی کو محمد قلی آخر وقت تک اتنا چاہتا تھا کہ اس کی وفات کے بعد دل گرفتہ ہو کر علیل ہو گیا اور پھر آخر تک سنبھل نہ سکا۔ اس عرصہ میں وہ باہر نکلنے کے بھی قابل

نہ رہا اور جو عمارتیں بن رہی تھیں ان کو دیکھنے کے لئے تڑپتا رہا۔ اس کے ملازمین کرسی پر لٹا کر اس کے آٹھ منزلہ محل کی چھت پر اس کو لے جاتے اور وہاں وہ اپنی مرحوم محبوبہ کی یادگار (شہر حیدرآباد) کی عمارتوں کو دیکھ کر خوش ہوتا اور نو تعمیر شدہ عمارتوں کی وضع قطع پر تبصرہ کرتا۔ اسی عالم اضطراب و مجبوری میں اپنی محبوبہ کے بعد دو ڈھائی سال کے اندر ہی وفات پاگیا۔ اس کے اس عالم کرب و بے چینی کے واقعات ایک فارسی مثنوی میں درج ہیں۔

ان سب واقعات اور ان کے ماخذوں تک پہنچنے کی کوشش ضروری تھی۔ ان تاریخی دلیلوں اور صریحی ثبوتوں کے اظہار کے بعد یقین ہے کوئی بھی بھاگ متی اور بھاگ نگر کے وجود سے انکار نہ کرے گا۔

اس بھمنی ہندو کا کس دھر کروں شکایت — نیں لکھے ہیں مورخ تاریخ اس حکایت
بے دام اس کا خدمت کرتا ہوں اپنے دل سوں — دیتے ہیں دام ان کو ہور کرتے ہیں عنایت
آساں اساساں تھے سب جنتاں سکھے ہیں تجہ بن — نیں ہے ثواب پانی دینا تمن ولایت
اس شہر کی سو ریتاں کن نا دیکھیا نہ سنیا — نا کوتوال قاضی ناکس کا ہے حمایت
یک چھن اگر نہ دیکھوں تجہ یاد کا جو شہلا — تجہ باج گمنا منجہ کوں مشکل اہے بغایت
تم یاد تھے ہوا ہے مومور منتے موتن — اب نا کریں تو ہم پر ہور کب کریں رعایت
کوئی نا سکے معانی آپ کی برت بیاں کر — پڑتا ہے اپنے دل میں سب دن علی روایت

(بھمنی ہندو) — محمد قلی قطب شاہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ

کے حالات زندگی، خدمات شعر و ادب، اس کے بنائے ہوئے شہر حیدرآباد، اس کی سلطنت اور اس کے خاندان سے متعلق قدیم فارسی و اردو کتابوں کے علاوہ گذشتہ بیس سال میں حسب ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں جو اس موضوع کی نسبت معلومات میں اضافہ کا باعث ثابت ہوں گی۔ ان میں سوائے چند کتابوں کے باقی سب کتابیں ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کی ہیں۔

۱۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ	مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب
۲۔ حیات محمد قلی قطب شاہ	مولفہ " " "
۳۔ تاریخ گولکنڈہ	" پروفیسر مجید صدیقی صاحب
۴۔ " " (بزبان انگریزی)	" " " " " "
۵۔ مقدمۂ تاریخ دکن	" " " " "
۶۔ حیات بخشی بیگم (دختر محمد قلی قطب شاہ)	" مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
۷۔ میر محمد مومن (پیشوائے محمد قلی قطب شاہ)	" ڈاکٹر زور صاحب
۸۔ سیر گولکنڈہ (نیم تاریخی افسانے)	" " "
۹۔ گولکنڈے کے ہیرے (نیم تاریخی افسانے)	" " "
۱۰۔ حیدرآباد (بچوں اور طلبہ کے لئے)	" ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ
۱۱۔ فرخندہ بنیاد حیدرآباد	" ڈاکٹر زور صاحب
۱۲۔ داستان ادب حیدرآباد	" " "
۱۳۔ مرقع دکن (سب رس کا دکن نمبر)	مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو
۱۴۔ نذر دکن	" محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ
۱۵۔ مسلمان شاہی خاندان اور ان کے سلسلے	" مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب
۱۶۔ محمد قلی کی جیون کہانی (بچوں اور طلبہ کیلئے)	مولفہ وقار خلیل صاحب
۱۷۔ معانی سخن (منتخب کلام محمد قلی قطب شاہ)	مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب

یہ سب کتابیں سب رس کتاب گھر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد سے مل سکتی ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

جلد (۲۲) شمارہ ۷و۸ جولائی و آگسٹ ۱۹۵۸ء

نگراں
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ
رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
جانکی پرشاد

سالانہ چندہ :- چھ روپے سکۂ ہند
ششماہی " :- تین روپے سکۂ ہند

قیمت : ایک روپیہ

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے "نیشنل فائن پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیرت آباد سے شائع ہوا۔

فہرست

غزلیں		نظر حیدرآبادی	۳
		سید صدیق حسن گرڈوی نازش پرتاب گڈھی	۴
		احقر کاشی پوری انوار ظہوری	۶
		شیخ فرید برہانپوری سید وحید اللہ شاہ قادری	۷
		دور آفریدی انعام قریشی بریلوی	۸
رباعیات		اختر رضوانی، ہما میرٹھی ابوسعد سید اسمعیل سید	۵
مضامین:-	رباعیات محروم	جناب امین چند شرما صاحب	۹
	مولانا محب حسین کی علمی، معاشرتی اور ادبی خدمات	محترمہ شکیلہ بیگم صاحبہ مشرف حسین صاحب	۱۶
	میاں ایم۔ اسلم کے تاریخی ناول	" نصیر الدین ہاشمی صاحب	۲۵
افسانے:-	ہائے زمانہ	" ظفر عالمگیر صاحب	۲۹
تبصرے		" سید رشید الحسن صاحب و " اکبر الدین صدیقی صاحب	۳۵
	نتیجہ اردو امتحانات منعقدہ جولائی ۱۹۵۸ء		۴۰

غزل

وہیں شامِ میکدہ تھی، وہیں صبحِ گلستاں تھی
وہ گذر گئے جدھر سے وہ ٹھہر گئے جہاں بھی

یہ ہے بات کیا مری جاں، کبھی نقشِ پائے منزل
کبھی سنگِ سجدہ مجھ کو ترا سنگِ آستاں بھی

تری سرد سرد آہیں، مرے گرم گرم آنسو
یہی حاصلِ تمنا، یہی سعیٔ رائگاں بھی

مجھے زندگی نے بخشا وہ کمالِ نے نوازی
کہ ادائے نغمہ ٹھہری مری کوششِ فغاں بھی

وہی رہ نورد اکثر ہوئے ہمکنارِ منزل
جو کبھی کبھی بدل دیں رہ و رسمِ کارواں بھی

مری روح ڈھونڈتی ہے کہیں اور اب پناہیں
کہ قفس سے کم نہیں ہے مجھے اپنا آشیاں بھی

مجھے کون جانتا ہے، مجھے کون مانتا ہے
کہ وطن کے ساتھ بدلی وہ نگاہِ دوستاں بھی

نظرؔ اور لطف آیا غمِ دل کی داستاں میں
ہوئی اس میں جب کبھی شامل تری شوخیٔ بیاں بھی

نظرؔ حیدرآبادی

سید صدیق حسن کرٹوی

یہاں ہر قدم امتحاں ہے
عجب کارگاہِ جہاں ہے

عیاں دل کا رازِ نہاں ہے
یہی عشق کی داستاں ہے

جہاں جرم ہے کم نگاہی
وہ مہر و وفا کا جہاں ہے

ہوں پابند ادراک لیکن
تلاشِ خدا لامکاں ہے

وہ اپنی جفاؤں پہ نازاں
مجھے اعتبارِ فغاں ہے

میں بیگانۂ کیف و کم ہوں
مجھے فکرِ سود و زیاں ہے

مرا عشق ہی بندہ پرور
مجازِ حقیقت نشاں ہے

وہی میری منزل ہے شاید
جہاں ہر زمیں آسماں ہے

انھیں خوش بیانی کا ہے زعم
مجھے زعمِ عجزِ بیاں ہے

نازش پرتابگڈھی

آپ کے التفات کا غم ہو
اتنی چھوٹی سی بات کا غم ہو

دل تو ہے صرف اپنی ذات کا غم
تم مگر کائنات کا غم ہو

آج ان آنکھوں کی بات یاد آئی
آج کس کو حیات کا غم ہو

میں فراموش کر دوں اور تم کو
تم کو میری حیات کا غم ہو

جن پہ میں بھی یقیں کر نہ سکا
کس کو ان سانحات کا غم ہو

عشق سے یہ مذاق ٹھیک نہیں
تم کو اور واردات کا غم ہو

بد دعا ہے مرے تغزل کی
تجھ کو نازش حیات کا غم ہو

رُباعیات

کچھ لوگ کدورت کے لئے مرتے ہیں
بے فائدہ شہرت کے لئے مرتے ہیں
آتی ہے مصیبت پہ مصیبت پھر بھی
ہم ہیں کہ محبت کے لئے مرتے ہیں

●

چتون کی پناہیں ہیں تو لغزیدہ قدم
لب پر آہیں ہیں تو لغزیدہ قدم
وہ یوں بھی مرے دل میں سما جاتے ہیں
دزدیدہ نگاہیں ہیں تو لغزیدہ قدم

اختر رضوانی

بھولے سے کسی دل کو دکھاؤ نہ کبھی
اللہ کا گھر ہے اسے ڈھاؤ نہ کبھی
گر کعبۂ دل میں بھی ہزاروں بت ہوں
قرآں کی قسم اس کو مٹاؤ نہ کبھی

●

ہر روز نئے چلتے ہیں سر پہ آرے
افلاس کے رکتے ہی نہیں ہیں دھارے
آتا ہے یہی جی میں کہ خنجر گھونپوں
ان سینوں میں جو عیش کے ہیں پشتارے

●

ناکام بھی کامیاب ہو سکتا ہے
قطرہ بھی دُرِ خوشاب ہو سکتا ہے
قدرت کے لئے کیا ہے ہما ناممکن
ذرّہ بھی آفتاب ہو سکتا ہے

ہما میرٹھی

ایسا نہیں کوئی جو پریشان نہیں
اس دور میں انسان کی پہچان نہیں
جیسی بھی گزر رہی ہے گزارو سیّد
آرام کا اب یاں کوئی امکان نہیں

ابوسعد سید اسمٰعیل سیّد

احقر کاشی پوری

محفلِ رقص خُم و جام سے آگے نہ گئے
وحشی اب تک روشِ عام سے آگے نہ گئے

کچھ حقیقت بھی جھلک جاتی ان افسانوں میں
اہلِ گلشن قفس و دام سے آگے نہ گئے

جانے کیا سوچ کے اربابِ خرد بھی آخر
حلقۂ گیسوئے اصنام سے آگے نہ گئے

تم سے پیمانِ مسافت تھا مگر میرا نصیب
تم بھی گردشِ گہِ ایام سے آگے نہ گئے

خضر نے بڑھ کے وہ سمجھائے نشیب اور فراز
قافلے راہ پہ دو گام سے آگے نہ گئے

جن کی تاریک نگاہوں میں نہ فردا ہے نہ دوش
عشرتِ بادۂ گلفام سے آگے نہ گئے

چند موہوم سی یادوں کی بقا کی خاطر
ہم سوادِ سحر و شام سے آگے نہ گئے

منزلیں آج نگاہوں میں لئے بیٹھے ہیں
جو کبھی راہ پہ دو گام سے آگے نہ گئے

وقت نے کتنے چراغوں کی لویں اکسائیں
بے بصر ظلمتِ اوہام سے آگے نہ گئے

چاک کرنا تھا جنھیں پردۂ شب اے احقر
تب و تابِ شفقِ شام سے آگے نہ گئے

انوار ظہوری

کہاں مجھ کو اندیشۂ تیرگی ہے
مرے دل میں خورشید کی روشنی ہے

نہ احساسِ غم ہے نہ فرطِ خوشی ہے
عجب عالمِ شوق میں زندگی ہے

اٹھی تھی جو حسنِ نظر آفریں پر
نظر وہ نہ جانے کہاں کھو گئی ہے

اب اس انجمن سے کہیں اور چلئے
عدو آدمی کا جہاں آدمی ہے

نہ راہوں سے واقف نہ آگاہِ منزل
کوئی بیخودی سی مری بیخودی ہے

سلامت مرے جذبۂ دل کا تاثر
یہ مانا کہ وہ مائلِ بے رخی ہے

غمِ عشق نے رنگ اپنا جمایا
کہاں آپ کے رخ پہ وہ تازگی ہے

یہ شادابیاں اور یہ سبزہ و گل
کہ آنکھوں میں شکلِ بہاراں کھچی ہے

بتا دیجئے یہ مجھے بے تکلف
طبیعت کسی پر اگر آ گئی ہے

میرے شعر انوار تصویرِ غم ہیں
میری شاعری میر کی شاعری ہے

شیخ فرید برہانپوری

ضبطِ غم کے آستاں پر سر جھکانا ہی پڑا
دل اگرچہ رو رہا تھا، مسکرانا ہی پڑا

دل کی بیتابی تو اہلِ دل سے لیتی ہے خراج
وائے مجبوری کہ تیرے در پہ آنا ہی پڑا

ختم ہوتا ہی نہ تھا افسانۂ وہم و گماں
عزم کو راہِ یقیں پہ آزمانا ہی پڑا

دل کہ جس کو حاصلِ کون و مکاں سمجھا تھا میں
تیری نظروں کے اشاروں پر لٹانا ہی پڑا

زخمِ کاریٔ غمِ اہلِ جہاں کے باوجود
تیرے غم کو اپنے سینے سے لگانا ہی پڑا

جب کبھی جشنِ چراغاں میں کمی پائی گئی
آنسوؤں کی انجمن کو جگمگانا ہی پڑا

[illegible] جذبِ نگاہِ شوق کا عالم فرید
کو اپنا ہر اک جلوہ دکھانا ہی پڑا

سید وحید اللہ شاہ قادری

آفاق پُر از فتنہ و آلام ہے ساقی
ہاں! چھاؤں میں میخانہ کی آرام ہے ساقی

آغوش میں جب سے وہ گل اندام ہے ساقی
رنگین مری ہر سحر و شام ہے ساقی

ہر حکم جو رندوں کو نظر سے اسے باندھیں
بکھرا ہوا شیرازۂ ایام ہے ساقی

مستی میں بھی کانٹوں میں الجھنے نہیں پاتا
یوں ہاتھ میں اب دامنِ انجام ہے ساقی

محفوظ اسی میں ہے دو عالم کی جوانی
یہ دل بھی تری بزم کا وہ جام ہے ساقی

ہر لمحہ گل افشاں ہو، نظر ایسی عطا کر
یوں شعلہ نگاہی تو بہت عام ہے ساقی

مینا و صراحی ہیں اداؤں کے تمثل
مۓ خانہ جوانی کا ترے ہی نام ہے ساقی

خورشید کو پیمانوں میں تاروں کے انڈیلا
گیسو کی ترے شام بھی کیا شام ہے ساقی

یہ وقت کے دھاروں کو پلٹ دیتے ہیں اکثر
آئینِ خرابات کا وہ کام ہے ساقی

اک موجِ طبیعت ہے خرابات کی تخلیق
خود جام ہے، خود بادۂ گلفام ہے ساقی

جب برقِ نظر گھول کے خود تو نے پلا دی
مستوں کو ترے طور سے کیا کام ہے ساقی

بس اک نگہِ خاص تری اس پہ رہی ہے
ورنہ یہ وحید آج بھی گمنام ہے ساقی

دور آفریدی

یہ فرقت کے غم اور مسلسل مسلسل
کہیں ہوش والے نہ ہو جائیں پاگل

زمانے کو چپ بھی گوارا نہیں ہے
مچا دوں اگر میں زمانے میں ہلچل

یہ اودی گھٹائیں، یہ بدمست جھونکے
اٹھا لائیے گا ذرا آپ بوتل

نگاہیں گئیں دور تک ساتھ دینے
نگاہوں سے ہونے لگے جب وہ اوجھل

ٹپکنے لگیں میری آنکھوں سے بوندیں
کہیں گھر کے آئے فلک پر جو بادل

جہاں مل گئیں ان کی نظروں سے نظریں
وہیں ایک سجدہ! وہیں ایک بوتل!

یہ بربادیاں اور ان پر تبسم
کہ اے دورؔ نزدیک ہے آج سے کل

انعام قریشی بریلوی

جا رہا ہوں سوئے رہگذارِ جنوں
کیا کروں اپنی فطرت سے مجبور ہوں

اے غمِ زندگی اتنی مہلت تو دے
میں کچھ انجامِ سوزِ دروں سوچ لوں

میری بربادیاں بے سبب تو نہیں
لیکن اے بزمِ دل کس کو الزام دوں

دل ہے مجبورِ آدابِ دار و رسن
داستانِ غمِ زندگی کیا کروں

بخش دی تو نے ہر لذتِ زندگی
اے نگاہِ ستم تیرا مشکور ہوں

جس کی آغوش وا ہو جہاں کے لئے
اس محبت کا میں بھی پرستار ہوں

جب سے تیری نگاہِ ستم پھر گئی
اہلِ دل ہو گئے بے نیازِ سکوں

اب تو انعامؔ اتنی بھی جرأت نہیں
اپنے دل پر بھی کچھ تبصرہ کر سکوں

رباعیات محروم

از:- جناب امین چند شرما صاحب (ایم اے) پروفیسر جہاکوشل مہاودیالہ جبلپور

حضرت محروم دورِ حاضر کے شاعروں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے بلند پایہ اور اساتذۂ سخن میں ہے۔ محروم کو شعر و شاعری سے طبعی دلبستگی ہے۔ یہ ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ ایک انگریزی مقولہ کے مطابق "شاعر پیدا نہیں کیے جاتے بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔" محروم کی ذات اس مقولے پر پوری اترتی ہے۔ انھوں نے کسی کے سامنے زانوئے شاگردی طے نہیں کیا اور ان کی شاعری کسی کی اصلاح کی مرہونِ منت نہیں۔

فارسی میں بیسیوں ایسے شاعر گذرے ہیں جنھوں نے محض رباعی گوئی کی بدولت لازوال شہرت حاصل کی ہے۔ شیخ ابو سعید، خیام، افضل کاشانی، سحابی اور سرمد کی عالمگیر شہرت صرف رباعی کی بناء پر ہے۔ اردو میں اگرچہ غزلوں اور مثنوی کے مقابل رباعی گو شعرا کو وہ رتبہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق ہیں۔ پھر بھی ہم بعض رباعی گو خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں جن میں سے ایک محروم بھی ہیں۔

رباعیات محروم کی اشاعت سے اردو شاعری اور خصوصاً اردو رباعیوں کے ذخیرے میں ایک گرانقدر اضافہ ہو رہا ہے۔ جنابِ محروم کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ آپ اس عہد کے بڑے اہم اور ممتاز رباعی نگاروں میں سے ہیں۔ حضرت محروم بقول اکبر الہ آبادی دادِ سخن کے مستحق ہیں۔

ہے داد کا مستحق کلام محروم — لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز — ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

حضرت محروم کی رباعیات پیش کرنے کے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم سر شیخ عبدالقادر اور حضرت جوش ملیح آبادی نے جو خیالات محروم کے متعلق ظاہر کیے ہیں وہ درج کیے جائیں۔

سر شیخ عبدالقادر مرحوم کی بیش قیمت رائے حضرت محروم کی شاعری کے متعلق قارئین ملاحظہ فرمائیں اور ان کی سخنوری کی داد دیں۔

"بڑے بڑے سخنوروں نے ان کی شاعری کو سراہا ہے اور ان کے حسن بیان کی تعریف کی ہے۔ الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی، خیالات کی پاکیزگی حضرت محروم کے اشعار کی خصوصیات ہیں۔ مگر ان کی شاعری کا خاص وصف جو مجھے خاص طور پر پسند آیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں صلح و محبت کی تلقین ہے۔ ایک اور چیز جو ان کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے وہ کیفیت غم ہے۔ محروم کی درد بھری طبیعت دوسروں

غم کے درد کو بھی معمول سے زیادہ محسوس کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے بعض ہمعصروں کے لیے وقت انتقال پر آنسو بہائے ہیں جن میں سچی محبت اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شاعر صرف تصویر غم کھینچنے ہی میں استاد ہے۔ قوت بخش خوشی کے مناظر دکھانے سے بھی قاصر نہیں۔

طبع زاد نظموں کے علاوہ محروم کی ہمہ گیر طبیعت نے چمن اردو کی آرائش کے ہر باغ سے پھول لئے ہیں۔ انگریزی میں شیکسپیر کے ڈراموں سے بعض دلچسپ اشعار ترجمے کے لئے انتخاب کئے ہیں اور ان کو اردو لباس ایسی خوبی سے پہنایا ہے کہ ان میں سے کئی پہچانے نہیں جاتے کہ اصل میں یہ انگریزی نثر ہیں۔ محروم نے چونکہ عمر بھر محکمہ تعلیم میں بسر کی ہے۔ اس لئے خود ان کے کلام میں بہت سے حصے جوانوں اور بچوں کے لئے نصیحت آمیز ہیں۔ آجکل نقادان فن کا میلان اس رائے کی طرف ہے کہ نصیحت آمیز شاعری اصلی معنوں میں شاعری نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک شاعری جذبات کے طوفان بے پایاں کا نام ہے۔ یا تخیل کی نزاکتوں اور معنی آفرینیوں کا۔ البتہ اگر کوئی استاد معمولی مضامین میں بھی اپنی کاریگری سے رنگ بھر دے تو وہ پند آمیز کلام کا رتبہ بلند کر دیتا ہے۔ محروم جا بجا اس فن میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جناب محروم ان ہندو ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی عمر بھر کی محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے جس سے دونوں کو فائدہ اٹھانے کا حق ہے اور جس کی خدمت دونوں کے ذمے ہے۔ خدا کرے آپ دیر تک اردو کی خدمت کے لئے زندہ سلامت رہیں۔"

آخر میں جوش ملیح آبادی کی قیمتی رائے پیش کرنا لازمی ہے ــــ

"مجھے یقین ہے کہ یہ رباعیاں بعض مقامات پر اپنی "روحانیت" کے باوجود اردو کے سنجیدہ ادب میں جو بہت قلیل ہے ایک گراں بہا اضافہ کر دیں گی اور ان حضرات کو لطف اندوز ہونے اور فائدہ اٹھانے کا بھرپور موقع دیں گی جو بجا طور پر اس کا یقین رکھتے ہیں کہ شاعری حیات انسانی کو آرائش، آسودگی اور استواری کی دولت بخش سکتی ہے۔

ہر چند ان میں اکثر و بیشتر رباعیاں شاعر محروم کو "صلاح کار" محروم کے روپ میں پیش کر رہی ہیں اور ہر چند ع "صلاح کار کجا و من خراب کجا" کا نعرہ بھی اپنی جگہ درست و اہم ہے۔ پھر بھی چوں کہ حضرت محروم ایک پختہ شاعر ہیں اس لئے ان کی شان اور ان کی آن بان میں کوئی فرق نہیں آ سکا ہے اور وہ اس جامۂ صلاح میں بھی خوش وضع و خوش قطع نظر آ رہے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جسے جامہ زیبی کی انتہا کہا جاتا ہے ـــــ من انداز قدت را می شناسم ـــــ"

رباعی ایسی صنف ہے جو تخیل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے۔ اس صنف کی تخلیق اس غرض سے ہوئی ہے کہ پختہ زندگی کے ژولیدہ و وسیع تجربات کو ہموار کر کے اور رسیدہ فکر کے عجیب و عمیق افکار کو ترتیب دے کر قلیل، لیکن بے حد جگر دار الفاظ کی معرفت ایسے استادانہ اختصار اور ایسے حکیمانہ لہجے میں ادا کیا جائے کہ اس کے اجمال کے آستانۂ جمال پر تفصیل کا جلال سر بسجود ہو کر رہ جائے اور جو شاعر کہ حضرت محروم کے مانند خسرو مشق و دارائے نظر نہ ہو اسے لیلائے رباعی کی پابوسی سے محروم کر دیا جائے۔ بہر حال اردو نظم کا

ذخیرۂ رباعی کے مجموعوں سے خالی نہیں۔ میر انیس نے بہت رباعیاں کہیں اور ایسی کہیں کہ رباعی کہنے کا حق ادا کیا۔ ان کے ہاں اکثر چوتھا مصرع رُباعی کو چوتھے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ حالیؔ مطلب سے مطلب رکھتے تھے۔ ان کی رباعیاں ان کے اصلاحی مفہوم کی پوری عکاسی کرتی ہیں۔ اکبرؔ اپنے رنگ میں چوکھے ہیں۔ رواںؔ لکھنوی اور اثرؔ صہبائی کے ہاں شباب کے ولولے، جذبات کی بے تابی کے ساتھ حسنِ ادا اور خیالات کی بلندی بھی موجود ہے۔ حضرت امجدؔ کی رباعیات تصوف، اخلاق اور فلسفہ کی حامل ہیں۔

محرومؔ صاحب دنیائے ادب میں تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ اردو ادب کی دنیا میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں جس کی وقعت اور عظمت سب کو تسلیم ہے۔ آپ کی طبیعت ہمہ گیر اور آپ کا تخیل بلند و مستحکم اور بیان دل کش ہے۔ آپ کا شمار ان اساتذہ میں ہے جن کی غائر نظر حال اور مستقبل تک پہنچتی ہے۔ حسنِ ترکیب، ندرتِ خیال، سادگی و سلاست زبان، چستیٔ بندش، جدتِ اسلوب، نزاکت، بلندیٔ تخیل، شوکتِ الفاظ، شوخی و خوبیٔ محاورہ، صحتِ روزمرہ، حقیقت نگاری، منظر کشی، جوش و جذبہ، صنائع و بدائع، تنوع، خوش مذاقی، علمیت، فلسفۂ حیات، مسائلِ زندگی الغرض کسی چیز کی کمی نہیں۔ انھوں نے ہر رنگ میں اور ہر موضوع پر شعر کہے ہیں۔

محرومؔ کے کلام میں تصنع اور آورد مطلقاً مفقود ہیں۔ وہ حقیقت اور فطرت کے پرستار ہیں۔ روانی اور سلاست ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ الفاظ کی موزونیت اور محاورہ کی برجستگی ان کے اشعار میں جا بجا نمایاں ہے۔ صفائیٔ کلام اور پختگیٔ مشق بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ فنِ شاعری کے استاد ہیں اور بحور و اوزان پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ عروض و قوافی میں انھیں پوری دسترس حاصل ہے۔ خیال کی پاکیزگی، بیان کی روانی، عام جذباتِ انسانی کی ترجمانی، اخلاقی تلقین اور حسنِ فطرت کی نقاشی محرومؔ کی رباعیات کی اہم خصوصیات ہیں۔ آپ کی ذہنیت توازن اور آپ کا شعور اعتدال سے مزین ہے۔ جن اوصاف اور اقدار کی رباعی کے لئے ضرورت ہے وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اور کلام کی طرح رباعیاں بھی نہایت پسند کی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات، قادرِ مطلق کاہ سے ماہ تک حکمراں ہے۔ خداوند کریم مشکل کشا ہے۔ بجز ذاتِ کبریا کوئی سہارا رہنما نہیں ہے۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر کمال و زوال میں مدد رساں ہے۔ "آہ" اور "واہ" دونوں میں اس کا عکس موجود ہے۔ متقی و مجرم ہر دو اس غفور کی رحمت کے طالب ہیں۔ محرومؔ صاحب ابتدا میں پروردگارِ عالم کی حمد و مناجات اس طرح کرتے ہیں کہ صدقِ نیت، یقینِ محکم و اعترافِ گناہ کا بین ثبوت ملتا ہے۔

ہر راہ میں ہے راہ نما نام ترا
ہر آہ میں ہے عقدہ کشا نام ترا
تسکیں میں ترا خیال تسکیں افروز
اندوہ میں اندوہ ربا نام ترا

اور

مجرم ہوں، سیاہ کار ہوں، رحمت کر
عاجز ہوں، گنہگار ہوں، رحمت کر
حاضر ترے در پہ اے خداوندِ کریم!
با دیدۂ اشکبار ہوں، رحمت کر

محروم مشرقی تمدن کی پیداوار ہیں اور ادبی و قومی، اصلاحی تحریک میں اکبر الہ آبادی کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں۔ کئی رباعیوں میں تعلیم نسواں اور عورتوں کی بے باکی و بے حجابی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان کے یہاں غم و یاس کی عکاسی بھی کہیں کہیں ملتی ہے۔ پھر بھی بہ حیثیت مجموعی ان کی رباعیات کا انداز مصلحانہ ہے۔ درج ذیل رباعی اس بات کی دلیل ہے۔

دنیا نے عجب رنگ جما رکھا ہے
ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے
اس عالم آب و گل میں کیا رکھا ہے

رباعیات محروم کا شاعرانہ معیار بہت بلند ہے۔ فلسفہ، اخلاق، مذہب اور روحانیت کے وہ نکتے جنھوں نے فارسی رباعیوں کو اس قدر پر معنی بنایا ان میں جا بجا ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ــــ

دروازۂ نجات کا بیاباں میں نہیں
دل کا آرام قصر و ایواں میں نہیں
تسکین جنت میں بھی نہیں مل سکتی
جب تک موجود قلب انساں میں نہیں

دم اکثر پارسائی کا بھرتا ہے
حیراں ہوں کہ دل مرا یہ کیا کرتا ہے
خوف اس کو گناہ سے نہیں ہے لیکن
الزام گناہ سے بہت ڈرتا ہے

انکار گناہ بھی کئے جاتا ہوں
تکرار گناہ بھی کئے جاتا ہوں
حاصل ہو ثواب مفت، اس لالچ میں
اقرار گناہ بھی کئے جاتا ہوں

ظاہر میں قضا بہت ستم ڈھاتی ہے
جاں مفت کے اجل کا نام دھرجاتی ہے
لیکن ہر موت کا نتیجہ ہے حیات
ہر شام پیام صبح نو لاتی ہے

بدخواہ نہیں خالق اکبر اپنا
غائب ہو کر بھی ہے وہ رہبر اپنا
ہم خود ہیں برے تو ہے مقدر بھی برا
اچھے ہیں تو اچھا ہے مقدر اپنا

ادبار کا گھر کہ جائے اقبال ہے دہر
جیسا نظر آتا ہے بہر حال ہے دہر
کیوں زشتیٔ دہر پہ ہے برہم اتنا
ناداں ترا آئینۂ اعمال ہے دہر

آئینۂ دل کو گرد کیں سے رکھ صاف
کر دے اہل ریا کے کینوں کو معاف
دنیا میں نہ کر کسی سے بے انصافی
دنیا سے مگر نہ رکھ امید انصاف

محروم کو اپنی زندگی میں بہت سے جانکاہ صدمے دیکھنے پڑے ہیں جن کی بدولت اظہار یاس و الم ان کے کلام کا ممتاز جوہر بن گیا ہے۔ رباعیات میں بھی بعض جگہ اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ــــ

درکار جگر تھا زخم کاری کے لئے
تیار نہ تھا جگر فگاری کے لئے
محروم! خوش اس کو کس طرح میں رکھتا
جو عمر ملی تھی سوگواری کے لئے

حیراں ہوں کیا کیا خدایا میں نے
بے فائدہ عمر کو گنوایا میں نے
پیری بھی قریب خاتمہ آ پہنچی
منزل کا نشاں ابھی نہ پایا میں نے

کب کوئی جہاں میں چھوٹتا ہے غم سے
دل آخر کار ٹوٹتا ہے غم سے
صدمات سے کھلتی ہیں بستر کی آنکھیں
پھوڑا غفلت کا پھوٹتا ہے غم سے

بلند آہنگی اور لفظی گورکھ دھندے سے آپ ہمیشہ دور دور رہے۔ چنانچہ ان کا نشان آپ کی رباعیوں میں بھی نہیں ملے گا۔ دقتِ نظر اور معنویت کی آپ کے ہاں کمی نہیں۔ چند رباعیاں اِدھر اُدھر سے اٹھا کر یہاں پیش کی جاتی ہیں۔
بندگی کے احساس کے ساتھ جذبۂ خودی کے تیور ملاحظہ ہوں ــــ

زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے — یہ ڈوب کے ہیں پار اترنے والے
بے خوف وہی ہیں جن کو ہے خوف ترا — کس سے ڈرتے ہیں تجھ سے ڈرنے والے

آجکل کے تمدن میں انسان جس حالت کو پہنچا ہے اس کا نقشہ کس صفائی اور سچائی سے کھینچا ہے ــــ

حاصل کتنا کمال انساں نے کیا — افلاک کو پائمال انساں نے کیا
یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ ۔ کیوں — انساں کو تباہ حال انساں نے کیا؟

اور

ہے رحم و کرم سے آج بیزار انساں — انساں سے ہے خود برسرِ پیکار انساں
دنیا کو بنا دیا ہے دوزخ اس نے — کس منہ سے ہے جنت کا طلب گار انساں

اخلاق احسن کے باب میں کیا خوب کہا ہے ــــ

آئینۂ دل کو گردِ کیں سے رکھ صاف — کر دے اہلِ ریا کے کینوں کو معاف
دنیا میں کسی سے کر نہ بے انصافی — دنیا سے مگر نہ رکھ امید انصاف

دنیا کو اس کی خرابیوں کی وجہ سے برا نہیں کہا بلکہ اور کسی کو ملزم ٹھہرایا ہے ــــ

دنیا تھی یہی صدق و صفا کی دنیا — رحم و کرم و مہر و وفا کی دنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو — جور و ستم و کذب و ریا کی دنیا

فکر و نظر کی وسعتیں ملاحظہ ہوں ــــ

کھلتا یہ رازِ علم و حکمت پہ نہیں — جب تک کرمِ خاص بصارت پہ نہیں
معلوم ہوا ہے بعد فکرِ بسیار — پردہ آنکھوں پہ ہے حقیقت پہ نہیں

تقدیر کا رونا کون نہیں روتا مگر آپ کا نقطۂ نظر عالمانہ ہے ــــ

کیوں سب کو سنائیں حالِ ابتر اپنا — جب اس میں قصور ہو سراسر اپنا
ہم کوستے ہیں عبث مقدر کو ندیم — اعمال سے بنتا ہے مقدر اپنا

اور

پاداشِ عمل کی ہے یہ منزل اے دوست — قدرت کا ہے انتظام کامل اے دوست
اعمالِ بد اپنے بھول جاتے ہیں ہم — قدرت ان سے نہیں ہے غافل اے دوست

جبر و اختیار بہت پامال مسئلہ ہے۔ آپ نے اس میں ندرت کا رنگ چمکایا ہے۔

مختار تھا۔ کر گیا جو دل کو بھایا — ہو کر مجبور پھل بھی اس کا پایا
یوں جبر سے اختیار مغلوب ہوا — یوں عالمِ اختیار میں جبر آیا

مذہب کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے ـــــ

مذہب کی زباں یہ ہے نکوئی کا پیام — حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی — مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے جو بدعنوانیاں ہماری تہذیب و تمدن میں داخل ہونے لگیں۔ ان کی شکایت اس طرح کرتے ہیں۔

تغیر پسند ہے زمانے کا مزاج — تبدیل ہوئے جاتے ہیں سب رسم و رواج
پہلے تھا جنونِ عشق عریانی کوش — برہم زنِ ہوش حسن عریاں ہے آج

یہ مانتے ہیں کہ ـــــ

اس دور کمالات میں پسپا ہوں میں — نقشِ قدم قدم کا جویا ہوں میں
سائنس کی تم ترقیاں گنواؤ — انساں کی مصیبتوں کو گنتا ہوں میں

محروم صاحب خیر سے بڑے زاہد خشک نہیں ہیں۔ کس تڑپ کے ساتھ کہتے ہیں ـــــ

جب کالی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں — ساون کا گیت کوئلیں گاتی ہیں
تب یاد میں گزری ہوئی برساتوں کی — آنکھیں مری سیلِ اشک برساتی ہیں

کوئی یہ نہ سمجھے کہ محروم صاحب "ادب برائے زندگی" کے قائل نہیں۔ یہ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں ـــــ

آٹا مصنوعی اور گھی مصنوعی — مل جاتے ہیں دودھ اور دہی مصنوعی
مصنوعی ہیں زندگی کے سارے ساماں — کیونکر نہ ہو اپنی زندگی مصنوعی

اور ـــــ

ہرگز نہیں دوربیں نگاہِ انساں — روشن تقدیر پر ہے راہِ انساں
تقدیر نے گندم کو کیا ہے کم یاب — گندم تھی باعثِ گناہِ انساں

محروم کی رباعیاں ان کی ادھیڑ عمر کا کلام ہیں اس لئے ان میں عشقیہ یا ظریفانہ عنصر موجود نہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے نئی تہذیب خصوصاً فرقہ نسواں کی بے حجابی اور بے باکی پر نفریں کی ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ نوجوان طبقے کے لئے ان کے خیالات قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ صرف وقتی تاثیر ہے۔ اخلاق اور حکمت عملی کی جو صداقتیں انھوں نے بیان کی ہیں خواہ کسی کو اچھی لگیں یا نہ لگیں لیکن آ ہر پھر کر وہی انسانی زندگی کا دستور العمل بنتی ہیں۔

دنیا میں معاشرت کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ ادب کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ لوگوں کے ذوق پسند بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن ادب کے وہ کارنامے جو جاندار ہوں اور شعور کی سچائی کا جوہر رکھتے ہوں ا کی قدر اور وقعت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ لوگ شاعر کو بھول جاتے ہیں مگر اس کے شعر گنگناتے رہتے ہیں۔ ام ہے کہ صحیح مذاقِ سخن رکھنے والے محروم صاحب کے ادبی کارناموں سے ہمیشہ مستفید رہیں گے اور اردو نظم میں ا اضافہ کو مبارک سمجھا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ جناب محروم کی رُباعیاں ان کے دوسرے کلام کی طرح بہت جلد دلوں کو مسخر ...یں گی۔ غرض حضرت محروم کی رباعیات زندگی کے کئی پہلوؤں پر محیط نظر آتی ہیں۔ جو رباعیات پیش کی گئی ہیں ...ہ ان کی طبع زخار کے چند گوہر پارے ہیں۔ ان جواہر ریزوں کو جو حیات کے اکثر مسائل پر حاوی ہیں چند صفحات ...ں ظاہر کرنا مشکل ہے۔

...فی البدیہہ بھی رباعی کہتے ہیں چنانچہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ وقار انبالوی نے یونہی باتوں میں آئے ...ا اس جنگ کا انجام کیا نظر آرہا ہے قبلہ محروم صاحب ایک آدھ منٹ خاموش رہے پھر یہ رباعی عرض کی۔

ہو لاکھ مئے خودی سے شمشاد سرمست ہو جائیں گے اس کے حوصلے آخر پست
جب گھر میں خوراک ختم ہو جائے گی کیا کھائے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

حضرت محروم کی رباعیات سوز و گداز، یاس و الم، دقتِ نظر اور معنویت سے مملو نظر آتی ہیں۔ فلسفہ، ...ملاق، مذہب اور روحانیت کے نادر مسائل کے موزوں حل بھی پیش کرتی ہیں۔ ایک حقیقی و فطری شاعر کا ...ام اس کی اپنی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ آپ کے کلام سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک صلاح کار، غمزدہ ...اثر میں اور پاک باطن انسان ہیں۔ وہ زبان اور خیال دونوں کے اعتبار سے ایک عظیم شاعر ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کی زیر طبع کتابیں

۱۹۵۸ء میں جنوری سے اب تک ادارے نے ارمغان محمد قلی قطب شاہ، محمد قلی کی جیون کہانی از وقار خلیل صاحب، نذر محمد قلی قطب شاہ شائع کی ہیں۔ اس وقت حسب ذیل کتابیں چھپ رہی ہیں جو عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آجائیں گی۔

۱۔ تذکرہ مخطوطات جلد چہارم — از ڈاکٹر زور صاحب
۲۔ ہیلینا (ڈرامہ ترجمہ فاوسٹ) — " فضل الرحمن صاحب
۳۔ دیوان داؤد اورنگ آبادی — " خالدہ بیگم صاحبہ (ایم۔ اے)
۴۔ معانی سخن (انتخاب کلام محمد قلی قطب شاہ) — " ڈاکٹر زور صاحب
۵۔ شیرازۂ پریشاں (تذکرہ شعرائے حیدرآباد) — " خواجہ حمید الدین صاحب شاہد

مولانا محب حسین صاحب کی علمی، معاشرتی، ادبی خدمات

از:- محترمہ شکیلہ بیگم صاحبہ جناب مشرف حسین صاحب سابق ایڈیٹر رسالہ "ارم"

جن دنوں شمالی ہندوستان میں سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے رفقاء کار مسلمانوں میں تعلیم و تربیت پھیلانے اور اصلاح قوم کے مساعی میں سرگرم تھے انھیں دنوں دکن میں مولانا محب حسین صاحب علوم و فنون پھیلانے، سیاسی شعور پیدا کرنے، قوم سے مضر رسم و رواج، غلط خیالات و افکارات دور کرنے میں خصوصاً عورتوں کی اصلاح اور ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پردۂ نسواں کے اٹھانے کی کوشش میں منہمک تھے۔ سرسید صاحب مرحوم کو جماعت اور گورنمنٹ کی امداد اور سرپرستی حاصل تھی مگر مولانا محب حسین تن تنہا تھے۔ نہ ان کی کوئی جماعت تھی اور نہ گورنمنٹ سے کوئی امداد۔ اس کے علاوہ ان کو اپنی معاش کے لئے سرکاری ملازمت بھی کرنی پڑتی تھی۔ ایسی حالت میں اصلاح قوم کا بیڑا اٹھانا اور مخالفتوں کا تنہا مقابلہ کرنا آسان کام نہ تھا جیسا کہ ان کی اس رباعی سے ظاہر ہے۔

بوچھار تھی گالیوں کی ہر سمت تھا تفنگ .... تھی شمشیر پانگ
بتیس ۳۲ برس دیو سے پردے کے لڑا یہ جنگ بھی تھی جرمن و انگریز کی جنگ

آپ کی اس جدوجہد سے ظاہر ہوتا کہ ایک غریب شخص تنہا قوم کی حقیقی خدمت کرنا چاہے وہ باوجود سخت مخالفت اور دشواریوں کے کس طرح مسلسل پچاس برس تک قوم کی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا کام وہی شخص کرسکتا ہے جس کو نہ جلب منفعت کا خیال ہو اور نہ قوم کی تحسین و آفریں کا۔ یہی حال مولانا کا تھا۔ آپ نے قومی کام کو اپنا فرض قرار دے لیا تھا اس پر وہ نابینائی میں بھی دم واپسیں تک ثابت قدم رہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب مولانا کی اس جد و جہد کی نسبت فرماتے ہیں:- "حیدرآباد کی اندھیری رات میں ایک نمود حیات' ایک نفس گرم' ایک ٹوٹا ہوا تارا مولوی محب حسین مرحوم کی انفرادیت بھی تھی۔ ان کی پوری عمر ایک قدامت پرست اور رجعت پسند حیدرآباد میں تجدید اور ترقی کے لئے بازیاں لگاتے' شکستیں کھاتے اور مصیبتیں اٹھاتے گذری لیکن کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کی یہ شکستیں ہمارے لئے یا ہمارے بعد آنیوالی نسلوں کے لئے نوید کار نہیں ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا پیام ایک دن ہمارے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام نہ بن جائے گا"

رسالہ معلم شفیق کے ذریعہ علم و عمل کی روشنی پھیلانے کی کوشش

مولانا محب حسین مرحوم کی علمی، ادبی، قومی اور معاشرتی، صحافتی خدمات کی ابتداء یکم محرم ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء سے شروع ہوتی ہے جب کہ آپ نے ایک ماہواری اردو رسالہ معلم شفیق مولانا جمال الدین افغانی کے

شورے سے جو اس وقت حیدرآباد میں مقیم تھے جاری کیا۔ پہلا پرچہ جو شائع ہوا اس میں سب سے پہلا مضمون "فوائد جریدہ" مولانا افغانی ہی کا تھا۔ اس مضمون کے علاوہ اور کئی مضمون اس رسالے کے لئے مولانا افغانی نے لکھے تھے۔ جس زمانے میں یہ رسالہ جاری ہوا اس زمانے میں حیدرآباد میں کوئی علمی و ادبی رسالہ یا اخبار موجود نہ تھا۔ لوگ لہو ولعب میں مبتلا تھے یا نوکری اور عہدے حاصل کرکے ذاتی منفعت اٹھانے میں مشغول تھے اور ملک میں علم و عمل کی روشنی پھیلانے کا کسی کو خیال تک نہیں تھا۔ یہ رسالہ علمی اور ادبی تھا جو علوم قدیمہ اور جدیدہ پر مشتمل تھا۔ اس میں ریاضیات، ادبیات، تجارت، اخلاق، طب، تاریخی اور جغرافیائی، ادب کیمیا، نباتیات، معدنیات، حیوانیات بہرحال ہر موضوع پر مضمون ہوتے تھے اور اس کے علاوہ مفید کتابوں کے ترجمے بھی شائع کئے جاتے تھے۔ جس نوعیت کا یہ رسالہ اردو میں تھا اس نوعیت کا کوئی دوسرا رسالہ ان دنوں ہندوستان بھر میں نہ تھا۔ مولانا نے اس رسالے کے ذریعے علم و عمل کی روشنی پھیلانے کی کوشش کی۔ یہ رسالہ پانچ برس تک نکلتا رہا۔ بعد میں ہفتہ وار بھی کر دیا گیا۔ اس میں نظم و نسق پر بھی بحث ہونے لگی جس کی وجہ سے بعض عہدے دار مولانا کے مخالف بھی ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی سرکاری خدمت تخفیف میں لائی گئی اور آپ ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ اس پریشان حالی اور بیروزگاری کی وجہ سے رسالہ ۱۳۰۲ھ میں بند ہو گیا۔

مولانا اس زمانے میں نہ صرف اپنی تحریروں سے ملک میں علوم و فنون کی اشاعت کر رہے تھے بلکہ آپ نے ایک انجمن "جلسہ خیر خواہ ہند" کے نام سے بھی قائم کی تھی جس میں لکچر اور تقریریں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ۱۲۹۹ھ میں ایک نائٹ اسکول بھی قائم کیا تھا جس کا نام "مدرسہ الیتاں دانش فرنگ" تھا۔

زمانہ بیروزگاری میں مولانا نے کنڈر گارٹن کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے بچے ماؤں اور اناؤں کی گود میں مدرسہ آیا کرتے تھے۔ مولانا کھیل کے ذریعہ سے بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ نواب عثمان یار الدولہ، نواب عقیل جنگ بہادر، نواب مہدی یار جنگ اور مولوی عبدالرحمن خان صاحب سابق پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی وغیرہ نے اپنے بچپن کے زمانے میں اسی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ بعد میں یہ مدرسہ مدرسہ عالیہ میں ضم کر دیا گیا۔

رسالہ معلم نسواں کے ذریعہ سماجی اور نسوانی اصلاح و ترقی کی کوشش

زمانہ بیروزگاری کے بعد مولانا جب پھر ملازم ہوئے اور گردش افلاک آپ کو مہلت دی تو آپ نے یکم محرم ۱۳۱۱ھ سے پھر رسالہ جاری کیا۔ لیکن آپ کے خیالات اور افکارات میں بہت بڑا تغیر ہو چکا تھا۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال اور پستی کا اصلی سبب مسلمان جاہل اور علم سے بے بہرہ پردہ نشین عورتوں کو ہی سمجھتے تھے۔ آپ نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کیا تھا کہ جب تک مسلمان عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہونگی اور ہندی موجودہ پردہ جو شرعی پردہ نہیں ہے دور نہ ہوگا اور عورتوں کو قرون اولی کی طرح اسلامی آزادی حاصل نہ ہوگی اس وقت تک ہندوستان کے اہل اسلام کی معاشرت درست نہ ہوگی اور نہ انھیں بحیثیت قوم کوئی ترقی نصیب ہوگی۔ اسی لئے آپ نے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی اصلاح و ترقی اور خصوصاً غیر شرعی پردے کی مخالفت کو اپنا خاص مقصد بنا لیا اور اس رسالہ کا نام بھی بدل کر معلم نسواں رکھ دیا۔ نثر و نظم میں پردے کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے جس کی وجہ سے ہندوستان بھر میں ہلچل مچ گئی اور آپ کی سخت مخالفت کا طوفان

برپا ہو گیا۔ ہندوستان کے ہر کونے سے مولانا کے خلاف لکھا گیا، گالیاں دی گئیں اور لعن طعن کی بوچھار ہوتی رہی۔ خود حیدرآباد میں ناک کاٹ دینے اور مار ڈالنے کی دھمکیاں متعدد بار دی گئیں۔ جہاں کہیں جاتے لوگ منہ پر برا بھلا کہتے۔ گالیاں دیتے۔ جلسہ اور لکچروں میں آپ کی مخالفت اور توہین کی جاتی تھی لیکن آپ اپنے اس قول پر سدا بند تھے۔

سچ کہہ جاؤں گا گو لاکھ برا مجھ کو کہیں — صاف کہنے میں جو ذلت ہو وہ ذلت اچھی
پردہ ہے برا کاٹ لیں موجود زبان ہے — اس سے تو ہم ایک حرف بھی کم کہہ نہیں سکتے

مولانا نے اعلان کیا تھا جو کوئی مولوی صاحب یا پیر صاحب اس موجودہ حبس نسوانی کو قرآن شریف اور احادیث مقدسہ سے ثابت فرمائیں گے ان کی خدمت میں (۵۰۰) روپیہ بطور نذرانہ پیش کیا جائے گا۔ اس اعلان کی نسبت مولانا عبدالحلیم شرر نے تحریر فرمایا تھا کہ ہمارے لائق دوست ایڈیٹر معلم نسواں نے اپنی جانبازی کی کوشش سے یہاں تک کامیابی حاصل کی کہ آج تمام علماء جواب دینے سے قاصر ہیں۔ ہر سمجھ دار نے اعتراف کر لیا کہ چہرہ اور ہاتھ داخل ستر نہیں اور خاتون اسلام کو ان کو چھپانے پر مجبور کرنا خلاف شرع اور ظلم ہے۔ عام لوگوں کی اور علماء کی سخت مخالفت کے علاوہ پولیس بھی مولانا کو پردے کے خلاف لکچر دینے سے روکتی تھی۔ چنانچہ آپ نے انجمن ترقی اردو ہند رسالہ اردو ادب کے نمبر ۲ بابتہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ۶ جمادی الثانی ۱۳۲۰ھ کے روزنامچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "آجکل حیدرآباد میں جبریہ حکومت ہے۔ اخباروں، رسالوں اور مطابع کی سخت نگرانی ہے۔ کہیں ایک جلسہ میں جو حسینی علم میں مرلید معر سکریٹری نے کیا تھا اور مجھے بلایا تھا عورتوں کی تعلیم و تربیت اور آزادی پر اختر، صادق اور میں نے کچھ بیان کیا تھا۔ اس پر کوتوالی سے ہم پر سخت نگرانی شروع ہوئی۔ خفیہ پولیس میری نگرانی کرتی ہے۔ عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی نسبت کچھ کہنا ہی جرم ہو گیا ہے۔ اقبال کلب میں جہاں عورتوں کی ترقی اور تعلیم سے متعلق بحثیں ہوتی تھیں تقریباً توڑ دیا گیا۔

باوجود سخت مخالفت کے مولانا نو برس تک معلم نسواں کے ذریعہ استقلال کے ساتھ پردے کے خلاف نثر و نظم میں مضامین لکھتے رہے۔ گو مخالفین نے معلم نسواں کو تو بند کر دیا مگر مولانا کی نو سالہ کوشش بیکار نہیں گئی۔ تمام ہندوستان میں مسلمان خواتین کی اصلاح و ترقی کا دروازہ کھل گیا اور ہر جگہ اور ہر شہر میں مولانا کے ہم خیال پیدا ہو گئے اور جس مسئلہ کو آپ نے چھیڑا تھا اس نے ہندوستان میں اپنے قدم جما لئے اور جو مقصد معلم نسواں کی اجرائی کا تھا وہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ مولوی عبدالحق بابائے اردو نے رسالہ معلم نسواں ماہ ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ میں لکھا تھا: "یہ پرچہ کئی سال سے نسوان ہند کی اصلاح اور تعلیم و دیگر مضامین پر بحث کر رہا ہے یہ صرف ایک شخص مولوی محب حسین صاحب کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ گو اس وقت مخالفت نہایت شدت کے ساتھ ہو رہی ہے۔ لیکن ایک زمانہ آنے والا ہے جب اس کی قدر ہوگی اور جو ہم لوگ آج اس حقارت اور نفرت سے دیکھتے ہیں کچھ مدت کے بعد یہی باتیں ان کے بچوں کی زبان پر ہوں گی اور کوئی انھیں عجیب و غریب یا بدعت کی باتیں خیال نہ کرے گا۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی اپنے رسالے "دلگداز" میں تحریر فرمایا تھا۔ مولوی محب حسین کے ہم خیال اب ہر جگہ اور ہر شہر میں موجود ہیں جس مسئلہ کو انھوں نے چھیڑا تھا اس نے ہندوستان بھر میں قدم جما لئے ہیں۔ جس تہذیب کی انھوں نے بنیاد ڈالی تھی آج حیدرآباد ہی کے سب سے زیادہ معزز گھروں میں برتی جاتی ہے۔ لہٰذا معلم نسواں کے ختم ہو جانے سے یہ مسئلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ نئی نئی وضع اور نئی نئی صورتوں میں جنم لے گا اور ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ ایک دن

ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا مذہب ہوگا۔

اخبار "مشیر دکن" جس میں مولانا کے خلاف سخت سے سخت مضامین شائع ہوتے تھے اور معلم نسواں کے بند کرنے کی سخت کوشش کی گئی تھی۔ اس اخبار میں ۶ مہر ۱۳۴۵ف میں ایک اداریہ ان کے متعلق لکھا گیا جس میں پردے کی بندشیں ٹوٹنے کی نسبت یہ الفاظ درج تھے۔ "حضرت محب مرحوم کے کلام کا جو مجموعہ ان کی یادگار کے طور پر شائع کیا گیا ہے اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ـــ

آنے والی نسلیں پردے کو اٹھائیں گی ضرور　　پوچھتے ہو کیا محب ہم تو نقیب اوروں کے ہیں

بے پردگی کی تحریک نے جو قولاً و فعلاً جو زور اس وقت باندھ رکھا ہے وہ ان کی علمبرداری کے زمانے میں خواب و خیال میں بھی نظر نہیں آتا تھا۔ محول بالا شعر میں گویا وہ اس زمانے کے متعلق بے پردگی کی پیشین گوئی کر گئے ہیں اور پیشین گوئی بھی ایسی جو حرف بحرف پوری اترتی دیکھی ہے۔ آئندہ زمانہ جیسا جیسا ترقی کرتا جائے گا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ تحریک ویسے ہی ویسے زور پکڑتی جائے گی اور بالآخر پردے کی رسم تقویم پارینہ ہو کر رہ جائے گی۔

قاضی عبدالغفار صاحب بھی اسی شعر کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "نصف صدی پہلے جب انھیں حیدرآباد جیسے قدامت پرست ملک میں اپنا ایک بھی ہم مشرب اور ہم خیال میسر نہ تھا پردے کے متعلق اپنی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے ایک نظم میں انھوں نے خود ہی صاف بتا دیا تھا کہ ان کی نظر اپنی قوم اور اپنے ملک کے مستقبل پر ہے۔ فرماتے ہیں ـــ

آنے والی نسلیں پردے کو اٹھائیں گی ضرور　　پوچھتے ہو کیا محب ہم تو نقیب اوروں کے ہیں

وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے زمانے میں ان کی آواز سے متاثر ہونے والے بہت کم ہیں لیکن جو بیج وہ بو رہے ہیں اس کا پھل ان کی آئندہ نسلیں کھائیں گی۔ جو تحریکیں مرحوم نے نصف صدی پہلے شروع کی تھیں وہ آج ہمارے افکار اور ارادوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں جو بیج انھوں نے ڈالے آج ان سے نئی دنیا پیدا ہو رہی ہے۔ آئندہ نسلوں کے نقیب کی حیثیت انھوں نے جو قرار دی تھی وہ نہ صرف ان کے شایاں شان تھی بلکہ اس واقعہ سے ان کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خوب واقف تھے کہ جو تخم پاشی آج وہ اس بنجر زمین پر کر رہے ہیں اس سے آنے والی نسلوں کے کھیت سرسبز ہوں گے۔ آج کوئی بھی تنگ نظر قدامت پسند مولوی صاحب مرحوم کی عظمت سے انکار کر دے لیکن اپنے گرد و پیش کے حقائق سے کوئی اندھا بھی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ نقیب ملت جو کہہ گیا تھا وہی تو آج ہماری بصیرت کے روبرو ہے۔ خدا کی رحمت ہو اس مرد حق بیں پر جو اپنے زمانے کے ظلمتوں میں روشنی کی کرنیں دیکھ رہا تھا۔ جس کی نظریں کتنے ایسے پہاڑ سی پردوں اور حجابوں میں سے اپنا راستہ پیدا کر رہی تھیں جو اس زمانے میں عوامی فکر و نظر پر پڑے ہوئے تھے۔"

اگرچہ کہ رسالہ معلم نسواں بند ہو چکا تھا مگر مولانا ہمیشہ عورتوں کی تعلیم و تربیت اور پردے کے خلاف مضامین لکھتے اور تقریریں کرتے رہے اور اشعار میں تو یہ سلسلہ آخر عمر تک جاری رہا۔ چنانچہ مولانا کا آخری پیام یہ ہے ـــ

پردہ نہ اٹھا تو غلامی میں رہو گے　　پہنچا دے کوئی جا کے یہ پیغام ہمارا

اخبار علم و عمل روزآنہ کے ذریعہ سیاسی اور صحافتی خدمت

اخبار علم و عمل روزآنہ ۱۳۲۲ھ میں جاری ہوا جس میں دنیا کی خبروں اور سیاسی مسائل کے علاوہ علمی مضامین اور نظمیں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ یہ اخبار ہندوستان کے ممتاز اخباروں میں شمار ہوا کرتا تھا۔

آج حیدرآباد میں متعدد روزآنہ اخبار شائع ہو رہے ہیں اور صحافت کو بہت ترقی ہوئی ہے لیکن آج سے پچاس برس پہلے حیدرآباد میں اخبار بینی کا اس قدر شوق نہ تھا صرف ایک اخبار مشیر دکن شائع ہوتا۔ آج جس قدر بھی تحریر و تقریر کو آزادی حاصل ہے وہ ان قدیم ایام میں یہاں میسر تھی۔ گورنمنٹ کی پالیسی پر نکتہ چینی کرنا تو کجا کسی عہدے دار کی مرضی کے خلاف بھی زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ اس محدود آزادی صحافت کے زمانے میں مولانا محب حسین مرحوم نے جس بے دھڑک طور پر اخبار علم و عمل روزآنہ کے ذریعہ صحافت کی خدمت انجام دی ہے وہ ان کے اداریوں سے بخوبی واقف ہو سکتی ہیں۔ ان میں کے بعض عنوانات یہ ہیں ــــ

(۱) حیدرآباد میں کپڑے وغیرہ کی کلیں ملیں قائم کرنا۔ (۲) حیدرآباد میں صنعت و حرفت کے مدرسے قائم ہونا چاہئیں۔ (۳) اہل ملک کو ذمہ داری کے اعلیٰ عہدوں پر مامور کرنا چاہئیے۔ (۴) حیدرآباد میں مجلس پاسبتر خیرات قائم کرنا چاہئیے۔ (۵) حیدرآباد میں میڈیکل کالج میں اردو کے ذریعہ تعلیم ہونی چاہئیے۔ (۶) حیدرآباد کو انگلستان کی تعلیمی پالیسی اختیار کرنا چاہئیے۔ (۷) حیدرآباد کے زنانہ مدرسہ میں مادری زبان کے ذریعہ تعلیم ہونا چاہئیے (۸) اہل ملک کے حقوق کی پامالی سے ان کی حالت پست و ذلیل ہو جاتی ہے۔ (۹) ملک میں ہر حرفہ اور مزدور پیشہ اشخاص کے لئے مدرسہ شبینہ قائم کرنا چاہئیے۔ (۱۰) سرکار عالی کے دفتر میں اردو زبان میں کارروائی ہونی چاہئیے۔ (۱۱) حیدرآباد میں سررشتہ زراعت اور زراعت کا کالج قائم ہونا چاہئیے۔ (۱۲) اردو گزٹ شائع ہونا چاہئیے۔ (۱۳) موازنہ میں خرچ تعلیم کا اضافہ ہونا چاہئیے۔ (۱۴) بے جا رعایتوں سے سرکاری قانون و آئین کی وقعت جاتی رہتی ہے۔ (۱۵) حیدرآباد میں مجلس تجارت قائم ہونا چاہئیے۔ (۱۶) ہمارے امراء کو قومی فلاح و بہبودی کے کاموں میں مدد دینی چاہئیے۔ (۱۷) مدارس میں ریاضت جسمانی کا پورا پورا بندوبست ہونا چاہئیے۔ (۱۸) حیدرآباد کے سررشتہ تعلیمات کو بیدار ہونا چاہئیے۔ (۱۹) عہدے دار کو دفتری زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ (۲۰) مجلس صفائی میں اخباروں کے رپورٹروں کو شرکت کی اجازت ہونی چاہئیے۔ (۲۱) حیدرآباد میں ملکی مصنوعات کی نمائش ضروری ہے۔ (۲۲) حیدرآباد میں تعلیم دستکاری جبری کرنی چاہئیے۔ (۲۳) دفتروں میں حق تلفی کی روک تھام ضروری ہے۔ (۲۴) اولادِ وطن کو اعلیٰ تعلیم دی جائے تو بیرونی مداخلت باقی نہ رہے گی۔ (۲۵) مدک خانوں کا اٹھانا رعایا کی آزادی میں کوئی مداخلت نہیں ہے۔ (۲۶) حیدرآباد میں یونیورسٹی سے قبل ابتدائی اور سکنڈری تعلیم کو ترقی دینے کی بہت ضرورت ہے۔ (۲۷) ملکی معدنیات سے اہل ملک کو فائدہ اٹھانا چاہئیے۔ (۲۸) افتادہ زمینوں سے اہل ملک کو فائدہ اٹھانا چاہئیے۔ (۲۹) سرکاری کمیٹیوں میں عہدہ داروں کے علاوہ غیر ملازمین ارکان بھی ہونا چاہئیے۔ (۳۰) حیدرآباد میں فری اور جبری تعلیم ہونی چاہئیے۔ (۳۱) حیدرآبادیوں کو اپنی حالت درست کرنے کی طرف جلد توجہ کرنی چاہئیے۔

مولانا محب حسین کی صحافتی خدمت کی نسبت قاضی عبدالغفار صاحب فرماتے ہیں کہ "یوں تو مرحوم اپنے قلم کا جہاد آج سے نصف صدی پہلے شروع کر چکے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جمال الدین افغانی کی صحبتوں کے تاثرات سے بھی ان کے ارادوں نے بہت تقویت حاصل کرلی ہوگی۔ لیکن جس زمانے میں مرحوم اپنی اصلاحی تحریک کو اپنے روزنامہ اخبار علم و عمل کے ذریعہ پیش کر رہے تھے وہ زمانہ تمام ملک ایشیا میں ایک قومی انقلاب کا زمانہ تھا۔

ہندوستان میں بھی یہ زمانہ ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ چنانچہ دکن میں باہر کے حالات کا ردعمل اصحاب فکر و نظر کو (جن کی تعداد بہت کم تھی) جس طرح متاثر کر رہا تھا اس کا ایک عکس روزنامہ علم و عمل کے صفحات پر نظر آتا ہے۔ اول تو یہی بات میرے لئے کافی حیرت انگیز ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس ملک کے رجعت پسند عناصر کے مقابلہ میں مولوی محب حسین صاحب نے بغاوت کا علم بلند کرنے کی جرات کی اور اس زمانے کے سماجی زندگی کے بت خانوں کی توہین کر کے وہ سماجی اجارہ داروں کے تعصب اور غصہ کو برداشت کر سکے۔ لیکن ان کی اجتہادی قوت نے تن تنہا اور بے یار و مددگار اپنا کام انجام دیا۔"

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی محب حسین صاحب کا اس خار زار پر تن تنہا گامزن ہونا عقیدہ اور ایمان کی قوت کا ایک ایسا کارنامہ تھا جو بجائے خود ایک تاریخی یادگار رہے اور ہم سب کے لئے سرمہ چشم بصیرت، ان کے نقوش قدم ہمیشہ ہماری بصیرت پر یہ حقیقت روشن کرتے رہیں گے کہ ایمان اور عقیدہ کی طاقت اپنا کام کرنے کے لئے تائید و تحسین کا انتظار نہیں کرتی۔

قاضی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ "یہ وہ زمانہ ہے جب حیدرآباد کی فضاء آزاد سیاسی مباحث کے لئے بہت ناسازگار تھی۔ لیکن باوجود اس کے مولوی محب حسین سیاسی تنقید کے شجر ممنوعہ کے بہت قریب پہنچ گئے تھے۔ تصور کیجئے اس سیاسی انحطاط کا جو (۷۰) سال پہلے ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھا اور پھر تصور کیجئے حیدرآباد میں ایک ایسے صحیفہ نگار کا جو اس بات پر احتجاج کرتا تھا کہ یوروپین پولیس کیوں مقرر کی جائے۔ جو رشوت ستانی کے خلاف مضامین لکھتا تھا۔ جو اس بات پر زور دیتا تھا کہ حیدرآباد کے نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ بھیجا جائے۔ جو جاگیری نظام کی مخالفت کرتا تھا۔ جو مزدوروں اور کسانوں کے معاشی مسائل پر قلم اٹھاتا تھا۔ جو صحافت کے حقوق کا مدعی بنتا تھا اور لکھتا تھا کہ ــــــ "مقامی اخباروں کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ سرکاری کارروائیوں پر جائز نکتہ چینی کریں اور رعایا کے حقوق کی حفاظت میں سرگرم رہیں۔"

وہ اپنے اخبار میں بتاتا تھا کہ جاپان کی فتح سے ہندوستان کو کیا سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ وہ نیشنل کانگریس کے خطبہ صدارت کو اپنے اخبار میں شائع کرتے تھے اور کانگریس کی تحریک پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے تھے۔

" جب نیشنل کانگریس کی اصلی غایت یہ ہے کہ اہل ملک (خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان) کی شکایتیں گورنمنٹ تک پہنچائی جائیں تاکہ اس کی اصلاح ہو۔ ملک میں پولیٹیکل تعلیم و تربیت کا مذاق پیدا ہو۔ لوگ اپنے اور گورنمنٹ دونوں کے حقوق سے واقف ہوں تو پھر تعجب ہے کہ کیوں مغربی شمالی صوبہ کے بعض سربرآوردہ مسلمانوں سے اس کی مخالفت ظاہر ہوئی (یہ اشارہ ہے غالباً "سرسید احمد خاں کی مخالفت کی طرف)۔ کیا اپنے حقوق کو دریافت کرنا، ان پر بحث کرنا پھر انھیں یادداشت کے طور سرکار کی خدمت میں روانہ کرنا کوئی جرم ہے"؟

قاضی صاحب توجہ دلاتے ہیں کہ "اس طرح آج سے (۷۰) سال پہلے ذرا تصور کیجئے حیدرآباد میں جاگیرداری پر نکتہ چینی اور مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کی مدافعت! یہ وقت وہ تھا جب کہ اشتراکیت اور کمیونزم کی اصطلاحیں وضع نہیں ہوتی تھیں اور چند کے سوا یورپ کے اہل قلم اور مصلحت بین بھی کوئی ان مسائل پر توجہ نہ کرتا تھا۔ لیکن ایک شخص تھا جو ہندوستان کی جاگیرداری نظام کے قلب میں بیٹھا ہوا اس نظام کے فربہ بدن کو اپنے نشتر کی نوک سے

کر بدر رہا تھا وہ اس وقت میکسیم گورکی کے ادب پر مضمون لکھ رہا تھا۔ جب میکسیم گورکی کے نام سے ہمارے ملک کے بڑے بڑے علماء اور فضلاء بھی نا آشنا تھے۔

قاضی عبد الغفار صاحب بحیثیت ایک مدیر اخبار کے فرماتے ہیں "آج ہم جو کچھ جرائد میں ہر روز لکھ رہے ہیں کیا اس کی روح وہی نہیں ہے جو آج سے نصف صدی پہلے مولوی صاحب کی نگارش میں کارفرما تھی۔ پس کوئی شبہ نہیں کہ حیدر آباد کی وطن پرست صحافت کے معمار اول مولوی محب حسین مرحوم ہی تھے۔ جس دن حیدر آباد کے ارتقاء کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس کے سر ورق پر پہلا نام ان ہی کا ہوگا۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں "حیدر آباد کی صحافت کا وہ معمار اول مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کی نسبت (۴۰) سال قبل وہی بات کہہ رہا تھا جو (۴۰) سال بعد کہی گئی یعنی" یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ہندوستان کے ہندو مسلمان کوئی ایسی دو علیحدہ قومیں ہیں جو اپنے خون، طرز معاشرت، رسم و روایات اور عقاید میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ اگر ان کی معاشرت اور رسم و رواج پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں ایک وسیع قوم کے افراد ہیں جو برائے نام مذہب کے اعتبار سے جدا سمجھے جاتے ہیں۔

ع اب شیخ محمدؐ ہیں جو پہلے تھے موہن
ہندو سے مسلمان ہوئے ہندی ہی رہے
مذہب کے بدلنے سے نہ بدلے گا وطن

قاضی صاحب کہتے ہیں کہ ذرا دیکھئے کہ یہ لکھنے والا اپنے زمانے سے کس قدر آگے جا رہا تھا۔ آج جب میں سوچتا ہوں کہ حیدر آباد کے خاکستر میں (۴۰) سال پہلے کوئی ایسی چنگاری بھی موجود تھی تو میرے اس عقیدے کی تصدیق ہوتی ہے کہ قدرت کا نظام زندگی ہمیشہ زمانے کی خاکستر میں ان چنگاریوں کی حرارت محفوظ رکھتا ہے تاکہ اس حرارت سے پھر کسی وقت شعلے پیدا ہوں۔ یہ ایک تسلسل ہے زندگی کے انقلابات کا۔ یہ ایک مد و جزر ہے قوموں کے زمانوں کا یعنی پھر مد کے بعد جزر اور پھر جزر کے بعد مد۔ آج کے حالات کا سلسلہ کس قدر مولوی محب حسین صاحب کے خیالات سے پیوستہ ہے۔ وہ اس قدر پیوستہ ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اکیلے ایک چوکیدار کی آواز تھی جو ہم (۴۰) سال پہلے رات کے اندھیرے میں سن رہے تھے۔ آج اس سے زیادہ ناشکری کیا ہوگی اگر ہم رات کے اس چوکیدار کو بھول جائیں کہ وہ کیا کہہ رہا تھا اور کیوں کہہ رہا تھا۔

آج بھی جب کہ ملائی اور پیری کا یہ طلسم ٹوٹ رہا ہے اسلامی لباس میں دھوکہ دینے والی برہمنیت کے خلاف دو حرف کہنے یا لکھنے کی جراءت ہر شخص نہیں کرسکتا لیکن مولوی صاحب مرحوم نصف صدی پہلے مذہب کے ان سوداگروں کے خلاف اس وقت جہاد کر رہے تھے جب کہ عقاید باطلہ کے نام پر خون بہایا جاتا تھا اور جانیں فدا کی جاتی تھیں۔ مرحوم کی اخلاقی جراءت اور قوت ایمانی کی یہ ایک ادنیٰ مثال ہے۔ اس پیشہ ور ملائی اور رہبری کے خلاف مرحوم نے بہت کچھ لکھا اور بہت خوب لکھا

ہر ایک جا میں ہزاروں ہیں شیخ و پیر و ولی
جو مفت خوری کو سمجھے ہیں پیشہ ازلی
کمائی اوروں کی ان کو بغیر کسب ملی
فریب دیتے ہیں دنیا کو یہ خفی و جلی
ملے شکار تو پھر اس کے پیچھے لگتے ہیں
ہزاروں طرح سے وہ احمقوں کو ٹھگتے ہیں

شاعری

مولانا محب حسین صاحب نے "خطوط محب" میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ کو بچپن ہی سے شاعری سے لگاؤ تھا۔ مکتب میں جب دو لڑکوں میں لڑائی ہوتی تھی تو آپ ایک کی طرفداری میں دوسرے کی ہجو لکھا کرتے تھے اور پندرہ برس کی عمر میں خود بخود غزلیں بنائیں اور سلام لکھے۔ لیکن اپنے والد کے منع کرنے پر چالیس برس کی عمر تک ایک دو غزل کے سوا کبھی غزل نہیں لکھی۔ جب حضرت داغ حیدرآباد آئے تو مولانا نے وقارالامراء کی تعریف میں قصیدہ لکھ کر ان کو سنایا جس کی انھوں نے بہت داد دی اور کہا شاعری کا جو مادہ موجود ہے اس کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے اور جب تک داغ صاحب بقید حیات رہے آپ اپنا کلام ان کو سناتے رہے۔

مولانا نے شاعری کو ملک اور قوم کی اصلاح کا ایک ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں۔ ع

لکھ وہ خیال جو کہ ہو کچھ قوم کو مفید　　　مضمون چشم ابرو و لعل دہن کو چھوڑ

انھوں نے غزل میں عورتوں کے حسن و عشق، خط و خال اور وصل و ہجر کے عیوض ان کی مخصوص مصیبتوں اور لاعلاج دردوں کو بیان کیا اور عشقیہ جذبات کی بجائے ان کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری کے جذبات کو دکھایا تاکہ قوم کو ان کی پست حالت دور کرنے کی فکر ہو۔ مولانا نے شاعری میں قدیم ایشیائی طرز بیان کو قائم رکھا اور قومی، سماجی اصلاح کے افکارات اور خیالات کو اس قدیم رنگ میں رنگ کر پیش کیا۔

رسالہ العصر لکھنؤ جلد ۲ نمبر ۶ ۱۹۱۲ء میں مولانا محب حسین صاحب کی شاعری پر ایڈیٹر نے یہ تبصرہ کیا تھا "مولوی محب حسین صاحب حیدرآبادی ان مشاہیر قلم میں سے ہیں جن کی ذات سے اہل ملک کو مختلف عنوان سے معتدبہ فائدہ پہنچ چکا ہے۔ مولوی صاحب کے کارنامے ایسے نہیں ہیں جو ان کے نام کو بقائے دوام سے محروم رکھیں۔ علاوہ نظم کے نثر مضامین کا مجموعہ اگر مرتب کیا جائے تو کئی ضخیم کتابوں کے برابر ہوگا۔

آپ کا مذاق سخن ہندوستان کی عام مروجہ شاعری سے جداگانہ ہے اور اس بات میں آپ مولانا حالی مغفور کے مقلد معلوم ہوتے ہیں پھر بھی ان دونوں حضرات کا کلام اپنی اپنی جگہ جداگانہ امتیاز رکھتا ہے اور مولوی محب حسین صاحب نے نسواں کے مضمون کو جو کچھ اور جس قدر اور جس انداز میں لکھا ہے وہ ان کی خاص چیز ہے۔ اس کے علاوہ ان کی غزلیات، قطعات اور دوسری چیزیں قومی، ملکی، تمدنی، معاشرتی، اخلاقی اور تاریخی نکات سے مملو ہیں۔ مسئلہ توحید ایک نازک مسئلہ ہے اور اس کی باریکیوں کو مولوی محب حسین صاحب نے عمدگی سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے اور جس برجستگی اور بلند آہنگی سے انھوں نے ان باریکیوں کو نظم میں سمجھایا ہے ان کی قدرت شعرگوئی کا پتہ چلتا ہے۔ الغرض مولوی محب حسین صاحب ایک شاعر باعمل ہیں اور ان کی شاعری خیالی نہیں عملی شاعری ہے۔ اس زمانے میں ایسے ہی شاعروں کی اور اسی قسم کی شاعری کی ضرورت ہے۔

قاضی عبدالغفار صاحب مولانا کی شاعری کی نسبت تحریر فرماتے ہیں وہ سرسید احمد خاں اور مولانا حالی کے ہمعصر تھے۔ گو کہ اس بات کا پتہ ان کی تحریروں سے نہیں چلتا کہ حالی کی قومی شاعری سے متاثر ہونے کا انھیں کب اور کتنا موقع ملا تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دکن میں شاعری کا یہ رنگ اختیار کرنے والے وہ پہلے شخص تھے۔ حیدرآباد میں یہ زمانہ ایسی رنگین شاعری کا زمانہ تھا جس پر زیادہ تر لکھنؤ اور دلی کی شاعری کا عکس پڑا تھا۔ لیکن مولوی محب حسین مرحوم نے اس راہ سے کترا کر اپنا وہ راستہ اختیار کیا جو آج نہیں نصف صدی کے بعد قومی شاعری اور ادب برائے زندگی اور حقائق نگاری اور جدید ادب کی بگٹی منزل تک پہنچتا ہے۔ آج جس ادب کو ہم "جدید ادب" کہتے ہیں وہ شاعرانہ افکار کے اسی ارتقاء کا ایک اعلیٰ درجہ

ہے جس کا آغاز دکن میں مولوی صاحب مرحوم کی شاعری نے کیا تھا۔ آج جدید شاعری کا لہجہ بہت تلخ و تند ہے اور اس کے ملبوس میں افکار اور عزائم کی روحیں زیادہ بے چین اور بے قرار نظر آتی ہیں لیکن ذرا تصور کیجئے اس زمانہ کا جب کہ دکن میں شاعری کا یہ مجدد پہلی دفعہ اپنی شاعری کے ذریعہ سے آزادی وطن کے لئے جان پر کھیلنے اور غلامی کے مقابلے آزادی کا ادعا پیش کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

ہمدردی وطن ہے سب اہل وطن پہ فرض — ہر شخص پر ہے اب یہ مقدم ادائے فرض
کہتی ہے طفل سے ولادت کے وقت ارض — کرتی ہوں تجھ سے بصد عجز ایک عرض

ہمدردی وطن میں ہر آفت کو جھیلو
مجھ پر پڑے جو وقت تو پھر جان پہ کھیلو

آزادئ وطن سے ہماری ہیں عزتیں — دیکھی نہیں ہیں تم نے غلامی کی ذلتیں
نابود ہو گئی ہیں وہ افسوس ملتیں — جن پر ہوئی ہیں غیر کی قائم حکومتیں

ہوتے فنا ہیں ملک کے اولاد کے حقوق
ملتے نہیں غلاموں کو آزاد کے حقوق

مزدوروں اور کسانوں کے متعلق ان کی ایک نظم کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں ـــــ

نہ تن کو کپڑا نہ سر کو ٹوپی نہ پیٹ بھر کر انھیں ہے روٹی — لباس ہے ان کا ایک لنگوٹی کہ جس سے ظاہر ہے ان کی عسرت
وبا جو آئے تو ان کو کھائے جو قحط آئے تو ان کو مارے — انھیں پہ بھرمار ٹیکسوں کی ہے بری انھیں کی جہاں میں گت ہے
مکان ان کے ہیں مرغیوں کے ڈربے کہ جس میں رہتے ہیں ہر انساں — لحد میں جیسے پڑے ہیں مردے کسان ہیں ان میں ایسے پنہاں

مختصر یہ کہ جدید دھارے کا یہ منبع جو آج ایک سیلاب کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے دکن میں وہی ایک چھوٹا سا چشمہ تھا جو مولوی محب حسین صاحب مرحوم کے دماغ سے بہنا شروع ہوا تھا۔

مختلف اشعار

مخالف ہوں مذہب میں گو لاکھ ہم تم — وطن ایک ہے پر تمہارا ہمارا
محبت جو رکھتا ہے ہندوستان سے — وہی ہے محب اور پیارا ہمارا

کیوں نہ کریں ہندو مسلم سے محبت — ہم اہل محبت ہیں محب نام ہمارا

رفاہ عام کی خاطر جو لاکھوں سختیاں جھیلے — خطاب ایسے بہادر کو ہے شیر افگن کا

کثرت ازدواج نے ڈھائی تمدن کی بنا — وائے عبرت پھر بھی دستور عدم اٹھتا نہیں

بلا تعلیم نسواں مرد لائق ہو نہیں سکتے — ازل سے تا ابد ہے ساتھ اس چولی دامن کا

مضبوط ماؤں سے ہو سکتی ہے اولاد قومی — کیا اثر ہوتا نہیں بچوں پہ ماؤں کے شیر کا
صفحۂ ہستی سے گو مٹتی نہیں تحریر شوخ — برق سے بھی تیز ہے لیکن اثر تقریر کا
اس مقرر سورما کے سامنے فوجیں ہیں گرد — کام لیتا ہے زباں سے جو سنان و تیر کا

جیتے جی بھی دفن ہیں قبروں کے اندر عورتیں — کیا کوئی پردے سے بڑھ کر رسم قاتل اور ہے

میاں ایم۔ اسلم کے تاریخی ناول

از:- مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب

۱۹۲۹ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا اور اردو کی خدمت کرنے کا زیادہ شوق دامن گیر ہوا تو دہلی، لاہور وغیرہ کے علمی، ادبی رسالوں کے مطالعہ میں اضافہ ہوا۔ اسی سلسلہ میں میاں ایم۔ اسلم کے مختصر افسانے وغیرہ نظر سے گذرنے لگے اور پھر کئی کتابیں مثلاً "ناظمہ کی آپ بیتی"، "نرگس" وغیرہ کے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس طرح مجھے میاں ایم۔ اسلم کے نام اور کام سے آگاہی ہوتی گئی۔ موصوف نے گذشتہ (۲۹) سال کے عرصہ میں ادب اردو کی جو گراں بہا خدمت انجام دی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ناقابل معافی جرم ہوگا۔ ایک خادم اردو کی حیثیت سے موصوف کے کارناموں پر اظہار خیال کرنا بے موقع نہیں ہوسکتا۔ مگر مجھے اپنے دوسرے کاموں کے سلسلہ میں اس قدر فرصت نہیں ہے کہ تمام ادبی کارناموں پر تبصرہ یا تنقید کروں اس لئے صرف ناول کے شعبہ کے ایک حصے پر اظہار خیال کی کوشش کی گئی ہے۔

اردو میں ناول کا آغاز کب سے ہوا اس کے متعلق اگرچہ یقین کے ساتھ کوئی رائے نہیں دی جاسکتی البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نذیر احمد کے ناولوں کو اولیت کا سہرا دیا جاسکتا ہے، جو معاشرتی ناول ہیں، تاریخی ناولوں میں مولانا شرر کا نام پیش پیش ہے۔ مولانا شرر کو اس امر کا تفوق حاصل ہے کہ انھوں نے اردو میں تاریخی ناول لکھے اور تاریخ اسلام کے واقعات کو ناول کی صورت میں پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔ مگر چونکہ مولانا شرر کے ناول نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں اس میں کئی نقائص بھی ملتے ہیں۔ مولانا شرر کے ناولوں کے ساتھ چند اور تاریخی ناولوں کا ترجمہ ہوا یا تصنیف ہوئے ہیں مثلاً عمر پاشاہ، رزم و بزم وغیرہ۔

اب میاں ایم۔ اسلم صاحب نے تاریخی ناول میں شاندار اضافہ کیا ہے۔ آپ کے تاریخی ناول حسب ذیل شائع ہوئے ہیں۔

(۱) معرکۂ بدر (۲) حسینۂ شام (۳) فتنۂ تاتار (۴) پاسبان حرم (۵) فاتح قسطنطنیہ (۶) ضرب مجاہد
(۷) غزالۂ صحرا (۸) زوال الحمراء (۹) خون شہیداں (۱۰) تیغ ابدال (۱۱) جہدی (۱۲) رنگیلا تاجدار
(۱۳) مرد غازی (۱۴) رقص ابلیس (۱۵) خون مسلم۔

اولاً مختصر طور پر ان میں سے ہر ایک ناول کا تعارف ضروری ہے۔۔۔

(۱) معرکۂ بدر۔۔۔ جنگ بدر مسلمانوں کی وہ شاندار اور فتحیاب جنگ ہے جس میں (۳۱۳) بے سروسامان

فدایانِ اسلام نے ایک ہزار کی مسلح فوج پر کامیابی حاصل کر کے اسلام کی بنیاد مستحکم کی تھی۔ محبت الٰہی میں سرشار مختصر جماعت نے اپنے سے سہ چند دشمنوں پر فتح حاصل کی تھی۔ اس ناول میں ہجرت سے لے کر جنگ بدر تک کے حالات کا بڑے دلچسپ پیرائے میں اظہار کیا گیا ہے۔

(۲) جو تھے خون یا حسینہ شام ــــ اس ناول میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد کے اسلامی شاندار کارنامے مجلا کئے گئے ہیں۔ خالد بن ولیدؓ اور ابو عبیدہ بن جراحؓ کی جنگی قابلیت، بے مثل شجاعت اور والہانہ اور فداکاری کا حال قلمبند کیا ہے۔ والی حمص کی شہزادی کوکب اور ایک اسلامی مجاہد قیس کی باہمی الفت داستان سموئی گئی ہے۔ ناول کا انجام کوکب اور قیس کی باہمی شادی اور اسلامی فتح پر ہوتا ہے۔

(۳) فتنۂ تاتار ــــ ہلاکو خاں نے عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو عیاری سے شہید کر کے خلافت عباسی کا خاتمہ کیا تھا۔ اس ناول میں ایم۔ اسلم نے ان اسباب اور علل سے بحث کی ہے کہ کیوں مسلمانوں پر تباہی آئی اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور خلافت عباسی کا خاتمہ ہو گیا۔

(۴) پاسبان حرم ــــ اس ناول میں جنگ قادسیہ کا تذکرہ ہے۔ ایرانیوں کے مقابلے میں اسلام کو جو فتح حاصل ہوئی اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس ناول میں مسلمانوں کی حریت پسندی اور جذبۂ جہاد کی بڑی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔

(۵) فاتح قسطنطنیہ ــــ نام سے ہی واضح ہے۔ اس میں سلطان محمد ثانی کے قسطنطنیہ کے فتح کا حال لکھا گیا ہے اور آنحضرت صلعم کی پیش گوئی جو فتح قسطنطنیہ سے متعلق تھی اس کے لفظ بہ لفظ صحیح ہونے کا تذکرہ ہے اس ناول میں کثرت پر قلت کا غالب آنا اور مسیحی خانقاہوں اور راہبوں کے لرزہ خیز حالات کی تشریح کرتے ہوئے ایک پہاڑی ڈاکو یوسف اور سرویا کی حسین و جمیل شہزادی رانیں کی رومان کو پیش کر کے ناول میں جان ڈال دی

(۶) ضرب مجاہد ــــ اس ناول میں طرابلس الغرب کی فتح اور وہاں کے حکمراں جارجری کی شہزادی کو انعام میں حاصل کرنے کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

(۷) غزالۂ صحرا ــــ اس ناول میں صلیبی جنگ کا حال قلمبند کیا گیا ہے۔ سلطان صلاح الدین اور برطانیہ کے بادشاہ رچرڈ شیردل کے معرکوں کی تفصیلی بیان کی گئی ہے۔

(۸) زوال الحمرا میں اندلس کے آخری بادشاہ ابو عبداللہ کی نااہلی اور مسلمانوں کے اندلس کو خیرباد کرنے کا عبرتناک نقشہ بیان کیا گیا ہے۔

(۹) خونِ شہیداں ــــ اس ناول میں ایم۔ اسلم نے سسلی کی فتح کا حال لکھا ہے۔ مسلمان جانبازوں کے کارنامے مجلا کئے ہیں جنھوں نے سسلی پر پرچم اسلامی کو لہرایا تھا اور یہ واضح کیا ہے کہ ایک مردِ مومن کی زندگی کا مقصد دنیا میں حق اور صداقت کا بول بالا کرنا ہے

(۱۰) تیغ ابدال ــــ اس میں پانی پت کی تیسری جنگ کا حال لکھا گیا ہے۔ مرہٹوں کی تین لاکھ اور ابدالی کے صرف (۶۶) ہزار جانبازوں کے معرکہ کو پیش کیا گیا ہے۔

(۱۱) مہدی ــــ اس ناول میں مصر کے بہادر جانباز مہدی سوڈانی کے جنگ آزادی کے کارنامے درج ہیں

(۱۲) رنگیلا تاجدار ـــــ مغلیہ تاجدار محمدؐ شاہ اور ان کے عہد کے عروج اور زوال کا حال پیش کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی بداندیشی اور عیش پرستی کی عبرتناک داستان کو بڑی عمدگی سے اجاگر کیا گیا ہے۔

(۱۳) مرد غازی ـــــ بیجاپور کی عادل شاہی حکومت اور وجیانگر کے راجہ کا معرکہ بیان کیا گیا ہے اور ایک ترکی جانباز کے حیرت انگیز کارنامے درج ہیں۔

(۱۴، ۱۵) رقص ابلیس و خون مسلم دونوں ناول جنگ آزادی کے ہنگامہ خیز دور کی عبرتناک داستان ہیں۔

یہ ہیں ایم۔ اسلم کے وہ تاریخی ناول جو کئی ہزار صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں ان پر اظہار خیال کے لئے چند امور قابل تنقید قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً جو واقعات درج ہیں ان میں کہاں تک صداقت ہے۔ دوسری یہ کہ ان ناولوں کا اصل مقصد کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان میں جو کردار ہیں وہ کس حد تک صحیح ہیں اور پوری تصویر پیش کر سکتے ہیں یا نہیں۔

ان ناولوں کو بہ یک نظر دیکھا جائے اور تاریخ سے ان کو ملایا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ میاں اسلم نے تاریخی واقعات کو بالکل صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ ان کو صداقت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ناول ہونے کے باوجود تاریخی حالات کو مبالغہ کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا بلکہ حقیقی حالات اور تاریخ کے مسلمہ واقعات کو پیش کیا ہے۔ کسی ناول کو بھی تاریخ کے ساتھ ملایا جائے تو ان کو غلط ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ صحیح حالات کا اور اصلی واقعات کا پیش کرنا ان ناولوں کا اہم مقصد ہے تاکہ مسلمان ناول کے پیرائے میں اپنے اسلاف کے شاندار کارناموں سے واقف ہو جائیں اور اقبال مندی اور دنیا کے بڑے حصے پر حکومت کرنے اور پھر تنزل کرنے کے اسباب معلوم کر لیں۔

ان ناولوں سے اچھی طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ترقی کے اسباب کیا تھے اور تنزل کے اسباب کیا ہیں۔ اس مقصد کو بڑی چابک دستی اور خوبی سے ناولوں میں سمویا گیا ہے۔ ان ناولوں میں اگر ایک طرف گزشتہ عظمت و شوکت کو مجلا کیا گیا ہے تو ساتھ ساتھ ترقی سے تنزل، عروج سے زوال، اقبال مندی سے پستی میں انحطاط کے اسباب کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ناولوں میں واعظانہ طور پر پند و نصیحت کے بیانات ملتے ہیں۔ وہ طبیعت پر گراں نہیں گزرتے۔ یہ ناول جس عہد سے متعلق ہیں اس وقت کے تمدن و تہذیب، رسم و رواج کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ کوئی ناول ایسا نہیں ہے جو عہد گزشتہ سے تعلق رکھنے کے باوجود اس سے عصر حاضر کا تمدن اور تہذیب نمایاں ہوتا ہو بلکہ اس میں اسی دور کا تمدن نظر آتا ہے جس عہد سے وہ متعلق ہیں۔

ہر ناول میں مختلف کردار ہیں، کردار نگاری کے لحاظ سے ان ناولوں کو پرکھا جائے تو ناکامی نہیں ہوتی۔ اسلم صاحب اپنے ہیرو اور دوسرے اشخاص کے کردار کو بڑی خوبی سے اجاگر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ ناول اگرچہ اسلامی تاریخ سے وابستہ ہیں اور مسلمانوں کی حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے مختلف دور اور مختلف قوموں یعنی عربوں، ترکوں، مصریوں، اندلسیوں اور ہندی مسلمانوں کے جذبات اور خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں ایک طرف اسلامی جذبات، اسلامی مساوات اور اسلامی ثقافت کا لحاظ رکھا گیا ہے تو دوسری طرف مقامی حالات، مقامی رسم و رواج کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا ہے۔

اسلم کے ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جذبات کو ابھارنے اور افکار کو بیدار کرنے اور

احساس کو جگانے میں پوری قوت رکھتے ہیں۔ ناول کے مطالعے سے مسلمانوں کو اپنی گزشتہ عظمت و شوکت، گزشتہ جاہ و جلال کا علم ہوتا اور جذبات اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم بھی ان ناولوں کے ہیرو کی طرح نام آوری حاصل کریں اور قوت و شجاعت اور بہادری کے کارنامے پیش کریں۔ دشمنان اسلام کی بیخ کنی کریں۔ آپس میں متحد و متفق ہو کر اسلامی پرچم بلند کریں۔

اگرچہ ناولوں کا ایک بڑا حصہ تقسیم کے پہلے کا بھی ہے مگر تقسیم کے بعد جو تاریخی ناول لکھے گئے ہیں وہ خصوصیت سے اس انداز سے لکھے گئے ہیں کہ پاکستانی سچے مسلمان بن کر اسلام کی حقیقی خدمت کر سکیں۔ آپس کی منافرت کو چھوڑ کر ایک مرد مسلم بن کر نام آوری حاصل کریں۔

ان ناولوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کوئی ناول بھی شروع کرنے کے بعد جب تک ختم نہ کریں چین نہیں پڑتا۔ طویل سے طویل ناول بھی بلا وقفہ مسلسل مطالعہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ بہر حال میاں ایم۔ اسلم کے تاریخی ناول اپنے گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے تاریخی ناولوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۴)

"ہاں ہاں اس کا باپ بڑا شریف آدمی تھا۔ بڑا اچھا ڈاکٹر تھا۔ اپنے وطن کا ہے مگر اولاد پڑھ لکھ کر اس کا نام روشن کر رہی ہے۔ جیل گئے، قیامت اب نہ آئے تو پھر کب آئے گی" عاصمی صاحب نے حقارت کا اظہار کیا۔

"بڑا اکھراب زمانہ ہے سیٹھ جی۔ بڑا اکھراب زمانہ ہے" منشی جی کہتے ہوئے اپنی کرسی میں دھنس گئے۔

— — — — — — —

ادارے کی جدید ترین کتابیں

دکنی ہندو اور اردو	از مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب	۲،۵۰ روپے
حیدرآباد کے بڑے لوگ	″ جناب غلام پنجتن صاحب	۲،۰۰ ″
نذر محمد قلی قطب شاہ (باتصویر)	مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب	۵،۰۰ ″
ارمغان یوم محمد قلی قطب شاہ	″ پروفیسر مجید صدیقی صاحب	۵۰، ″
سروجنی نائیڈو	از جناب وزیر حسن صاحب	۲،۰۰ ″
گاندھی جی	″ ″ خورشید احمد جامی صاحب	۷۵، ″
طالب و موہنی	مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب	۱،۵۰ ″
تذکرۂ مخطوطات جلد سوم	″ ″ ″ ″ ″	۶،۰۰ ″
میر محمد مومن (نیا ایڈیشن)	″ ″ ″ ″ ″	۳،۰۰ ″
اردو میں سائنسی ادب	از جناب خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد	۵۰، ″

ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

ہائے زمانہ

از:- جناب ظفر عالمگیر صاحب

"تمہارا نام"

"رفیق احمد"

"کہاں تک تعلیم پائی ہے"۔

"میں گریجویٹ ہوں"۔

"بھئی ہمیں تو ایسے کلرک کی ضرورت ہے جو کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ کا کام کر سکے"۔

"میں یہ کام کر سکتا ہوں"۔

"ہمیں میٹرکیولیٹ کی ضرورت ہے اشتہار میں ہم نے میٹرکیولیٹس ہی کو دعوت دی تھی"۔

"میرا خیال ہے کہ میں اس کام کو میٹرکیولیٹس سے بہتر طور پر انجام دے سکوں گا"۔

"آپ نے کسی کمپنی وغیرہ میں کام کیا ہے؟"

"جی ہاں! محمود آباد ٹیکسٹائل اینڈ وولن ملز میں تین برس رہا ہوں"۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ہم آپ کو آپ کی کوالیفیکیشن کے اعتبار سے تنخواہ بھی نہ دے سکیں گے اور۔۔۔"

"آپ جو دیں مجھے منظور ہے"۔

"کل آپ کو کوئی اچھا آفر ملے گا اور آپ یہ نوکری چھوڑ دیں گے پھر ہمیں نئے آدمی کو کام سکھانا پڑے گا"۔

"آپ اس حد تک مطمئن رہیں"۔

"خیر ہم غور کریں گے"۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑے گی اور نہ آپ کی ایجنسی کو کوئی نقصان پہنچے گا"۔

"ہم غور کریں گے"۔

"میں آجکل بہت پریشان ہوں، آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور سات مہینوں سے بیروزگار ہوں"۔

"خیر ہم غور کرنے کے بعد آپ کو فیصلے سے مطلع کر دیں گے"۔

"بجا ارشاد ہے"۔ رفیق اٹھا اور چلا آیا۔

ڈائرکٹر نے کسی قدر تلخ انداز سے اپنی بات دہرائی تھی۔

دوسرے دن وہ پاکستان کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی کے آفس پر پہنچا۔ ڈائرکٹر کہیں گیا ہوا تھا۔ اس نے چپراسی سے معلومات حاصل کیں۔ اسّی روپیہ ماہوار پر کسی نویں جماعت تک پڑھے ہوئے نوجوان کا تقرر ہو چکا تھا۔!!

رفیق نے ایک لمبی سانس لی اور بھاری قدموں سے اپنے کمرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس نے گذشتہ سات مہینوں میں اتنے دفاتر کی خاک چھانی اور اس قدر درخواستیں دیں کہ شمار مشکل تھا لیکن ملازمت کے حصول کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ وہ بے روزگار رہا اور بے روزگار بے یار و مددگار ہوتا ہے۔

یونیورسٹی نے بی ۔ اے کی سند دے کر بیروزگاروں
کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ تو کیا تھا لیکن اسے محمود آباد
ملز میں فوراً ملازمت مل گئی تھی ـــــ لیکن تین سال بعد
ملز کی مصنوعات کے بازار پر دوسرے اعلیٰ درجہ کے
کارخانوں کی مصنوعات نے قبضہ جما لیا جن کو اعلیٰ درجے
کے سرکاری عہدیداروں کی سرپرستی اور تمام تر آسانیاں
حاصل تھیں ـــــ محمود آباد ملز کے مقدر کا ستارہ ڈوبا
تو کتنے ہی غریبوں کے گھروں کے چراغ بجھ گئے اور
کتنے ہی خوشحال گھرانے بے روزگاری کے شعلوں کی زد
میں آگئے ـــــ رفیق کراچی میں تنہا تھا ـــــ اور کالونی
میں ایک کمرہ اس نے کرایہ پر لے رکھا تھا ـــــ وہ ایک
صاحب ذوق نوجوان تھا ـــــ

اس کے خورد و نوش کا انتظام ایک ہوٹل میں تھا

وہ روزانہ شام کو دوست احباب کے ساتھ
ان شاہراہوں کی تفریح کرتا جن سے حسینوں کے کفر
سامان اور قیامت خیز قاتل ادائیں بکھیرتے اور نگاہیں
سمیٹتے گزرتے ۔ وہ ہر اچھی فلم دیکھتا اور بہت اچھی
فلمیں تو کئی بار دیکھ ڈالتا ـــــ

ہر تعطیل کو دوست احباب کے ساتھ اعلیٰ درجہ
کی کسی ہوٹل میں لنچ کا پروگرام ہوتا ـــــ

وہ عمدہ اور قیمتی سگریٹ پیا کرتا ـــــ

کپڑے بھی قیمتی اور نفیس پہنا کرتا ۔

ہر مہینہ دس روپیہ مختلف معموں کو بھینٹ چڑھ جاتا ۔

کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ بیٹھا ساری ساری
رات جوا کھیلتا ـــــ بہت کچھ جیت بھی لیتا ۔ کبھی بہت
کچھ ہار بھی جاتا ـــــ اور ہر مہینہ میں ایک آدھ بار
جام و مینا کا شغل بھی ہو جاتا ـــــ کمل لوازمات کے ساتھ
ـــــ آخر شباب کی انگڑائی بھی تو کوئی چیز ہے ۔ نوجوان
دل سڑکوں سے گزرتی ہوئی ادا فروش اور حیا باختہ
شریف زادیوں کے نظاروں ہی سے تو بہل نہیں سکتا
ـــــ بہرحال وہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے دارالسلطنت
کے اس معاشرہ کی ایک مکمل پیداوار تھا جس نے ۱۹۴۷ء
کے بعد جنم لیا ہے ۔ لیکن ہر مہینہ وہ کچھ نہ کچھ روپیہ بنک
میں محفوظ ضرور کرواتا ـــــ محمود آباد ملز سے اسے جواب
کے ساتھ ساتھ کچھ روپیہ بھی ملا تھا لیکن انتہائی کفایت
کے باوجود پانچویں مہینے بنک نے بھی جواب دے دیا اور
آمدنی کی کوئی سبیل پیدا نہ ہو سکی تھی ۔

اخبارات میں اشتہارات ڈھونڈتے، دفاتر
کی خاک چھانتے اور انٹرویو دیتے ہوئے وہ بیزار ہو چکا
تھا ـــــ اس کی زندگی کا سفینہ حالات کے طوفان کے
رحم و کرم پہ رواں تھا ـــــ

وہ سارا سارا دن کراچی کی عظیم الشان شاہراہوں
پہ مارا مارا پھرتا ـــــ زندگی کا سہارا تلاش کرتے ہوئے ۔

وہ جئے جا رہا تھا اس لئے کہ خودکشی جرم ہے جس
کو خدائے تعالیٰ معاف نہیں فرماتا اور زندگی سے کسی طرح
فرار کی راہ نہیں ۔

اس کی حالت ایک مفکر کی سی تھی جس کو ذہنی
الجھنوں نے کہیں کا نہ رکھا ہو وہ اکثر سوچتا اور سوچتا
ہی رہتا ـــــ اس کی کوفت کا علاج ہی نہ تھا اور کبھی کبھی تو
وہ سڑکوں پر سودائی کی طرح گھومتا ہوا نظر آتا ـــــ

اس کو بہرحال ملازمت نہ مل سکی ۔ اس لئے نہیں
کہ وہ پانچ فٹ دس انچ اونچا تھا یا شیروانی نہ پہنتا تھا
اور نہ اس لئے کہ اس کے سر کے بال رفتہ رفتہ داغِ
مفارقت دے چکے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ مہاجر تھا ـــــ
جو ہندوستان سے تخیلات کی دنیا میں سنہرے جزیرے سجا کر
نکل پڑا تھا اور بے خانماں ہو کر رہ گیا تھا ۔ !!

اس لئے کہ وہ گریجویٹ تھا جب کہ نجی اداروں
اور دفاتر کے ذمہ دار عناصر میٹریکولیٹس کو گریجویٹس پہ

ترجیح دیا کرتے۔ گریجویٹس تعلیم یافتہ ہونے کی بناء پر ملازمت کی پرواہ نہیں کرتے اور اعلیٰ آفیسروں کے حق میں متوقع حد تک فرمانبردار نہیں ہوتے نیز مکھن سے افسروں کی تواضع کرنے کی بجائے اپنا منہ بھر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کوالیفیکیشن کی بناء پر ان کو تنخواہ زیادہ دینی پڑتی حالانکہ میٹریکولیٹ تھوڑی بہت دماغ پاشی اور تجربہ کے بعد وہ کام کم تنخواہ پر کر سکتے ہیں جو ایک گریجویٹ کرتا ہے اور پھر چونکہ میٹرک کامیاب ہونا کوئی قابلِ قدر سند نہیں ہوتی اس لئے میٹریکولیٹ ملازمت کو سر آنکھوں پر سمجھتے ہیں اور تعلیمی اعتبار سے قابلیت کی کمی کی بناء پر افسروں کی ہر ہر ہدایت کو خدا کے احکام کی طرح اٹل تسلیم کرتے ہیں اور مکمل طور پر یار وفادار ثابت ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم کی بناء پر گریجویٹس میں باغیانہ رجحانات پائے جاتے ہیں۔۔۔

اس کے علاوہ رفیق سفارشات کے باب میں صفر تھا۔ اقربا پروری اس کی راہ میں سنگلاخ چٹان کی طرح حائل تھی۔۔۔

اس کی زندگی پر ایک سناٹا طاری تھا اور یہ سناٹا دن بہ دن مہیب اور تکلیف دہ بنتا جا رہا تھا۔ کمرہ کا کرایہ دو مہینوں سے اس نے ادا نہیں کیا تھا۔ ہوٹل کا بل کوئی ڈیڑھ مہینے سے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ اس کی حالت اس قدر گئی گذری ہوگئی کہ کپڑے دھلوانے اور بس سے سفر کرنے تک کو اس کے پاس کچھ نہ رہا۔۔۔ ہوٹل کا مالک اس لئے چپ تھا کہ رفیق برسوں کا پرانا اور مستقل گاہک تھا۔ مکاندار صاحب اس لئے مائل بہ کرم تھے کہ وہ ان کو تین برس سے ہر مہینہ تیس روپیہ پابندی کے ساتھ ادا کرتا آیا تھا لیکن روزانہ زندگی کے ضروری اخراجات کی کفالت کون کرتا۔۔۔

کپڑوں کی دھلوائی۔۔۔!!

سگریٹ اور ماچس۔۔۔!!

بس کا کرایہ۔۔۔!!

وہ بے یار و مددگار تھا۔۔۔ وہ دوست احباب جن کے ہمراہ وہ تین سال سے کراچی کی حسین اور دلفریب شاہراہوں کی گشت لگاتا رہا۔ دعوتوں میں شرکت کرتا رہا۔ فلمیں دیکھتا رہا، میکدوں میں عیش اڑاتا رہا، جوا کھیلتا رہا، رقص و سرود کی محفلوں میں جھومتا رہا، حسن و شباب کے کھلونوں سے کھیلتا رہا۔۔۔ اور دو دو پیسوں کی دیویوں کے قدموں پر ہوس کے ہاتھوں عقیدت کی نذر چڑھاتا رہا۔۔۔ وہ دوست احباب اسے مصائب کے شعلہ زار میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔۔۔!!

ساتویں مہینے اسے ایک بہت بڑے بھاری کیمسٹ کے ہاں امید کی کرن نظر آئی۔۔۔ اسسٹنٹ مینیجر کی ضرورت تھی جو آزادانہ طور پر مراسلت کر سکتا ہو اور اکاؤنٹس جانتا ہو۔۔۔ رفیق کو کمپنی نے منتخب تو کر لیا لیکن پانسو کی شخصی ضمانت طلب کی۔۔۔ رفیق نے ضمانت کا یقین دلایا اور کمپنی نے تقرر کا وعدہ کر لیا۔۔۔ رفیق وہاں سے چلا تو اپنے عزیز ترین دوست انور کے آفس پہنچا۔۔۔

"سناؤ کیسے آئے؟" انور نے بڑی بے رخی سے رسمی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"دو منٹ کے لئے باہر چلو تو سناؤں" رفیق نے اپنی غیرت اور خودداری کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔

"میں باہر سے ابھی آیا ہوں۔ میرا نیا آفیسر نیا آیا ہوا ہے بڑا سخت آدمی ہے۔"

"اچھا!" رفیق کے دل کو ٹھیس پہنچی۔

"سناؤ یہیں سناؤ" انور نے اصرار کیا اور رفیق نے ان کلرکوں کا جائزہ لیا جو برابر بیٹھے ہوئے تھے۔

"آج شام مکان پر رہو گے" رفیق نے دوسری راہ لی

"آج شام! ہاں ہاں ضرور!!"

"کب تک آجاؤ گے مکان پر؟"

"بس ساڑھے پانچ بجے تک پہنچ جاتا ہوں۔"

"اچھا"

"اوہو خوب یاد آیا، آج شام تو آپا کے ہاں جانا ہے۔ ان کی طبیعت کل سے خراب ہے۔ صبح بھائی صاحب کا ٹیلیفون آیا تھا۔" انور نے اداکاری کی انتہا کر دی۔

"میں تم سے بھیک مانگنے نہیں آیا ہوں۔" رفیق نے کسی قدر تیز ہو کر کہا۔ اور برابر بیٹھے ہوئے دو تین کلرکوں نے نگاہیں اٹھا کر دلچسپی کا اظہار کیا۔

"یہ آفس ہے رفیق! قائد اعظم کا مزار نہیں ہے۔"

"کیوں بھول رہے ہو۔ تم انڈیا سے آئے تھے تو دو مہینوں تک بے روزگاری میں تم کو کس نے سنبھالا تھا ــــ کس کے یہاں رہے تم؟" رفیق کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ ــــ دل کے آبگینہ کو ٹھیس لگتی ہے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔

رفیق چلا آیا ــــ اور امجد کے ہاں پہنچا۔ امجد سے اس کے مراسم برسوں سے تھے لیکن دل میں خار کھٹک رہا تھا ــــ امجد نے اسے چائے پر مدعو کیا۔ امجد نے ادھر چائے کا آرڈر دیا اور ادھر داستان کا آغاز کر دیا۔

"کیا سناؤں رفیق بہت پریشان ہوں۔ بیوی انڈیا سے کیا آئی سر پہ قیامت آئی ہے۔ ظالم کا مزاج سنبھلتا ہی نہیں۔ خدا جانے وہ کون سا مرض لاحق ہوا ہے۔ روزانہ پانچ روپیہ کا انجکشن اور سوا روپے کی دوا ــــ یعنی تم یقین جانو بال بال مقروض ہے ــــ پاگل ہونا باقی رہ گیا ہے۔ تمہارے حالات کی اطلاع اکثر ملتی رہی لیکن کیا کرتا۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا رہا۔ یہاں ایک پوسٹ خالی ہوا تھا میں نے تم کو اطلاع دینے کا ارادہ کیا لیکن ہمارے اکاؤنٹنٹ صاحب نے کہا کہ درخواست ابھی دے دو ورنہ کل تک درخواستوں کا انبار لگ جائے گا۔ میں نے فوراً درخواست تمہاری طرف سے ٹائپ کروا کر دے دی لیکن دوسرے دن اسسٹنٹ سکریٹری صاحب کے کسی بہنوئی کے بھائی کے سالے آ گئے اور میں دیکھتا رہ گیا۔ اکاؤنٹنٹ صاحب نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ جیسے ہی گنجائش نکلے تم کو لے لیں گے۔"

رفیق نے امجد کو ضمانت کے متعلق کہا۔ اور امجد سوچ میں پڑ گیا۔

"تم جانتے ہو کہ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ ضمانت دوں، غور کر رہا ہوں کہ کون دے سکے گا۔"

"رسمی چیز ہے یار ان لوگوں نے خواہ مخواہ شرط لگا دی ہے ورنہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

"پاکستان میں تو ہر گلذار کے ساتھ پخ ہوتا ہے اس کے بغیر تو یہاں گاڑی نہیں چلتی۔"

"بہر حال کچھ کرو!"

"ہاں یار کریں گے کیوں نہیں کریں گے۔"

"میں انور کے پاس گیا تھا اس نے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔"

"ارے وہ بڑا کمینہ آدمی ہے۔"

"جب یہ انڈیا سے آیا تھا تو دو مہینے میرے گھر میں رہا میں نے اس کے سارے اخراجات برداشت کئے اور ...."

"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے بس کا کرایہ تک تم دیا کرتے تھے۔ تمہارے سوٹ پہن کر انٹرویو دیا کرتا تھا۔"

"خیر اللہ مالک ہے۔"

"اچھا میں چلوں، اکاؤنٹنٹ صاحب کی نظر پڑ جائے۔" امجد نے کہا اور دونوں ہوٹل سے اٹھے۔

"میں کب آؤں؟" رفیق نے دریافت کیا۔

"کل آجاؤ لنچ تک میں کچھ نہ کچھ کر دوں گا۔"

امجد نے یقین دلایا اور چائے کا بل ادا کر دیا ــــ رفیق چلا گیا ــــ امجد آفس میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

"کہاں تھے؟" پڑوسی نے خیریت پوچھی۔
"آ گئے تھے ایک یتیم زمانہ — چھ پیسے کا پانی پلا کر
ٹال آیا ہوں۔ پانچسو روپے کی ضمانت کے لئے ڈیڑھ سو
روپیہ ماہوار کے کلرک کے پاس آئے ہیں۔ گلدستہ تھما کر
روانہ کر دیا ہوں کل تک سونگھتے پھریں گے" — امجد نے
کہا اور کام میں لگ گیا — !!

دو دن گذر گئے اور رفیق کچھ نہ کر سکا۔ دوسرے
دن شام کو عاصمی صاحب کے دولت خانے پر پہنچا۔ اس کے
مرحوم والد کے رفیقِ کار! ان کا کراچی میں ہزاروں کا
کاروبار تھا —

رفیق نے دستک دی — جواب میں ایک عدد نوکر
برآمد ہوا —

"کس کو پوچھتے ہو؟"
"عاصمی صاحب ہیں؟"
"جی ہاں!"
"ان سے ملاقات کرنی ہے"
"آپ کا نام؟"
"رفیق احمد" — رفیق نے کہا اور ملازم چلا
گیا۔ دو چار لمحوں بعد وہ لوٹ آیا۔
"سیٹھ صاحب پوچھتے ہیں کہ کیا کام ہے آپ کہاں
سے آئے ہیں؟"

"عاصمی صاحب سے کہنا کہ میں ڈاکٹر شفیق احمد
کا لڑکا ہوں" رفیق نے وضاحت کی۔ رفیق کے والد
ڈاکٹر شفیق احمد مرحوم کے تحت عاصمی صاحب کمپاونڈر
تھے لیکن کراچی پہنچ کر وہ سیٹھ حاجی احمد کی لیسوں کے کارخانے
پر معمولی نوکر ہوئے۔ زمانہ بناسپتی گھی کا دیکھا تو مکھن کا
بے دریغ استعمال شروع کیا۔ سیٹھ حاجی احمد کے سر چڑھ کر
بولنے لگے — وہاں سے چھلانگ لگائی تو سیٹھ کی نوجوان
بیوی کے دل میں جا اترے — سیٹھ کا انتقال ہارٹ فیل
ہوا تو اس کی بیوہ کا سہاگ اور کارخانے کے مالک بن بیٹھے۔

"سیٹھ پوچھتے ہیں کہ کیا کام ہے" ملازم نے آکر
کہا اور رفیق سلگ اٹھا لیکن زہر کا گھونٹ پی لیا۔
"ان سے کہنا کہ کچھ کام ہے"
"کل صبح دس بجے سیٹھ کارخانے پر ملیں گے"
ملازم نے آکر اطلاع دی۔

"اچھا تمہارے سیٹھ سے کہنا کہ میں اس باپ کا لڑکا
ہوں جس کے تحت تم دو کوڑی کے کمپونڈر تھے اور صبح
شام گھر کی گوشت ترکاری لا کر دے جاتے تھے سمجھے"
رفیق نے کہا اور چل دیا — نوکر اسے تکتا رہ گیا — !
رفیق مایوس ہو گیا — دو دن گذر چکے تھے اور اسے
ضمانت کے لئے تین دن کی مہلت دی گئی تھی — شام کو
اتفاقاً اس کی نظر ایک اشتہار پر پڑی — روزنامہ "صبح نو"
میں پروف ریڈر کی ضرورت تھی — !!
"صبح نو" — کثیر الاشاعت روزنامہ!!
رفیق کو امید کی کرن دکھائی دی۔

دوسرے دن صبح نو بجے "صبح نو" کے آفس پہنچا۔
ایڈیٹر صاحب نے وقت ملاقات صبح نو تا دس دیا تھا اور
کوئی ساڑھے دس بجے تک رفیق اور چار پانچ امیدوار ان کا
انتظار کرتے رہے — وہ آئے اور انٹرویو شروع ہوا۔

رفیق سب سے آخر میں پہنچا —
"درخواست لائے ہیں آپ؟"
"جی ہاں" — رفیق نے درخواست بڑھا دی۔
"آپ کا خط بہت اچھا ہے" کہاں تک تعلیم پائی ہے"
"میں گریجویٹ ہوں"
"گریجویٹ" — ایڈیٹر صاحب چیخ ہی تو پڑے۔
"جی ہاں"
"آپ کو کوئی اور ملازمت نہ مل سکی"
"جی نہیں"

"کیوں؟" ـــــ ایڈیٹر صاحب نے دریافت کیا اور رفیق نے اپنی دشواریوں اور مصیبتوں کا انتہائی جامع خلاصہ پیش کیا۔

"مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے مگر میں کیا کر سکتا ہوں"

"آپ مجھے موقع دیں اگر ناکارہ ثابت ہو جاؤں تو ایک پائی نہ دیں اور نکال دیں" رفیق نے التجا کی۔

"بھئی ہم پروف ریڈر کو اسی روپے دیتے ہیں۔ آپ دو روز کام کریں گے۔ ادھر کوئی اچھی ملازمت ملے گی ادھر آپ چھوڑ جائیں گے" ـــ

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا میں آپ کو تحریری طور پر یقین دلا سکتا ہوں"

"بھئی ہمیں زیادہ سے زیادہ میٹرک پاس چاہیئے پروف ریڈر کا کام گریجویٹ نہیں کر سکتا۔"

"جناب! آپ ایڈیٹر ہیں۔ حالات کی شدت سے واقف ہیں، عوام کے ہمدرد اور ترجمان ہیں، آپ کو عوام کے مصائب کا شعور ہے۔ آپ بھی مدد نہ کریں تو اب فرشتے تو آنے سے رہے"۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں، ہم بھی آپ کی طرح حالات کا شکار ہیں۔"

"آپ غور فرمائیں کہ ......"

"ہمارے غور فرمانے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ہم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ آپ اس قابل ہیں یا نہیں بس" ـــ ایڈیٹر صاحب نے کہا اور رفیق کمرہ سے نکل گیا ـــ امید کی کرن یاس کی تاریکیوں میں تحلیل ہو جاتی ہے تو انساں کی حالت کس قدر دردناک ہوتی ہے!!

پھر ایک بار رفیق کے ذہن میں کیمسٹ کی طلب کی ہوئی ضمانت کا خیال آیا ـــ ابھی کچھ گھنٹے باقی تھے۔ وہ صدر بس اسٹاپ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہاں جائے ـــ ایک اپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین بھی آدھمکے۔ ہاکر سے رسالہ خریدا اور پاکٹ نکال کر قیمت ادا کی تو رفیق نے پاکٹ پر طائرانہ نگاہ ڈالی ـــ پاکٹ میں کئی سرخ نوٹ دھڑک رہے تھے۔

●

دوسرے دن روزنامہ "صبح نو" کے اداریہ کے تحت ایک مختصر سا نوٹ شائع ہوا ـــ

"اب تک جیب کاٹنے کا پیشہ بدمعاشوں کی حد تک رہا ہے لیکن اب تو تعلیم یافتہ افراد بھی اسے اختیار کر رہے ہیں۔ ہمارے نمائندے نے خبر دی ہے کہ کل صدر بس اسٹاپ پر ایک گریجویٹ رفیق احمد جو سات مہینے پہلے محمود آباد ٹیکسٹائل ملز سے علیحدہ کیا گیا ہے ایک مسافر کی جیب سے پاکٹ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا جب کہ وہ بس میں سوار ہو رہا تھا۔ پولیس موقعہ پر پہنچ گئی اور اس کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"کیا فرمائیں گے وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی اس مسئلہ کے بیچ؟"

●

انور نے اخبار دیکھا ـــ اور پھر اسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی رفیق ہے ـــ اپنے ساتھیوں کی طرف اخبار بڑھاتے ہوئے کہا "وہ آئے تھے نا اس دن میرے محسن! دو مہینے تک جنھوں نے میری سرپرستی کا دعویٰ فرمایا تھا جیب کاٹتے ہوئے پکڑے گئے، ڈوب مرے ہوتے پہلے ہی"

امجد نے اخبار دیکھا اور اپنے ساتھی کلرک سے کہا" آئے تھے نا اس دن یتیم زمانہ! ان کی سرپرستی حکومت نے شروع کر دی ـــ پڑھو!! گریجویٹ ہو کر یہ کرتوت! بڑے مشہور ڈاکٹر کے فرزند ارجمند ہیں یہ"

عاصمی صاحب نے صبح کارخانہ پہنچ کر اخبار نکالا اور ایڈیٹوریل پر نگاہ دوڑائی ـــ ذرا چونکے ـــ رفیق احمد کا نام ان کو کل سے کھٹک رہا تھا۔ ملازم کے سامنے رفیق ان کا بھرم جو بھول گیا تھا ـــ ان کو یاد آیا کہ رفیق ہی ٹیکسٹائل ملز میں ملازم تھا ـــ کارخانے کے منشی جی کو انھوں نے نوٹ پڑھ کر سنایا ـــ منشی جی نے عینک کے موٹے موٹے عدسوں سے اپنی کمزور نگاہیں عاصمی صاحب کے چہرہ پر گاڑدیں "آپ کی پہچان والا ہے؟"

(بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

تبصرے

اردو انسائیکلوپیڈیا | چیف ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالوحید۔ ناشر: فیروز سنز لاہور۔ قیمت اٹھائیس ۲۸ روپے۔

اس کتاب کے ٹائیٹل پر لکھا ہے "اردو ادب میں اپنی نوعیت کی اولیں کتاب جو ادب، اسلامیات، تاریخ، سوانحات، مطالعہ قدرت، معلومات عامہ، سائنسی اور تکنیکی وغیرہم عنوانات پر حاوی ہے جس میں موضوعات کی تشریح و توضیح اختصار مگر جامعیت کے ساتھ کی گئی ہے"۔

ہمیں اس کتاب کا ایک جزو تبصرہ کے لئے ملا ہے جو (۵۲) صفحات کا ہے اور الف ممدودہ پر مشتمل ہے۔ سرسری مطالعے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ بالکل اسی قسم کی ایک کتاب جو الف ممدودہ کے صرف (۹۴) الفاظ پر مشتمل تھی۔ ادارہ ادبیات اردو نے ۱۹۲۴ء میں شائع کی تھی۔ اس میں تصویریں بھی تھیں۔ مضامین نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کئے گئے تھے اور اس نے پورے ہندوستان سے داد حاصل کی تھی۔

زیر تبصرہ کتاب کے الفاظ مخزن علوم وفنون (ادارہ) کا خلاصہ نظر آئے۔ ٹائپ کی طباعت نہایت پاکیزہ ہے لیکن کتابت کی غلطیاں بھی ہیں اور تذکیر وتانیث بھی۔ مثال کے طور پر آبشار کو کہیں مذکر استعمال کیا گیا ہے اور کہیں مونث۔ الفاظ کی تقدیم وتاخیر بھی کھٹک رہی ہے۔ مثلاً آب وہوا اور آبیانہ کے بعد آباد ان اور آباد کاری وغیرہ۔

آذر کا نام حاجی لطیف اللہ بیگ لکھا ہے حالانکہ صاحب آتشکدہ نے لطیف علی بیگ لکھا ہے۔ بعض غیر اہم شخصیتوں کو بھی اس میں شریک کر لیا گیا ہے جس سے احتراز ضروری تھا مثلاً مولانا محمد عالم آسی اور آل رضا۔ اردو ادب میں انھیں کوئی مقام حاصل نہیں۔ اول الذکر بھی عربی کے ادیب ہیں لیکن موخر الذکر محض صفر۔ ان کی بجائے عبدالباری آسی اور آرزو کا ذکر ضرور کیے جاتے تو بہتر تھا۔

بعض مضامین بے حد تشنہ رہ گئے ہیں مسلم لیگ اور کانگریس کے لئے پورا ایک ایک کالم بھی نہیں دیا گیا۔ آگرہ اور آج پر نصف کالم کافی سمجھا گیا۔ پروفیسر آئن اسٹائن پر صرف نو ۹ سطریں لکھ دی گئیں۔ اس کے نظریہ اضافت کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا۔

اگر ناشر نے انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت کی ہمت کی ہے تو اردو کی اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے لیکن ایڈیٹر صاحبان بھی اپنے مبلغ علم سے انسائیکلوپیڈیا کی تمام غلطیوں سے حتی الامکان مبری و منزہ بنانے کی کوشش کریں تو یہ نہ صرف ایک نیک نامی کا باعث ہوگا بلکہ اردو کو ایک انمول کتاب ملے گی جس کو حیات جاوید حاصل ہوگی۔

مجذوب اور ان کا کلام | مرتبہ محمد رضا انصاری۔ فرنگی محل کتاب گھر لکھنؤ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی شاعری پر مرتب کا ایک مضمون اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

کا ایک سیر حاصل مقالہ ہے جو قبل ازیں "معارف" میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد مجذوب کے کلام کا انتخاب ہے جو (۶۰) صفحوں میں جمع کیا گیا ہے۔

مجذوب کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فطری شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں جا بجا تصوف کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں چونکہ آپ اشرف علی صاحب تھانوی کے مرید اور خلیفہ تھے اسلئے رموز تصوف کی طرف اکثر و بیشتر اشارے ملتے ہیں۔ کلام میں بے ساختگی، آمد، سلاست اور روانی بلا کی ہے۔ زبان پر قدرت تامہ حاصل ہے اور محاوروں کو نہایت آسانی کے ساتھ نظم کر جاتے ہیں۔ دو چار شعر سنیئے :-

خدارا رحم کر، اے چارہ گر! اف کیسی گذرے گی
پڑا ہم کو جو دنیا میں نصیب دشمناں رہنا

یہی آتا ہے بس یا اور بھی کچھ تم کو آتا ہے
امیدیں توڑنا، دل خوں کرنا، بدگماں رہنا

ادھر ٹکڑے تھا دامن اور ادھر پرزے گریباں تھا
مگر دیوانگی میں ان پھٹے حالوں بھی خنداں تھا

تن یاسیں پر لباس مصطفیٰ
وہ آئے ہیں نور علیٰ نور ہو کر

رہا عمر بھر چپ میں یوں ان کے آگے
کہ جیسے کچھ ان سے کہا چاہتا ہوں

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لو شمع محفل کی
پتنگوں کی جگہ اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

اس مختصر سے انتخاب میں ایسے کئی جواہر نکل سکتے ہیں۔ ایسے شعراء جن کا پورا کلام شائع نہیں ہو سکتا۔ اگر انتخاب بھی شائع ہو جائے تو یہ ادب کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔ اگر ہمارے ادبی ادارے اس کی طرف توجہ فرمائیں تو آسانی سے گمنام شعرا کا کلام منظر عام پر آ سکے گا۔

حیات وحید الزماں

مرتب محمد عبد الحلیم چشتی۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی۔ قیمت چار روپے

علامہ وحید الزماں حیدر آباد کے ان چند مشہور و معروف علماء میں ہیں جنھوں نے دین کی خدمت میں اپنی ساری زندگی تباہ دی۔ اشاعت علم خصوصاً حدیث کی طرف بہت زیادہ توجہ دی اور اپنے دور کے بہت بڑے محدث تسلیم کئے جاتے رہے۔ یہاں انھوں نے بڑی بڑی خدمات بھی انجام دیں اور دربار آصفی سے وقار نواز جنگ کا خطاب بھی حاصل کیا۔ علامہ موصوف کے ایک ہم درس مولانا فضیلت جنگ بانی مدرسہ نظامیہ بھی رہ چکے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ بعض کتابیں مولانا نے علامہ وحید الزماں سے بھی پڑھی تھیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں علامہ موصوف کی زندگی اور ان کے کارناموں کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی خاندانی حالات اور تعلیم و تربیت، ملازمت، علوم سے شغف، اخلاق و عادات، ہجرت اور وفات، قومی خدمات، علمی خدمات۔ ان عنوانات کے تحت کافی مواد جمع کیا ہے بعض مقامات پر تکرار کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور زبان میں قدرے قدامت ہے لیکن کتاب دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔

پی بتیاں

پی۔ من باسی (ایم اے)۔ ناشر شردھ ساہتیہ سدن۔ سلطان بازار۔ صفحات (۲۸۰)۔ مجلد اور گرد پوش۔ قیمت تین روپے چار آنے۔

یہ کتاب پی۔ من باسی کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا تعارف تمکین کاظمی صاحب نے لکھا ہے۔ ہر افسانہ اصلاحی تاثر کے کسی نہ کسی خرابی کو پیش کرتا ہے۔ پی من باسی صاحب کے قلم میں روانی بلا کی ہے اور وہ اپنے قاری کو اپنے خیالات

کے ساتھ لے چلتے ہیں۔ کہیں ایسے واقعات نہیں جنھیں غیر فطری کہا جا سکے اور نہ کہیں مخرب اخلاق اجزا ملتے ہیں۔ اپنے کرداروں کی تصویر بڑی خوبی سے پیش کی ہیں۔ افسانے بہ حیثیت مجموعی سماج سدھار کرتے نظر آتے ہیں

فروغ اردو۔ جنگ آزادی نمبر ۱۸۵۷ء | ماہنامہ "فروغ اردو" لکھنؤ نے ۱۸۵۷ء میں اپنا جنگ آزادی نمبر شائع کیا ہے اس میں جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق لکھنؤ سے ہے اور گرانقدر مواد فراہم کیا گیا ہے۔ پرچہ میں جملہ آٹھ مضامین ہیں ہے اور ہر عنوان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کئی رسائل نے اپنے آزادی ۱۸۵۷ء خاص نمبر شائع کئے ہیں۔ فروغ اردو نے بھی اپنا حصہ ادا کیا ہے اور کسی سے پیچھے نہیں۔

سرود جاوداں | صائب عاصمی۔ مکتبہ قلندری لاہور۔ مجلد قیمت چھ روپے۔ صفحات (۲۱۶)۔
۱۹۴۲ء میں صائب عاصمی کا ایک مجموعہ کلام "چراغ لالہ" شائع ہوا تھا اور اب دوسرا مجموعہ سرود جاوداں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شاعر نے اپنی زندگی انتہائی فلاکت اور مصیبت میں گذاری ہے اور اس کے باوجود تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگریاں بھی حاصل کی ہیں۔ ابتدائی زندگی کی جھلکیاں کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ شاعر نے جب حضرت میر بابا جی کی بارگاہ میں رسائی حاصل کی تو تصوف کا ذوق بھی پیدا ہوا اور حضرت موصوف کی نگاہ فیض اثر نے تصوف کے چند منازل طے کرنے میں شاعر کی مدد کی ہے جس کا اظہار صائب نے اپنے مقدمہ میں کیا ہے۔ کتاب میں نظمیں، غزلیں، رباعیاں وغیرہ ہیں۔ غم جاناں اور غم دوراں کے ساتھ ساتھ شاعر نے اپنے کلام میں تصوفانہ خیالات کا بھی اظہار کیا ہے اور اس طرح کلام قابل مطالعہ ہے۔

علیؓ اور ان کی خلافت | پیام شاہجہاں پوری۔ اشاعت منزل لاہور۔ مجلد گرد پوش سے مزین۔ قیمت پانچ روپے صفحات (۴۰۰)۔

اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں اس سلسلے میں کافی مواد اکٹھا ہو گیا ہے۔ لیکن جتنی کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں مصنفین کی عقیدت کارفرما نظر آتی ہے اور بڑے بڑے مورخ بھی حق تاریخ گوئی بالکلیہ ادا نہ کر سکے۔ پیام صاحب نے اپنے پیش لفظ میں صلاح الدین احمد صاحب مدیر" ادبی دنیا" کا یہ قول بالکل صحیح نقل کیا ہے کہ یہ کام اپنے ذمہ لے کر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے۔ کتاب کے تفصیلی مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے تاریخ نگاری کا حق ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کیا عجب کہ یہی کتاب حشر میں ان کی مغفرت کا باعث بنے۔

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ | پروفیسر سید احتشام حسین۔ دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔ خوب صورت گرد پوش۔ صفحات (۱۴۸)۔ قیمت دو روپے۔

لسانیات سے تعلق رکھنے والے جان بیمز کی مختصر کتاب" این اینڈ اوٹ لائن آف انڈین فیلالوجی" سے ناواقف نہیں۔ یہ کتاب اسی کا ترجمہ ہے۔ لیکن فاضل مترجم نے مختلف مقامات پر حواشی دے کر اس کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ جہاں مترجم کو واقعہ سے انحراف معلوم ہوا اس کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ اس کے علاوہ سب سے اہم اور دلچسپ امر احتشام صاحب کا وہ مقدمہ ہے جو (۶۶) صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس میں موصوف نے لسانیاتی ارتقاء کا از ابتدا تا ایں دم سرسری جائزہ لیا ہے۔ مقدمہ کی خوبی یہ ہے کہ باوجود انتہائی خشک مضمون ہونے کے حد درجہ دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ نہ صرف لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے بلکہ عام لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ادبی رجحانات کا تجزیہ

از راجیندر ناتھ شیدا۔ ناشر: آستانہ بک ڈپو۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۰۶۔ جامع مسجد دہلی۔ صفحات (۱۰۶)۔

زیر نظر کتاب سات تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ہے جن میں تین مضامین "نئے ادبی رجحانات اور ان کا تجزیہ"، "پریم چند اور ترقی پسند نقاد"، "اقبال کے اساسی نظریات" قابل ذکر ہیں۔ راجیندر ناتھ شیدا کے طریقۂ تفکر اور زبان و بیان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف زبان، ادب اور تاریخ پر ایک نظر رکھتے ہیں۔ تنقید کا لب و لہجہ بھی سنجیدہ ہے اگر چہ کہ کہیں کہیں کڑی تنقید تلخی کا حکم رکھتی ہیں اور بقول ان کے ان کی "تنقید کی تہہ میں ادیب کی نظر کے موانعات کو ہٹا کر اس سے بہتر ادب تخلیق کرانے کی تمنا ہے"۔ اسی طرح "نئے ادبی رجحانات اور ان کا تجزیہ" میں "انتشار کے عوامل کو روشنی میں لانے اور ادب کے موجودہ مسائل کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے"۔ "پریم چند اور ترقی پسند نقاد" میں مشہور ترقی پسند نقاد احتشام حسین، علی سردار اور ہنس راج رہبر پر ایک سخت تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جس میں ترقی پسندوں کے ذہنی انتشار کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نہایت صاف اور صریح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ "جب ترقی پسندی کا کوئی واضح تصور ہی ان کے ذہن میں نہیں ہے تو پریم چند پر اس کے انطباق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"۔

"اقبال کے اساسی نظریات" میں اقبال کی اسرار خودی اور رموز بے خودی کو پیش نظر رکھ کر ان کے فلسفۂ خودی اور بے خودی کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے تصور شاہین اور نظریۂ صلابت و قوت کو ناقابل عمل قرار دیا ہے اور کہا ہے "جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے فرد کی طاقت گھٹتی جاتی ہے۔ اس لئے عہد حاضر کے نظام عالم میں کوئی دائمی اور دیرپا تبدیلی پیدا کرنے کے لئے اجتماعی اور منظم کوشش ضروری ہو گئی ہے۔ آج انفرادی اور غیر منظم عمل اس لہر کے مانند ہے جس کا وجود اس کی فضا کی گود میں کھیلتا ہے"۔ آگے چل کر اقبال کے "خرد" کو قومی روایات کا حامل دیکھ کر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اقبال کی شاعری میں رجعت پسندی کے عناصر اسی عقیدہ کا شاخسانہ ہیں"۔ ایک جگہ اقبال کے نظریۂ وطنیت کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "دور حاضر کی وطنیت کوئی بت نہیں جسے اندھوں کی طرح پوجا جاتا ہے بلکہ ایک اسپرٹ ہے جو مخصوص جغرافیائی حدود میں انتظامی سہولت اور تعمیری اور دفاعی قوت پیدا کرتی ہے اور قوم کو منازل طے کرنے میں مدد پہنچاتی ہے۔ آج وطنیت کا کوئی سنجیدہ تصور دوسروں کو لوٹنا اور دوسری قوموں سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا بلکہ باہمی استفادہ کے لئے دوسروں سے تعاون کا سبق دیتا ہے"۔ اور سب سے آخر میں بڑے شد و مد سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "معقول جذبات اگر قوم کا مستقبل بنا سکتے ہیں تو نامعقول اشتعال انگیزی اس کے لئے بے حد خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں اشتعال انگیزی کے عناصر موجود ہیں جن کو کوئی منطق حق بجانب قرار نہیں دے سکتی۔ اس لئے ہمیں اقبال کو کسی قدر احتیاط سے پڑھنا چاہیئے"۔

اسی مضمون کے خاتمہ پر رسالۂ شاعر کے اڈیٹر کے جواب کو بھی چھاپا گیا ہے جس میں انھوں نے اقبال کو ان الزامات سے بری کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے جواب الجواب میں شیدا صاحب اس کو ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ "اس تصور پرستی نے اقبال کے ذہن میں ہندوستانی قوم کا کوئی صحیح نظریہ پیدا ہونے نہیں دیا۔ ان کی قومیت نہ تہذیبی اصول پر قائم تھی نہ جغرافیائی حدوں کی بنیاد ایمان پر تھی۔ یہ قومیت وطن کیلئے مفید کم تھی اور مضر زیادہ"۔

تقسیم ہند کے بعد اقبال کو اہل ہند نے عام طور پر ایک سیاسی حریف گردانا۔ جس کے متعلق یہ الزام ہے کہ انھوں نے نظریۂ پاکستان پیش کر کے ہندوستان کے ٹکڑے کر دیئے۔ ہندوستان میں یہ رائے کچھ اس طرح عام ہوئی ہے کہ اب

اہل ہند باوجود ان کی شاعرانہ خوبیوں، اعلیٰ صلاحیتوں اور فلسفیانہ اور منطقی استدلال کو تسلیم کرنے کے ان سے ڈرنے اور بچنے لگے ہیں چاہے اس میں کوئی سیاسی مصلحت ہو یا مذہبی دور اندیشی۔ ان حالات میں اقبال کو اپنے طرز تفکر اور طریقۂ استدلال میں حق بجانب قرار دینے کی کوشش جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اصح السیر تالیف مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری۔ ناشر نور محمدؐ کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔ صفحات (۶۸۰)۔ قیمت دس روپے۔

سیرۃ النبیؐ ہمارے علمائے کرام کا محبوب موضوع رہا ہے۔ عربی اور اردو میں اس سلسلے میں بے شمار کتابیں تصنیف ہوئیں اور بعض نے شاہکار کا درجہ حاصل کیا۔ سیرۃ النبی (شبلی)، رحمۃ للعالمین، تواریخ حبیب الہٰ، ترجمہ شمائل ترمذی، النبی الخاتم وغیرہ نے کافی شہرت حاصل کی اور ہر عالم نے کوئی نہ کوئی جدت اپنی تصنیف میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب کے لئے سرمایۂ آخرت ثابت ہوگی جس میں آنحضرت صلعم کی زندگی کے کسی پہلو کو تشنہ رہنے نہیں دیا گیا۔ اور بعض ایسے مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو انتہائی پیچیدہ ہیں اور مرتب موصوف اس امر سے بڑی خوبی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں فقہی مسائل پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے عامۃ المسلمین کے لئے بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے کہ جو فقہی مسائل کی چھان بین کی استعداد نہیں رکھتے اس کتاب سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ مولانا نے ترتیب کتاب کے موقع پر عربی کی مستند سیرت کی کتابوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور فقہی کتب سے بھی مدد لی ہے۔ عربی اسماء کا تلفظ عوام صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے اس لئے اس کی صحت کے اظہار میں اکثر جگہ فٹ نوٹ میں کر دیا گیا ہے۔ غرض کتاب ایسی ہے کہ ہر شیدائے رسول کو اس کے مطالعہ کی سعادت حاصل کرنی چاہیئے۔

کتاب الصلوٰۃ تالیف:۔ حضرت امام حنبلؒ۔ مترجمہ شیخ علی جواد۔ ناشر:۔ نور محمدؐ کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی۔ صفحات (۱۵۴)۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

کارخانہ تجارت کتب کی یہ دوسری کتاب ہے جس کو علی جواد صاحب نے پیش کیا ہے۔ اس میں ابتدا میں حضرت امام حنبلؒ کی زندگی کے حالات (۷۰) صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور کتاب کا یہ حصہ بہت اہم ہے۔ جو مسائل بہ شکل فتنہ اٹھے اس کا حضرت امام موصوف نے کس طرح مقابلہ کیا۔ باوجود انتہائی اذیتوں کے خلق قرآن کے مسئلہ میں انھوں نے اپنی گردن خم نہ کی۔ ان واقعات کا بیان نہایت تفصیل سے کیا گیا ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل کی کتاب الصلوٰۃ کا ترجمہ بھی نہایت شستہ و رفتہ زبان میں کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے اہل اسلام پر نماز کی اہمیت کا اظہار ہوگا۔ کارخانہ تجارت کتب نے ان کتابوں کی اشاعت سے اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

نتیجہ اردو امتحانات بابتہ جولائی ۱۹۵۸ء

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ۱۹، ۲۰، ۲۱ جولائی کو حیدرآباد اور نرمل کے مردانہ اور زنانہ مرکزوں میں ایک ساتھ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات لئے گئے۔ ان میں جن امیدواروں نے کامیابی حاصل کی ان کے نتائج درج ذیل ہیں۔ اردو فاضل کے امید وار کامیاب نہیں ہوئے۔ خواجہ حمید الدین شاہد
(معتمد اردو امتحانات)

امتحان اردو دانی

کامیاب بہ امتیاز (مرکز بلدہ)

رول نمبر ۱۔ سید خواجہ جنید اللہ

کامیاب

رول نمبر ۲۔ ایم۔ کے۔ اچاریہ
" ۳۔ ایم۔ جکڑیا
" ۴۔ سوریا نارائن راؤ

کامیاب بہ امتیاز (مرکز نرمل)

رول نمبر ۸۔ امۃ اللہ بیگم
" ۱۲۔ سید اظہر علی
" ۱۳۔ عبد النعیم

کامیاب

رول نمبر ۹۔ عاصمہ
" ۱۰۔ آمنہ شہزادی
" ۱۱۔ عائشہ شہزادی
" ۱۴۔ محمد خورشید علی

امتحان اردو زبان دانی

بلحاظ نشانات محصلہ (مرکز نرمل)

رول نمبر ۹۔ زمرد بیگم اول
" ۴۔ سید ساجد علی دوم
" ۲۔ محمد امیر الدین سوم

بلحاظ رول نمبر — (مرکز نرمل)

رول نمبر ۱۔ سید عبد الصمد دوم
" ۲۔ محمد امیر الدین اول
" ۴۔ سید ساجد علی اول
" ۵۔ سید فیض الدین دوم
" ۶۔ سید خواجہ مشتاق علی دوم
" ۷۔ محمد اکبر اول
" ۸۔ صفیہ سلطانہ دوم
" ۹۔ زمرد بیگم اول

امتحان اردو عالم

بلحاظ نشانات محصلہ —

رول نمبر ۳۔ شاہ حبیب احمد اول (مرکز بلدہ)
" ۸۔ یحیٰی بن علی دوم (مرکز نرمل)
" ۴۔ اے راجیشور ریڈی سوم (" ")

بلحاظ رول نمبر —

رول نمبر ۲۔ عابدہ صابرہ دوم
" ۳۔ شاہ حبیب احمد دوم
" ۴۔ اے۔ راجیشور ریڈی دوم (مرکز نرمل)
" ۶۔ گلشن راؤ سوم " "
" ۸۔ یحیٰی بن علی دوم " "

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

جلد ۲۲ شمارہ (۹-۱۰)

ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۸ء

نگران: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ
رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
جانکی پرشاد

چندہ سالانہ: چھ روپے سکۂ ہند
ششماہی: تین " "

قیمت: پچاس نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے "نیشنل فائن پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

فہرست

نظمیں:-

معذرت	فیروز نظر	۲
قطعات	تاج کرہنگری	۳
سکون دوام	اجد ادیب بریلوی	۴
اجنبی خواب	منظر ایوبی	۵

غزلیں:-

ظفر عالمگیر	۵
الطاف شاہد ۔ ابوسعد سید اسمٰعیل سیّد	۶
انوار ظہوری ۔ نازش پرتابگڈھی	۷
دور آفریدی ۔ سعادت نظیر	۸

مقالے:-

شہید دہلوی	ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور	۹
فارسی علم وادب کے ارتقاء میں برہانپور کا حصہ	جناب شیخ فرید صاحب برہانپوری	۱۷

افسانے:-

ایک مکھی اور کئی مکڑیاں	" گجندر سنگھ صاحب	۲۵
دوڑ	" صابر کوسگوی صاحب	۳۲

تبصرے ۳۴

فیروز نظر

معذرت

میں اپنے دل سے مٹا دوں غم و الم کے نقوش
تو چاہتا ہے کہ خوشیوں کے گیت گاؤں میں
ہلالِ عید، جو تجھ کو خوش آمدید کہے!!
میں سوچتا ہوں کہ وہ دل کہاں سے لاؤں میں

○

یہاں جو نکلا ہے شاید تو راہ بھول گیا
یہ ملک وہ ہے، یہاں ایسے لوگ بستے ہیں
جو زندگی کو سمجھتے ہیں خود پہ بارِ گراں
قدم قدم پہ جنھیں غم کے ناگ ڈستے ہیں

○

یہ وہ چمن ہے کہ فصلِ بہار میں بھی جہاں
کلی اداس ہے، مسرور کوئی پھول نہیں
ہزار آنکھوں سے دن رات اشک بہتے ہیں
برائے نام ہیں وہ لوگ، جو ملول نہیں

○

ملوں میں کپڑے کے انبار لگ رہے ہیں مگر
ہزار جسم، کہ بیگانۂ لباس ہیں آج
خوشی کی لہر کا کوسوں نشاں نہیں ملتا
دلوں کی بستی پہ رنج و الم کا ہے اب راج

تاج کرمنگیری

قطعات

کچھ اشارات پیش کرتا ہوں
کچھ کنایات پیش کرتا ہوں
ہے غزل پھر غزل، مگر سنیئے
چند قطعات پیش کرتا ہوں

○

دل کے جذبات پیش کرتا ہوں
اپنے حالات پیش کرتا ہوں
ہو رباعی کہ قطعہ، واقعتہً
اپنی ہی بات پیش کرتا ہوں

○

فضائے طور یہاں سوگوار کب سے ہے؟
تیرے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
یہ انتظار، یہ حسرت، یہ شوق کا عالم:
نہ پوچھ کیفیتِ اضطرار کب سے ہے

○

فریب خوردۂ فصلِ بہار کب سے ہے
رہینِ منتِ برق و شرار کب سے ہے
ہنسی سی آتی ہے، بلبل کی سادہ لوحی پر
کہ چار تنکوں کی امیدوار کب سے ہے

سکونِ دوام

ماجد ادیب بریلوی

نکہت و رنگ و نور کی وادی گلشنِ آب و گل کی شہزادی
تو سکون و قرار ہے میرا مسکنِ خوشگوار ہے میرا
میں تجھے دل سے پیار کرتا ہوں اپنا سب کچھ نثار کرتا ہوں
تجھ کو وہ بات یاد تو ہو گی دل کی ہر بات یاد تو ہو گی
جب کوئی تشنہ کام و ناکارہ شاعرِ غم نصیب و آوارہ
چاندنی رات کی بہاروں میں جھلملاتے ہوئے نظاروں میں
گیسوئے غم سنوارنے کے لئے چند لمحے گزارنے کے لئے
تیری جنت ترے شبستاں میں تری دنیا ترے گلستاں میں
آتشِ سوزِ کائنات لئے داستانِ غمِ حیات لئے

خواہشِ جام لے کے آیا تھا
سر پہ الزام لے کے آیا تھا

اور تو نے بڑی عقیدت سے جوشِ تعظیم سے محبت سے
اپنے شاعر کے خیر مقدم میں رات کے پُر سکوت عالم میں
چاندنی رات کی حسیں محفل رقص و نغمات کی حسیں محفل
اپنے جلووں سے جگمگائی تھی نکہت و نور سے سجائی تھی
ساغرِ زندگی پلائے تھے میرے دل کے کنول کھلائے تھے
تیری آغوش تیری خلوت میں تیری دنیا میں تیری جنت میں

وہ سکونِ دوام پایا تھا
وہ نیا گیت گنگنایا تھا

جس پہ قرباں سیکڑوں نظمیں رقص و نغمات کی حسیں بزمیں
زندگی جس سکونِ دل کیلئے بادۂ سوزِ غم کے جام پئے
ہر الم ہر ستم اٹھاتی ہے ہر قدم پر فریب کھاتی ہے
خارزاروں میں مسکراتی ہے پیار کے گیت گنگناتی ہے
غم اٹھاتی ہے خون روتی ہے تب کہیں بہرہ نصیب ہوتی ہے

یہ سکونِ دوام کی دولت
یہ بہاروں کی دلنشیں جنت

لیکن اپنے سکونِ دل کیلئے کیا جلاتا میں زندگی کے دیئے
تو بھی ماحول سے گریزاں ہے رنج و آلام سے پریشاں ہے
شب بداماں ہے تیری صبحِ حیات تو بھی پاتی نہیں الم سے نجات
تیری دنیا میں بھی اندھیرا ہے دور تجھ سے نیا سویرا ہے
ہر قدم پر ترے تباہی ہے رنج و آلام میں سیاہی ہے
قابلِ رحم تیری حالت ہے تجھ کو بھی پیار کی ضرورت ہے

لیکن اس دور کے شبستاں میں
درد و آلام و غم کے زنداں میں

زیست کو راستے نہیں ملتے امن کے پھول اب نہیں کھلتے
لبِ انساں پہ زر کی باتیں ہیں ایٹم و شور و شر کی باتیں ہیں
پیار کا احترام کچھ بھی نہیں زیست کا اہتمام کچھ بھی نہیں

حشرِ خاموش ہو گئی ہے حیات
یاس بر دوش ہو گئی ہے حیات

لیکن اے ہمنشیں ملال نہ کر تو کسی بات کا خیال نہ کر
رنگِ انساں بدلنے والا ہے نظمِ دوراں بدلنے والا ہے
مسکرائے گی زندگی کی بہار لوٹ آئے گا بزمِ گل کا نکھار
گیت گائیں گے سب محبت کے دورِ تعمیر کے شرافت کے
اور تیرے لئے ترا شاعر شرحِ امنِ دوام کا ناشر
زندگی کی بہار لائے گا بزمِ گل کا نکھار لائے گا
امن کی کائنات لائے گا نورِ بزمِ حیات لائے گا
پیار کا احترام لائے گا اک سکونِ دوام لائے گا
اور تیری حسین محفل میں صدق و مہر و وفا کی منزل میں

زیست کے روز و شب گزارے گا
کاکلِ زندگی سنوارے گا

منظر ایوبی

اجنبی خواب

ند پڑنے لگے تیرگی کے نشاں — جادے جادے پہ صبحِ طرب ضوفشاں
نفس مطمئن ہر نظر شادماں — منزلِ شوق پر آگیا کارواں
بھولے بھٹکے مسافر گلے مل گئے
چاک دامانِ شام و سحر سل گئے

م مسرت کے سانچے میں ڈھلنے لگے — نغمے تنہائیوں میں مچلنے لگے
لمتوں کے جنازے نکلنے لگے — فتح و نصرت کے قندیل جلنے لگے
رہبری خضر کی آج کام آگئی
زندگی منزلِ زندگی پا گئی

شان ہر نزل پہ رقصاں تبسم کی ضو — انقلابی فضا میں صداقت کی لو
نظر مرکزِ جلوۂ نو بہ نو — نیز تر آج ہے ہر رہرو و مست رو
آسماں لعل و گوہر لٹانے لگا
تاجِ اہلِ زمیں جگمگانے لگا

وں سے گلستاں مہکنے لگے — نرم شاخوں پہ غنچے چٹکنے لگے
ر پھولوں کے چہرے دمکنے لگے — طائرانِ بہاراں چہکنے لگے
کام، دورِ خزاں کا جنوں آگیا
قلبِ مضطر کو جیسے سکوں آگیا

○

منتشر ہو گیا سلسلہ خواب کا
رنگ فق پڑ گیا روئے مہتاب کا
پھر وہی تیرگی تھی، وہی کارواں
منزلوں دور تھا، منزلوں کا نشاں

○

جمالِ یار میں اگلی سی دلکشی نہ رہی
گلوں کے حسن میں یعنی تازگی نہ رہی

چراغ تو ہیں مگر ان میں روشنی نہ رہی
جہاں کی بزم تو ہے شمعِ زندگی نہ رہی

وجودِ ماہ تو باقی ہے چاندنی نہ رہی
چمن میں یعنی گلوں کی شگفتگی نہ رہی

جہاں میں کوئی تغیر ہوا تو بس یہ ہوا
ہر ایک رسم رہی، رسمِ دوستی نہ رہی

تری نگاہِ کرم کی ادائیں، کیا کہیے!
کبھی رہی تو رہی رات دن کبھی نہ رہی

کہیں کے بھی نہ رہے جو تری نظر سے گرے
اک آس تھی کہ قضا ہے یہ آس بھی نہ رہی

مری نظر میں سمائے ہیں آپ کچھ اس طرح
میرے حضور! کسی شے میں دلکشی نہ رہی

مذاقِ شعر ترنم کے دم سے زندہ ہے
پیمبری کہیں جس کو وہ شاعری نہ رہی

اداس ایک زمانے سے کیوں ہے بزمِ ظفر
ہمیں بدل گئے یا پھر وہ زندگی نہ رہی

ظفر عالمگیر

○

نہ مل سکا ہے نہ مل سکے گا کہیں وفا کا سراغ ہم کو
مئے وفا سے اس انجمن میں ملے ہیں خالی ایاغ ہم کو

تری نظر سے ہمیں ہے نسبت شراب سے کیا سرور ہوگا
تری نظر سے غرض رہی ہے نہ دے خدارا ایاغ ہم کو

کچھ ایسا بدلا نظام عالم کہ راہزن بن گئے ہیں رہبر
جو ظلمتوں میں بھٹک رہے تھے دکھا رہے ہیں چراغ ہم کو

الجھ رہے تھے غموں سے پہلے الجھ رہے ہیں غموں سے اب بھی
وہی تڑپ ہے وہی خلش ہے ہوا نہ حاصل فراغ ہم کو

تلاش مہر و وفا میں ہم تو وطن کو چھوڑا دکن سے نکلے
وفا کا رنگ اڑ گیا ہے شاید ملا نہ اب تک سراغ ہم کو

دعا شب و روز کر رہے ہیں رہا نہ ہو پائیں ہم قفس سے
قفس سے نسبت جو ہو گئی ہے نہ راس آئے گا باغ ہم کو

تھی جن سے امید ہمنوائی وہی رقیبوں کے راز داں ہیں
بھروسہ کس پر کریں گے شاہد دیا ہے اپنوں نے داغ ہم کو

الطاف شاہد

○

باغوں میں بہار آئی تو کیا کانٹوں کی سیاست کیا ہوگی
جو جور خزاں کے ہوں خوگر پھر ان کو شکایت کیا ہوگی

پھولوں کی حفاظت کے ضامن در اصل ہیں کانٹے گلشن کے
جب رنگ بہاراں نکھرے گا دیوانوں کی حالت کیا ہوگی

آغاز محبت میں ہم نے انجام محبت دیکھ لیا
پھر دل کے قریب ہے برق نگہ اب اور عنایت کیا ہوگی

اک دل تھا بچارا پہلو میں زلفوں کی امانت ہو کے رہا
ہے جان حزیں پر چشم کرم اب اور خیانت کیا ہوگی

پھر ان کی نگاہ قہر سے کیوں آثار محبت ہیں پیدا
انجام محبت دیکھ چکے اب اور شکایت کیا ہوگی

تھا رنگ چمن نکھرا نکھرا آتا ہے نظر بگڑا بگڑا
ہے شیشۂ دل ستھرا ستھرا پھر اس کی حالت کیا ہوگی

جمہور کی طاقت میں سید جینے کے سہارے ہیں مضمر
دولت کے رسولوں کو ہو خبر اب ان کی رسالت کیا ہوگی

ابوسعد سید اسمٰعیل

وصل کیوں اے بے خبر ہے — جو طولِ شب ہی تا حدِ سحر ہے
آرزو دانگ تر ہے — وفورِ شوق یہ ذوقِ نظر ہے
ستان دونوں بھی رنگ پر ہے — فقط اک حسن ہی پیشِ نظر ہے
دیکھو وہ اپنا راہ بر ہے — یہ کیسی راہ یہ کیسا سفر ہے
کتے چاند سورج گردِ منزل — نظر دالو، یہ میری رہگذر ہے
ہر افق سے بے محابہ — زمانے کی فقط اس پر نظر ہے
ہے ہیں تعظیم محبت — نہ تم سمجھے نہ تم کو یہ خبر ہے
بس نے دلائی تھی توجہ — وہ کیفیت باندازِ دگر ہے
نے شورِ دید بخشا — ہمارے حال سے وہ بے خبر ہے
لبوں آ تا ہی نہیں دل — جوانیِ جانِ من اک دردِ سر ہے
کیا ہو گیا ہے پاسبانو — یہ کیسی حالتِ دیوار و در ہے
زندہ تری تنہائیوں میں — کوئی نظارۂ جلوت اثر ہے

نہ ہو تکمیلِ الفت کا ارادہ
توجہ آپ کی انوار پر ہے

انوار ظہوری

کھلتے ہوئے لب پر دنیا نے
چھلکائے کیا کیا افسانے
چٹکی کلی درکے پیمانے
دل کا درد کوئی کیا جانے

برقِ تپاں ہوں اور نہ صرصر
گلشن کیوں مجھ کو پہچانے
کون ہوا مایوسِ نوازش
کس لئے بول اٹھے دیوانے

بخشش تو دیں آپ ایک تبسم
گیت بنالیں گے دیوانے
آپ الگ مائل بہ کرم ہیں
درد الگ اٹھا بہکانے
غم کی نشاط آگیں نظروں نے
چوم لئے ٹوٹے پیمانے
راہ گری سے بیگانوں کو
لوٹ لیا نقشِ کفِ پا نے

نازش پرتاب گڈھی

میں اور کھیلوں زلفِ شکن در شکن کے ساتھ
دل بستگی سی ہے مجھے صبحِ وطن کے ساتھ

چشمک ہے برق و باد کو میرے چمن کے ساتھ
یہ بھی لگے ہیں تاک میں چرخِ کہن کے ساتھ

سرخی شفق کی دیتی ہے پیغامِ صبحِ نو
سورج طلوع ہوتا ہے خونیں کرن کے ساتھ

جو کشتِ زار جہد پہ شاداب ہاں لٹا
اٹھے وہ موجِ مرحبا گنگ و جمن کے ساتھ

مستقبل قریب سے امیدِ نیک ہے
ماضی اگرچہ گزرا ہے رنج و محن کے ساتھ

نعرۂ حریت کو ختم ہی کر دیں گے دیکھنا
اب ہم قدم اٹھاتے ہیں تیغ و کفن کے ساتھ

اڑتی ہے "سامراج" کے منہ پر ہوائیاں
خورشید "ایشیا" کی سنہری کرن کے ساتھ

اس واسطے کہ دوست کی دشمن سے ہو شناخت
ہے ربط میرے نغموں کو حبِ وطن کے ساتھ

ممکن نہیں اصول میں پیدا ہوں جنبشیں
پتّے فقط گزرتے ہیں بادِ چمن کے ساتھ

اے دوست! انقلاب کی تصویر دیکھ لے
دہقان ہے اپنے کھیت میں کس بانکپن کے ساتھ

یہ راز کاش! آج کے انسان پر کھلے
سوداگری بھی ہونے لگی علم و فن کے ساتھ

ذروں میں بڑھتی جاتی ہے گرمی حیات کی
مشرق کا وہ نکھار ہے پہلی کرن کے ساتھ

کس نے کہا نظیرؔ کہ پھوٹی نئی کرن
نکلا ہے آسمان پہ سورج گہن کے ساتھ

سعادت نظیر

پہلے پہل ہر جادۂ منزل
آخر آخر صرفِ مرادِ دل
بادہ بجام اور رقص کی محفل
عقل سے کوسوں دور مرادِ دل
ان کے پیچھے پیچھے خدائی
اور زمانہ میرے مقابل
چھوڑ دے کشتی بخت پہ لیکن
دور ہوا جاتا ہے ساحل
پی کے ایسا کھل جاتا ہوں
جیسے کلیوں کا مستقبل
عشق کے مجرم توڑ نہ ڈالیں
سنتا ہوں آوازِ سلاسل
دورؔ کہ اک پروانۂ فطرت
جانِ دورؔ کہ شمعِ محفل

دورؔ آفریدی

شہید دہلوی

از ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

میر احمد علیخاں ولد سید جعفر علی خاں ولد سید نوازش علی خاں گجرات کے صوبہ دار نواب سربلند خاں دلاور جنگ مبارز الدولہ مبارز الملک کی اولاد میں تھے جو محمد شاہی امرا میں سے تھے ۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی ۔ شاعری میں شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے ۔ عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے ۔ نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے عہد حکومت میں غالباً ۱۲۳۵ھ میں حیدر آباد آئے اور زمرۂ منصبداران میں شامل کر لئے گئے ۔ سکندر جاہ نے اپنے فرزند فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ کی مصاحبت میں متعین کر دیا تھا ۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ سکندر جاہ کی وفات ۱۲۴۴ھ کے بعد ناصر الدولہ ہی تخت نشین کئے گئے اور انھوں نے اپنے ندیم قدیم میر احمد علی خاں شہید کو خلعت اور خطاب میر الشعراء سے سرفراز کیا ۔ اس وقت سے تمام امراء و عمائد حیدر آباد میں مقبول و مشہور ہوئے اور ہر ایک سے تعلقات پیدا کئے ۔

ناصر الدولہ کی وفات کے بعد افضل الدولہ کے دربار میں بھی شامل رہے اور ان کی وفات کے سات سال بعد عہد میر محبوب علی خاں میں ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی ۔ اس طرح شہید نے اپنی عمر کے آخری ستاون سال حیدر آباد ہی میں گزارے اور اپنے بعد کئی فرزند چھوڑ گئے جن میں میر کاظم علی خاں شعلہ (تفصیل کے لئے دیکھو جلد اول صفحات ۳۲۱-۳۲۳) مشہور ہوئے ۔ شعلہ نے ۱۳۰۲ھ میں وفات پائی اور ان کے دو فرزند حکیم سید نوازش علی لمعہ اور حکیم سید نادر علی رعد مشہور ہوئے ۔ رعد کے فرزند میر کاظم علی برق موسوی آج کل موجود ہیں اور اپنے خاندانی شغل شعر و سخن میں ممتاز ہیں ۔ انھوں نے شہید کے مکتوبہ چند مخطوطات اور مطبوعہ دیوان (نظم شہید) کے دو نسخے ادارہ میں بطور تحفہ داخل کئے ۔ (دیکھو فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارہ صفحہ ۱۲۳)

شہید کے بنیروں لمعہ اور رعد نے ان کی غزلوں کا دیوان مرتب کیا تھا اور اس کا آخری تاریخی نام نظم شہید (۱۳۰۹) رکھا مگر یہ ۱۳۱۳ھ سے پہلے نہ چھپ سکا ۔ چنانچہ اس کے آخر میں متعدد شعراء میر تراب علی زور، میر سید علی فکر، الف خاں الفت، میر احمد علی عصر، میر واجد علی خاں واجد اور نوازش علی لمعہ کے قطعات تاریخی شریک ہیں ۔ یہ دیوان (۱۵۰) صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں صرف غزلیں شریک ہیں ۔ آخری دو صفحات میں چند قطعات تاریخ ہیں ۔ ادارے میں ان کا ایک مجموعہ قصائد و قطعات پر مشتمل ہے جو غالباً اب تک نہیں چھپے ۔ مگر تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتے ہیں ۔

شہید دہلوی کے کلام کا یہ مجموعہ ان کے فرزند کاظم علی شعلہ کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے ۔ اس میں بعض جگہ خود شعلہ کا کلام بھی موجود ہے اور ایک جگہ لکھا ہے :۔

"مرقوم بتاریخ نوزدہم ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ در مکان داؤد میاں روز دوشنبہ برائے مطالعہ نوشتہ شد۔"

یہ مخطوطہ ناقص الطرفین ہے۔ اس میں ابتداء کے پانچ ورق موجود نہیں ہیں۔ قصائد سے شروع کیا گیا ہے۔ بحالت موجودہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے۔

رتبہ ایسا ہے بڑا کس کا یہی کہتے ہیں — ہو کے حور و پری و جن و بشر چاروں ایک
ہوتی رونق نہ زمانے کو نہ ہوتے یہ اگر — زہرہ و مشتری و شمس و قمر چاروں ایک

اس قصیدے کے آخری شعر یہ ہیں ؎

خضر کے زیست کے ایام اور امواج بحار — سال عمران کے ہیں اور برگ و شجر چاروں ایک
ان کے فیض و کرم و جود دعا میری شہید — خوب رکھتے ہیں سعادت کا اثر چاروں ایک

اس کے بعد ایک مختصر قصیدہ مدح پنجتن پاک میں ۱۲ شعر کا ہے جس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے ؎

لالہ گل سرو سمن تیری مہک پانچوں ایک — مہر و مہ برق و شرر رخ کی چمک پانچوں ایک
پارس و سنگ سیاہ حرم اور میری جبیں — سنگ در آپ کا اور سنگ محک پانچوں ایک

اس کے بعد کا قصیدہ فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصفجاہ رابع کی مدح میں ہے۔ اس میں (۵۴) شعر ہیں۔ اس کی تشبیب گریز اور مدح تمام بلند پایہ ہیں۔ گریز اس طرح کیا ہے ؎

الغرض ہے تو پیل دماں زعم میں اپنے — اک مور ہے فرخندہ علی خاں کے مقابل
آصف کے مقابل ہے لقب فضل خدا سے — اور جاہ و حشم ان کا سلیماں کے مقابل

اس طرح اس مجموعہ میں متعدد قصائد ہیں جو سودا اور ذوق اور خود شہید کے استاد شاہ نصیر کے قصائد کے ہم پلہ ہیں۔ افسوس ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں شہید کو ان کا صحیح مرتبہ نہ مل سکا۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ حیدرآبادہی کے ہو کر رہ گئے اور شمالی ہند میں ان کی شہرت نہ ہو سکی۔ حیدرآباد میں بھی شہید دہلوی زیادہ عرصہ تک سرخرو اور مرفہ الحال نہ رہ سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں نواب ناصر الدولہ ان پر اتنے مہربان نہ رہے تھے۔ اس لئے ایک قطعہ میں انھوں نے ان کی بھی ہجو لکھی اور ان کو پیرنا بالغ لکھا ہے۔ نواب افضل الدولہ کو تو شعر و سخن کا ذوق ہی نہ تھا۔ اس طرح ان کی عمر کا آخری زمانہ عسرت اور تنگی میں گذرا۔ اپنے بیٹے کی شادی میں ان کو قرض لینا پڑا تھا جس کی وجہ سے ان کی آدھی ماہوار ادائی قرضہ میں چلی جاتی تھی۔ ان کو آخر عمر میں ماہوار بھی زیادہ نہیں ملتی تھی۔ ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو صرف ۳۰ روپے ماہوار ملا کرتے تھے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

قرض میں پانزدہ تو جاتے ہیں — پانزدہ خوردنی میں آتے ہیں

یہ کلیات شہید یوں تو ایک مجموعۂ کلام ہے لیکن اس میں حیدرآباد کی تقریباً (۶۰) سالہ سیاسی اور سماجی تاریخ بھی محفوظ ہو گئی ہے اور بہت سے اہم اور دلچسپ واقعات کے ایسے صحیح سنہ معلوم ہو جاتے ہیں جن کو اہل حیدرآباد بھول چکے ہیں اور اس شہر کی کسی تاریخ میں ان کا اندراج نہیں ہوا ہے۔ شہید نے چونکہ شاہی دربار سے تعلق رکھنے کے علاوہ اکثر سیاسی و علمی مشاہیر ملک سے تعلقات پیدا کر لئے تھے اس لئے ان سبھوں کی شادی اور غمی کی تقریبوں کے قطعات تاریخ ان کو لکھنے پڑتے تھے اور یہ سب تاریخیں اس مجموعہ میں موجود ہیں۔

اس مجموعہ میں سب سے قدیم مادۂ تاریخ ۱۲۲۵ھ کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہید اس تاریخ سے قبل حیدرآباد آچکے تھے۔ اس مادۂ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آصفی سلاطین بھی ہندوؤں کا راکھی پونم کا تہوار منایا کرتے تھے چنانچہ سکندر جاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ہندو امراء راکھی باندھتے اور اس عید کی خوشی میں نذریں پیش کرتے تھے۔ ایک قطعہ میں لکھا ہے کہ ؎

دینے کو تہنیت اسکندر جاہ | لائی نذر آج عید راکھی کی ہے
روشن رہے شمع بزم عمر و دولت | جب تک کہ رواج عید راکھی کی ہے

اس کے علاوہ ایک قطعہ تاریخ بھی لکھا ہے جو یہ ہے ؎

روشن رہے شمع جشن اسکندر جاہ | جب تک کہ رواج نذر راکھی کی ہے
تاریخ جو یاد ہے تو کر عرض شہید | تاریخ کہ آج نذر راکھی کی ہے

عہد سکندر جاہ کا ایک اہم واقعہ حیدرآباد میں مہدویوں اور سنیوں کے ۱۲۳۵ھ کے جھگڑے کا ہے جس کے سلسلہ میں مہدوی پٹھانوں کا محلہ چنچل گوڑہ تاخت و تاراج ہو گیا تھا۔ اس کی تاریخ شہید نے بطور تعمیہ اس طرح نکالی تھی۔

"نہ رہا ایک غیر مہدی میں" ۱۲۳۵ھ

چونکہ اس قسم کی تاریخیں اس مجموعہ میں بلا ترتیب بکھری ہوئی ہیں اس لئے ان کو سنہ وار مرتب کرکے سرسری وضاحت کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ اس عہد کی سماجی اور سیاسی زندگی پر تحقیقی کام کرنے والوں کے کام آئے۔

۱۲۳۹ھ۔ نواب سکندر جاہ آصفجاہ سوم کو فرزند تولد ہونے کی مسرت میں دو قطعات تاریخ لکھے ہیں جن کے مادہائے یہ ہیں ؎

آفتاب اوج عزت جلوہ کرد ۱۲۳۹ھ

ابد باد آفتاب شوکت و جاہ

۱۲۴۴ھ۔ نواب سکندر جاہ کی وفات ع پند حیف سکندر نکرد آب حیات

نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم کی تخت نشینی کا قطعہ تاریخ بھی لکھا ہے جس کا مادہ یہ ہے ع

شہ فرخندہ تاریخ جلوسش ۱۲۴۴ھ

اس میں بادشاہ کے نام فرخندہ علیخاں کی رعایت بھی رکھی ہے۔

۱۲۴۷ھ۔ ناصر الدولہ کے فرزند اکبر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ پنجم کی بسم اللہ خوانی کی مبارکباد میں ایک قطعہ لکھا ہے جس میں تاریخ اس مصرعہ سے نکالی ہے ع ہمایوں رسم بسم اللہ خوانی ۱۲۴۷ھ

۱۲۴۹ھ۔ ناصر الدولہ آصفجاہ رابع سخت علیل ہو گئے تھے۔ جب وہ صحت یاب ہوئے تو ملک میں بڑی خوشی منائی گئی۔ شہید نے مبارکباد کے متعدد قطعے لکھے اور نذر گزرانے۔ چار قطعوں میں تاریخ بھی نکالی ہے۔ ان کے مادہائے تاریخ یہ ہیں۔ ان سبھوں سے ۱۲۴۹ھ نکلتا ہے ؎

۱۔ مجھ سے ہاتف نے کہا غسل ہمایوں ہوا الٰہی
۲۔ صحت اب یوسف ثانی کو ہے
۳۔ شکر نواب کو صحت ہوئی حصول
۴۔ آج با انبساط غسل کیا

۱۲۵۳ھ ۔ ماہ لقا بائی چندا حیدر آباد کی مشہور رقاصہ اور شاعرہ تھیں۔ ان کی سوانح عمری چھپ چکی ہے اور مرقع سخن میں ان کے حالات درج ہیں۔ ان کی جانشین حسن لقا بائی تھیں جن کے مکان (واقع نامپلی) میں اب زنانہ ہائی اسکول ہے۔ اس مکان کے ساتھ انھوں نے باولی اور باغ بھی بنایا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی والدہ کی طرح شعر و سخن کی دلدادہ اور شاعروں کی سرپرست تھیں۔ شہید نے اس باغ کی تعریف اور مبارکباد کے سلسلہ میں دو نظمیں لکھی ہیں۔ ایک کا مادۂ تاریخ یہ ہے ع

عقل فرمودہ باغ حسن لقا ۱۲۵۳ھ

۱۲۵۵ھ ۔ شادی ابوالقاسم سے

گفت از روئے بشارت پیر عقل   نیک آمد وصل ماہ و مشتری

۱۲۶۲ھ ۔ میر موجود علی کی وفات کے بعد ان کی قبر پر ان کی بیوی نے مقبرہ بنایا تو شہید نے یہ تاریخ لکھی ع

میر موجود علی داخل رحمت باشد

نواب مختار الملک کے چچا نواب سراج الملک کو جب ناصر الدولہ نے وزیر اعظم مقرر کیا تو شہید اس خاندان کے متوسل خاص تھے اس لئے کئی قصیدے اور قطعے مبارکباد کے لکھے۔ ایک قطعہ میں تاریخ اس طرح لکھی ہے ع

اب ہات ہے آصف کے سلیماں کی وزارت ۱۲۶۱ھ

۱۲۶۶ھ ۔ سید جعفر علی خاں کی تاریخ وفات سے

شہید الہام با من گفت تاریخ وفات او   امام جعفر صادق شفیع سید اعلےٰ ۱۲۶۶ھ

تعمیر مسجد برہان الدین خاں ـــ

۱۲۶۷ھ ۔ سراج الملک کا دوبارہ وزیر ہونا ـــ

۱۔ ہم ز خوبی جہان دیگر شد
۲۔ خط ثانی بہ از اول آمد
۳۔ سراج عالم و آدم سراج مہر منیر
۴۔ فرمود مشیر صاحب تدبیر
۵۔ وزیر نیک ہوا آفتاب کا مہتاب

۱۲۶۸ھ ۔ وفات سید اسد علی خاں ع   ساز ند زو بحشر شہیدان کربلا۔

ولادت فرزند میر جہاں دار علی خاں بہادر ع   تاباں ہو سدا وہ مہ ایوان وزارت

۱۲۶۹ھ ۔ حیدر آباد کا ایک زرخیز صوبہ برار تھا جس پر انگریز حکومت کی للچائی ہوئی نظریں عرصہ سے پڑ رہی تھیں۔ آخر کار انھوں نے فوج کے اخراجات کے سلسلہ میں یہ صوبہ اپنے انتظام کے تحت لے لیا اور اہل حیدر آباد بہت رنجیدہ ہوئے۔ شہید نے اپنے قطعات میں ان کی نمائندگی کی ہے۔ چنانچہ اس کی تاریخ "آہ غریباں" ۱۲۶۹ھ نکالی ہے۔ ایک اور قطعہ کا مادۂ تاریخ یہ ہے ع   برفت از دکن در ملک برار ۱۲۶۹ھ

اسی سال ناصر الدولہ نے سالار جنگ مختار الملک کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ چونکہ وہ کم عمر تھے اس لئے ملک میں بڑی بے چینی تھی کہ نہ معلوم اب اس ملک کا کیا حشر ہو۔ ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور بڑے بڑے

امراء ناراض و دل گرفتہ ہو گئے۔ ناصر الدولہ نے جواب دیا کہ "میں نے گھوڑے پر سے ایک ہیرے کو چھین لیا ہے"۔
شہید نے اہل حیدرآباد کی ترجمانی میں ایک نہایت دلچسپ فارسی نظم لکھی ہے جس میں حکومت وقت کی سختی، ہجو لکھی ہے اور خود نظام وقت کی بھی ہجو لکھی ہے جو اس شاہی دور میں بڑی بے باکی اور نڈرپن کی دلیل ہے۔ اس نظم کے چند شعر یہ ہیں ؎

وزیر و پیشکار و شحنہ و منشی تو میدانی — کہ مستحکم اساس سلطنت زیں چار ارکان شد
عسس طفلے است نابالغ بود دیوان نو آموز — دبیری پیشکاری ہم سپرد خورد سالاں شد
بود صدر الصدور و قلعہ دار و خانہ ساماں ہم — کہ عقل شاں خجل از فہم اطفال دبستاں شد
زپا آں کاخ دولت زود می افتد اگر گاہے — یکے زیں جملہ خدمتہا سپرد طفل ناداں شد
رئیس مملکت پیر ست لاکن پیر نابالغ — نشد گو سالۂ ما گاؤ پیر از چرخ گرداں شد
زکار حیدرآباد و ز حال انتظام او — شد آگہ ہر کہ مثل من بجائے خویش حیراں شد
بفکر سال ایں دولت فرو رفتم زگرہ دوم — ندا آمد ریاست جملہ بازیگاہ طفلاں شد
۱۲۶۹ھ

۱۲۷۱ھ۔ نواب بہادر خاں بہادر یار جنگ حیدرآباد کے ایک خاندانی جاگیردار اور بالغ نظر رئیس تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں محمد علی جناح کے ساتھ بڑی جد و جہد کی اور حیدرآباد کی بیداری اور یہاں کے مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی کے لئے بھی عمدہ خدمات انجام دیں۔ ان کے والد اور دادا کا خطاب نواب نصیب یاور جنگ تھا۔ ان کا اصل نام نصیب خاں تھا۔ یہ خطاب ان کے دادا کو ۱۲۷۱ھ میں ملا تھا۔ چنانچہ شہید نے ان کے لئے مبارکباد کا ایک قطعہ لکھا تھا جس کا مادہ تاریخ یہ ہے ؎

سدا خطاب ہو لائق نصیب یاور جنگ ۱۲۷۱ھ

۱۲۷۲ھ۔ سید محمد خاں سخن اصفہانی فارسی کے ایک اچھے شاعر تھے اور امیر الامراء والی ارکاٹ کے یہاں ملازم تھے۔ حیدرآباد بھی آئے تھے۔ محبوب الزمن میں ان کی تاریخ وفات ۱۲۱۶ھ درج ہے۔ شہید نے بھی سخن کا قطعہ تاریخ لکھا ہے جس سے ۱۲۷۲ھ برآمد کئے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ وہی سخن تھے یا کوئی اور۔ مصرعہ ہے ؎

افسوس بدر آمدن جان سخن ۱۲۷۲ھ

۱۲۷۳ھ۔ ناصر الدولہ کی وفات پر کئی نظمیں لکھی ہیں اور تاریخیں نکالی ہیں۔ ان میں سے دو یہ ہیں ؎

حق روز وفات او برضواں فرمود — قصر جنت بناصر الدولہ بدہ

دوسری تاریخ کا مادہ تاریخ یہ ہے ؎ جعل الجنۃ مثواہ صمد ۱۲۷۳ھ

۱۲۷۴ھ۔ راجہ رام بخش کے فرزند کی شادی کی مبارکباد میں جو قطعہ ہے اس میں تاریخ اس طرح نکالی ہے ؎

از سر اقبال شد تاریخ عقد — نیک دانی وصل ماہ و مشتری ۱۲۷۴ھ

۱۲۷۵ھ۔ ماما دل آرام عہد افضل الدولہ کی مشہور شاہی ماما تھی۔ چونکہ افضل الدولہ آصف جاہ چہارم اکثر محل سے باہر نہیں آتے تھے اور ماماؤں اور خادماؤں کے ذریعہ سے احکام مختار الملک کے یہاں بھجواتے تھے اس لئے

ان ماماؤں کی بڑی عزت اور توقیر تھی اور وزرائے سلطنت بھی ان سے ڈرتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک ماما دل آرام نے ایک باولی بنائی تھی جس کی مبارکبادی کا قطعہ شہید نے لکھا ہے اور تاریخ نکالی ہے۔

ع صاف پانی باولی کا تحفہ میٹھا واہ واہ ۱۲۷۵ھ

اسی سال افضل الدولہ نے مختار الملک کو ایک انگوٹھی عنایت کی تھی جس کی تعریف میں ایک نظم لکھی ہے اور اس مصرع میں تاریخ نکالی ہے۔ ع اے واہ عجب دست سلیماں کی انگوٹھی ۱۲۷۵ھ

۱۲۷۶ھ۔ محلہ مستعدپورہ قلعہ گولکنڈہ کے راستہ پر پرانے پل سے آگے ایک بڑی آبادی ہے اس میں محبوب بی نے ایک مسجد بنائی تھی اس کی تاریخ لکھی ہے۔ ع قبلہ در حق بگو مسجد بیت الحرام ۱۲۷۶ھ

ماما دل آرام نے اس سال بھی ایک باولی بنائی تھی اور شہید نے اس کی بھی تاریخ لکھی ہے ؎

شہید دہلوی تاریخ بنوشت   شو دلب باز آب چشمہ شیریں
۱۲۷۶ھ

اسی سال افضل الدولہ کو فرزند تولد ہوا تھا جس کی مبارکباد کے کئی قطعے ہیں۔ دو تاریخی مصرعے یہ ہیں ؎

۱۔ روشن ہے نجم ماہ ہوا آفتاب سے ۱۲۷۶ھ

۲۔ دو تارا جلوہ نما ہے قمر کے پہلو میں ″

۱۲۷۷ھ۔ اس سال بھی افضل الدولہ کو ایک فرزند تولد ہوا تھا۔ ان کے اور مختار الملک کے فرزند کے تولد کے سلسلہ میں کئی تاریخیں لکھی ہیں جن میں سے دو یہ ہیں ؎

۱۔ نیک بادا طالع از برج حمل شد آفتاب

۲۔ بشگوئے شہ ہیں سراج منیر

اسی سال نواب مختار الملک کی کوششوں سے شاید ملک برار کی واپسی کی توقع ہو گئی تھی اور انگریزوں سے معاہدہ ہوا تھا۔ اس خوشی میں ایک بڑی عمدہ نظم لکھی ہے جس میں مختار الملک کی کاوش و کوشش کو سراہا ہے۔

دختر فخر الملک کی شادی کی تاریخ   بستہ شد عقد علی با فاطمہ بادا نکو ۱۲۷۷

تاریخ شادی نواب اعظم خاں بہادر   نیک ساعت دو ہوا سعدین کا لازم قرآں ۱۲۷۷

۱۲۷۸ھ۔ تاریخ شادی فرزند حسن منور خاں نواب بالکنڈہ

تاریخ ولادت فرزند مختار الملک

تاریخ وفات نواب فخر الملک ۔ تین تاریخیں لکھی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

شفیع روز حساب بش امام پاک حسین ۱۲۷۸ھ

۱۲۷۹ھ۔ نواب شمس الامراء امیر کبیر نے وفات پائی ع شمس بالائے زمیں حیف شد زیر زمیں ۱۲۷۹ھ

نواب رفیع الدین خاں عمدۃ الملک کو اپنے والد کا خطاب ملا تو کئی قطعات مبارکباد لکھے۔ تاریخی مصرعے یہ ہیں

۱۔ حادہ آصف خطاب میر کبیر ۱۲۷۹ھ

۲۔ ثانی شمس الامراء اہل جاہ ″

۳۔ نامور ماہ شمس دولت و ملک ″

اس سال محلہ یاقوت پورہ کے باہر شیخ فیض نے ایک کمان بنائی تھی جو اب تک موجود ہے اور کمان شیخ فیض کہلاتی ہے۔ شہید نے اس کی تعمیر کی دو نظمیں لکھی ہیں۔ تاریخی مصرعے یہ ہیں ؎

۱۔ ایجاد شد چہ طور کماں رشک ماہ نو ۱۲۷۹ھ

۲۔ شاہانہ کماں آمد محراب در شاہ ؍؍

۱۲۸۰ھ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فیض اس عہد کے بڑے دولت مند آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی دختر کی بسم اللہ خوانی کی تقریب دھوم دھام سے کی تھی۔ اس کی تاریخ شہید نے یوں نکالی۔

یہاں مبارک تم کو ہووے رسم بسم اللہ کی ۱۲۸۰ھ

۱۲۸۲ھ۔ تاریخ تولد فرزند مختار الملک ؏ پہلوے قمر میں یہ ستارا چمکا ۱۲۸۲ھ

۱۲۸۳ھ۔ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؏ اختر باماہ زیب دادہ ۱۲۸۳ھ

مختار الملک کو حکومت انگریزی سے اسٹار آف انڈیا کا خطاب ملنے پر جو مبارکباد منظوم کی ہے اس کا تاریخی مصرعہ یہ ہے:۔ تابندہ جہاں ستارۂ ہند ۱۲۸۳ھ

تاریخ تولد فرزند افضل الدولہ ؏ مژدہ ہو دل کو وہ شمع خانداں پیدا ہوا ۱۲۸۳ھ

۱۲۸۴ھ۔ کدخدائی حسن علی وصل پیر دانہ بودہ است زشمع ۱۲۸۴ھ

؍؍ ؍؍ ٹیپو خاں بلبل آسودہ چو از یاد سحر گل بشگفتہ

۱۲۸۵ھ۔ اکبر علی کو توال کو خان بہادر کا خطاب ملنے پر کئی مبارکبادیاں لکھی ہیں۔ ان کو بعد میں جنگ دولہ اور ملک کا خطاب بھی ملا تھا۔ اکبر الملک کے خطاب سے مشہور رہے۔ دو تاریخی مصرعے یہ ہیں ؎

۱۔ خان و بہادر آل حسین دلاوری ۱۲۸۵ھ

۲۔ میر صاحب آپ کو ہووے مبارک اب خطاب ۱۲۸۵ھ

فریزر صاحب فرنگی کو جب افواج آصفی کا میر بخشی مقرر کیا گیا تو قطعات لکھے جن میں سے اکثر عیسوی سنہ بر آمد کیا ہے۔ ہجری سنہ کا مادہ تاریخ یہ ہے ؏ بخشی نامی بفوج آصفی ۱۲۸۵ھ

تاریخ قدر افزائی جعفر علی خاں

تاریخ تخت نشینی میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم

افضل الدولہ کی وفات کی کئی تاریخیں لکھی ہیں۔ ایک مادہ تاریخ یہ ہے

؏ او بجنت رفت از دنیائے دوں ۱۲۸۵ھ

۱۲۸۶ھ۔ صاحبہ بیگم زوجہ مختار الملک کی وفات پر عربی آیتوں میں تین تاریخیں نکالی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے

؏ سلمو روحٌ و ریحانٌ و جنات النعیم ۱۲۸۶ھ

۱۲۸۷ھ۔ نواب مختار الملک جب دہلی، آگرہ اور کلکتہ کے سفر سے واپس ہوئے تو حیدر آباد میں بڑی خوشی منائی گئی۔ شہید نے ۷ شعر کا ایک قطعہ لکھا جس میں بڑی عمدہ تاریخ نکالی ہے جو یہ ہے۔

؏ باز در برج حمل مہر جہاں تاب آمدہ ۱۲۸۷ھ

۱۲۸۸ھ۔ مولوی احمد حسین نے (جو بعد میں سرامین جنگ صدر المہام عدالت و امور مذہبی ہوئے تھے) ایوان مرتفع بنایا
تو اس کی تاریخ لکھی اور غالباً اپنے فرزند شعلہ کی طرف سے پیش کی ہے ؎

بشعلہ سال بنالیش سروش کرد ندا
شبار اوج ثریا شدہ بلند مکاں ۱۲۸۸ھ

اس کی اور ایک تاریخ بھی ہے ؎

شعلہ تاریخ بنالیش نظم کرد
بس لطیف ایجاد شد بستاں سرا ۱۲۸۸ھ

مولوی محمد صدیق صاحب (بعد کو صدیق یار جنگ) نے اپنا مکان بنایا تو یہ تاریخ لکھی ؎

رقم زد شعلہ تاریخ بنایش
نفیس ایواں ہمہ چوں کاخ کسریٰ ۱۲۸۸ھ

تاریخ وفات سید بدرالدین خلف آصف جاہ

تاریخ وفاتش ز شہید آمدہ موزوں
اللہ جمیعُ جُعِل الجنۃ مثواہ

تاریخ تولد فرزند نواب نظام یار جنگ ؎

ع نیر آفتاب عالم تاب ۱۲۸۸ھ

تاریخ وفات سید یعقوب وغیرہ

اس مضمون میں شہید کے کلام کے صرف اس پہلو کو پیش کیا گیا ہے جس سے حیدرآباد کی تاریخ ادبی زندگی اور کلچر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شاعری اور استادانہ کمال پر بھی تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ بہت اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور ان کی شہرت ان کے کلام کی عظمت کے مطابق نہیں ہو سکی۔

ادارے کی جدید کتابیں

ہیلینا — از جناب فضل الرحمن صاحب
محمد قلی کی جیون کہانی — ” وقار خلیل صاحب
نذر محمد قلی قطب شاہ مرتبہ — ” ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور
حیدرآباد کے بڑے لوگ — از غلام پنجتن صاحب
معانی سخن (کلام محمد قلی قطب شاہ) مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

فارسی علم و ادب کے ارتقا میں برہان پور کا حصہ

(ملفوظاتی ادب)

از: شیخ فرید برہان پوری

برہان پور —— دارالسرور —— دارالعیار[۱] —— صدیوں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ فاروقی اور مغل دورِ حکومت میں علم پرور اور معارف دوست بادشاہوں اور امیروں کی سرپرستی میں علما، صلحا، صوفیا، فقرا اور شعرا نے علم و ادب کے بیش بہا جواہر پارے —— اپنی ذہنی تخلیقات کی شکل میں زمانہ کو عطا کیے اور زمانہ کی ناقدری دیکھئے کہ اس کے بے رحم ہاتھوں نے کچھ حصّہ برباد کر دیا۔ کچھ حصّہ "فرزندانِ تثلیث" کے ہاتھوں فروخت ہو کر یورپ چلا گیا۔ کچھ کو ابنائے زمانہ کی کنجوس فطرت نے چھپا رکھا ہے۔ اس لیے بہت سا حصّہ ہماری رسائی سے دور ہے۔ اور راقم السطور کے محدود ذرائع اور علمی تہی مائیگی نے ان ادب پاروں تک اس کی رسائی کو مشکل تر بنا دیا ہے۔

ہمارے اُن بزرگ اہلِ قلم حضرات نے تہذیب و تمدّن کے ارتقا اور تاریخ کو ترتیب دینے اور سنوارنے میں جو حصّہ لیا ہے، وہ ان کی تصانیف میں محفوظ ہے۔ بعض ایسے بھی اہلِ قلم گزرے ہیں، جن کو سلطنت کے سیاہ و سفید میں کافی دخل تھا۔

بعض بزرگوں کے حالات تذکروں میں محفوظ ہیں۔ بعض کی تصانیف کے شمار پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اُن کے مباحث نفسِ مضمون اور محاسن پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔ بعض تصانیف ایسی ہیں، جن کے نام سے بھی ہم واقف نہیں۔ بعض ادیبوں کے حالات اور تصانیف تلاش کے بعد بھی دستیاب نہ ہو سکیں۔

آج زمانہ اُن میں سے اکثر باکمالوں کو بھول چکا ہے۔

یہ سعیٔ عاجز اُن جواہر پاروں کو یک جا کر کے اُن پر ایک متعلمانہ نظر ڈالنے کی جراءت "غیر مستحسن" ہے۔

برہان پور بزرگانِ کرام اور صوفیائے عظام کا مرکز تھا۔ اس مردم خیز زمین سے کئی بزرگ اٹھے۔ اور کچھ دیگر مقامات سے آ کر اس کی دامن گیر خاک میں ابدی آرام کے مزے پا رہے ہیں۔

جن بزرگوں کے فیوضِ باطنی اور انوارِ روحانی کا یہ شہر مرکز تھا۔ اُن میں چند کے اسمائے گرامی درجِ ذیل ہیں:

۱۔ حضرت شاہ بھکاری

---

[۱] ہزار حیف کہ عرفی و نوعی و سحبہ   نئید جمع بدار العیار برہان پور   (صائب)

۲۔ حضرت شاہ حمید الدین

۳۔ حضرت شاہ قطب الدین

۴۔ شاہ شہباز

۵۔ حضرت شاہ جلال

۶۔ حضرت شاہ باجن

۷۔ حضرت شاہ لشکر محمد عارف

۸۔ حضرت شاہ عیسےٰ جنید اللہ

۹۔ حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی

۱۰۔ حضرت شاہ فضل اللہ نائب رسول اللہ

ان بزرگوں کے انوار باطن کے فیوض سے ہر دور میں عوام و خواص مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ اور آج بھی یہ روحانی فیض جاری و ساری ہے۔ اُن میں سے ہر بزرگ اور شیخ کے ملفوظات اُس کے ارادت مندوں میں سے کسی سعادت مند نے مرتب کیے ہیں ان ملفوظات میں اُن کے حالات، مواعظ و اقوال اور اشغال و کردار کا ذکر ہے۔

ملفوظات کسی بزرگ کے اقوال، نصائح، تعلیمات سوانح اور اذکار ہوتے ہیں۔ ایسی کتاب کی تدوین میں کم سے کم دو شخصیتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ اور دونوں کی حیثیت جداگانہ جن کے حالات، اقوال اور مواعظ ہوتے ہیں۔ وہ اُن کو مدون نہیں کرتے۔ اہل ارادت اور حاضر باش جو کچھ ان سے سنتے ہیں۔ اور جو کچھ حضوری میں آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ وہ لکھے جاتے ہیں ــــ کاتب کی طبع زاد اس مکتوب میں کوئی چیز نہیں ہوتی ــــ

بعض مرتبین نے مشاہدہ اور سامعہ کے واردات کی انواع مقرر کرکے لکھا ہے ــــ

۱۔ مناقب اقوالی ــــ وہ باتیں جو ممدوح کی زبان سے سنی گئیں اور سننے والے لکھتے رہے ــــ

۲۔ مناقب افعالی ــــ وہ باتیں جو عملاً واقع ہوئیں۔ انہیں دیکھنے والوں یا دیکھنے والوں سے سننے والوں نے لکھا ــــ

۳۔ مناقب احوالی ــــ وہ باتیں جن کا تعلق ممدوح کے حالات سے ہو اور جن کو ارباب حقیقت نے لکھا ــــ

۴۔ مناقب وارداتی ــــ وہ امور جو انھوں نے بطور معاملہ عمل میں لائے۔ اور یہ بھی باخبر لوگوں اور اہل معاملہ نے تحریر کیے

۵۔ مناقب خوارقی ــــ وہ کیفیات جو کشف و کرامات کے طور پر اُن سے سرزد ہوئیں۔

ان ملفوظات کے مرتب کی حیثیت جامع ملفوظ کی ہے اکثر مرتبین نے اپنے الفاظ میں مذکورہ بالا امور کا ذکر کیا ہے ــــ

ذیل میں چند بزرگوں کے ملفوظات اور ان کے مرتبین کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

	نام ملفوظ	صاحب ملفوظ	جامع ملفوظ
۱۔	فتح الیقین ؒ	حضرت شاہ نظام الدین بھکاری	حضرت شاہ حمید الدین
۲۔	دلیل الصالحین	حضرت شاہ حمید الدین	حضرت شاہ قطب الدین
۳۔	مناقب شریفی ؒ	حضرت شرف الدین شاہ باز	عبد الرحمٰن ابن حسن شیخ جلال

ح۲ حق الیقین کے دو مخطوطے راقم کے علم میں ہیں۔

(۱) نسخۂ اول ـــــ مملوکہ جناب مولوی سید احکام اللہ صاحب بخاری

(۲) نسخۂ دوم ـــــ مملوکہ جناب سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد

جناب راشد صاحب نے اس نسخہ کا ترجمہ شایع کرا دیا ہے۔

ح۳ مناقب شریفی کا ناقص الاوّل نسخہ راقم السطور کے پاس اور ناقص الآخر جناب راشد صاحب کے پاس ہے۔

	نامِ ملفوظ	صاحبِ ملفوظ	جامعِ ملفوظ
۴۔	فتوح الاولیا، (ملفوظاتِ جلالی)	مختلف بزرگ	حضرت شاہ جلال
۵۔	خزانۂ رحمت اللہ ح۴	شیخ عزیز اللہ متوکل اور شیخ رحمت اللہ	حضرت شاہ بہاء الدین باجن
۶۔	ملفوظاتِ شاہ لشکر	حضرت شاہ لشکر محمد عارف	حضرت شاہ عیسے
۷۔	کشف الحقائق	حضرت شاہ عیسے	محمد اسماعیل فرحی
۸۔	ثمرات الحیات ح۵	حضرت برہان الدین رازالٰہی	عاقل خاں رازی
۹۔	ملفوظاتِ رازی ح۶	" "	علم اللہ کمال
۱۰۔	مناقب رازالٰہی ح۷	" "	محمد یوسف
۱۱۔	لب الدقائق	حضرت برہان الدین رازالٰہی	محمد یوسف
۱۲۔	روائح الانفاس	" "	سید عبدالحئی حسنی الحسینی
۱۳۔	نور الہدایت ح۸	" "	شاہ نور اللہ

ح۴ مملوکہ جناب سید احکام اللہ صاحب بخاری (نصف اوّل مخطوطہ)

ح۵ ملاحظہ کیجئے راقم کا مضمون ـــــ فرحی ـــــ برہان مارچ ۵۷ء

ح۶ ان ملفوظات کے نسخے کتب خانہ درگاہِ رازالٰہی برہان پور میں محفوظ ہیں۔

ح۷ ملاحظہ کیجئے راقم کا مضمون سب رس اکتوبر ۵۶ء

ح۸ مخزونہ کتب خانۂ آصفیہ (حیدرآباد)

ان ملفوظات کی ترتیب وتحفظ میں ارادت اور عقیدت کے نیک اور سعادت مند ہاتھوں نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ملفوظات کے جامع حضرات نے اپنے مرشد کے اقوال وگفتار کو جس طرح سنا اُسی طرح محفوظ رکھنے اور قلم بند کرنے کی قابلِ تحسین کوشش کی۔ اس احتیاط سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اشعار اور فقرات محفوظ ہو گئے جو گاہے گاہے اُن بزرگوں کی زبانِ فیض ترجمان سے ادا ہو جاتے تھے۔ وہ ہماری زبان کے ارتقائی پہلوؤں کو سمجھنے میں خاص طور سے مدد دیتے ہیں۔ لسانی نقطۂ نظر سے ان کا مطالعہ اہم اور کافی دلچسپ ہے۔

ان ملفوظات میں جہاں اہلِ سلوک کو باطنی خوبیوں سے متصف ہونے کے لیے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہاں اہلِ دنیا کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ میں عمدہ صفات پیدا کریں۔

ان ملفوظات میں ہلکے ہلکے تاریخی اشارات پائے جاتے ہیں۔ چند واقعات کا بیان ہے۔ البتہ کمی یہ ہے کہ اس عہد کے دستور کے مطابق واقعات تو قلمبند کر لیے گئے ہیں۔ مگر تاریخ درج نہیں کی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں چند مشکلات پیش آتی ہیں لیکن واقعات کے تطابق اور دیگر متعلقات پر نظر رکھنے سے تاریخ صحت کے ساتھ معلوم کی جا سکتی ہے۔

ان ملفوظات کی زبان عام طور پر عربی آمیز ہے۔ فارسی زبان میں عربی زبان کی پیوند کاریوں نے زبان و بیان کی سادگی لطافت اور دل آویزی میں اضافہ کر دیا ہے۔

ان ملفوظات میں بعض ایسی حکایات مندرج ہیں، جن میں ان بزرگوں کے اُن خوارق اور کرامات کا ذکر ہے۔ جن کا تعلق شدتِ ریاضت اور اطاعت ہے۔ اور جو بقول فرحی ـــــ صاحبِ کشف الحقائق ـــــ "غلبۂ اتصاف وقوتِ معیتِ حق"[9] کے باعث سرزد ہوتی ہیں۔ ہمیں وہ باتیں بالکل عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ اہلِ باطن کے یہ معاملات اہلِ ظاہر کے دماغ کی رسائی سے دور ہیں۔ یہ تصوف کی خصوصی شان ہے۔ بلکہ اس کی روح ہے۔

مذکورۂ بالا امور کی تفصیلات سے یہاں بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

"ملفوظاتی ادب" کے اس مجموعہ سے قطع نظر جب ہم اپنے نثری سرمایہ پر نظر ڈالتے ہیں، تو مذہبی تصانیف زیادہ ملتی ہیں۔ ہر دور کا ادب اپنے زمانہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہمارے ادبا نے بھی اپنے دور کے مذہبی رجحانات کا ساتھ دیا ہے اور مختلف علماء اور فضلاء نے عصری ضروریات اور رجحانات کے پیشِ نظر اپنے دل و دماغ کی قوتوں کو مذہبی تصانیف کی ترتیب و تہذیب اور تخلیق و تدوین کے لیے وقف کر دیا۔

کثیر التصانیف بزرگوں میں سے چند کے اسمائے گرامی ذیل میں درج ہیں۔

علی متقی[10]۔ شاہ عیسیٰ[11]۔ شاہ فتح محمد محدث[12] برہان الدین راز الٰہی[13] شیخ فضل اللہ نائب رسول اللہ۔ حافظ شجاع الدین

---

[9] کشف الحقائق ـــــ

[10] علی متقی ـــــ حالات اور تصانیف کے لیے ملاحظہ کیجئے راقم کا مضمون۔ برہان مئی ۱۹۵۶ء

[11] شاہ عیسیٰ ـــــ " " " " ۔ معارف ستمبر ۱۹۵۶ء

[12] شاہ محمد محدث ـــــ تبصرہ مفتاح الصلوٰۃ۔ " " ۔ برہان فروری ۱۹۵۷ء

[13] برہان الدین رازِ الٰہی ـــــ حالات اور تصانیف کے لیے ملاحظہ کیجئے راقم کا مضمون۔ سب رس نومبر دسمبر ۱۹۵۵ء

(سلسلہ اگلے صفحہ پر حاشیہ میں)

نصیرالدین۔ جلال الدین وغیرہ۔

—— حکماء میں حکیم مصری۔ عبدالسلام (عرف چمچو) محمد اکبر ارزاں وغیرہ اسی سرزمین سے اُٹھے۔ ان کے کارنامے اور ذہنی تخلیقات اس ذیل میں ہمارا قابل فخر سرمایہ ہیں۔

—— فنِ تاریخ میں گلزارِ ابرار[1] (محمد غوثی)۔ مآثر رحیمی (بیشتر حصہ) —— (عبدالباقی نہاوندی) مراۃ الصفا[2] اور راحت افزا (محمد علی بن محمد صادق الحسینی) یہاں لکھی گئی ہیں۔

تاریخ میں ایک اور کتاب —نسخۂ دل کشا— بھیم سین برہان پوری کی تصنیف ہے۔ نسخہ دل کشا — اورنگ زیب کے عہد کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا مستند ذریعہ ہے۔ واقعات کا بیان سادہ اور سچا ہے۔

عالم گیر کے استاد عبداللطیف قوی —— برہان پوری[3] تھے۔ جو اپنے علم و فضل اور راست بازی کے لیے مشہور تھے۔ شیخ نظام[4] برہانپوری کی نگرانی میں فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب دی گئی ہے۔

دیگر ادبا اور فضلا اور ان کی تصانیف کا ذکر انشاء اللہ کسی آئندہ فرصت میں کیا جائے گا ——

شعری ادب ——

فاروقی دور کے ادب کے تلف اور منتشر ہو جانے کے باعث شعر و سخن کے اکثر ادب پاروں تک ہماری رسائی مشکل ہو گئی ہے۔ جو حصہ زمانے کے غارت گر ہاتھوں سے بچ گیا ہے۔ وہ اس دور کی زبان اور اس کے کینڈے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور عصری رجحانات کی ترجمانی۔

حضرت شاہ باجنؒ کا اردو کلام اور چند فارسی اشعار کے نمونے خزانۂ رحمت میں ملتے ہیں۔ خزانۂ رحمت کے دو نسخوں کا راقم کو علم ہے۔

(۱) ناقص الآخر نسخہ —— مملوکہ حضرت سید مولوی احکام اللہ صاحب بخاری۔ پیش امام جامع مسجد برہان پور۔

(۲) زشت خط نسخہ —— مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

حضرت شاہ منصور کی صرف ایک غزل ملتی ہے۔ شاہ حمیدالدین کی جگری —— ذکری —— اردو کی پنجابی آمیز شکل ہے۔ فاروقی دور کے ایک اور شاعر لطفی کے حالات اور کلام کے نمونے تلاش کے باوجود نہ مل سکے۔ اس کا صرف ایک قطعۂ تاریخ ملتا ہے۔ عارفی اسیری کی ایک غزل ملتی ہے۔

حضرت شاہ عیسیٰ جیسے کثیر التصانیف[5] بزرگ ہیں۔ ان کی نثری تصانیف میں ان کے اشعار اور رباعیات[6] کے نمونے ملتے ہیں۔

—— حالات و تصانیف کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم کا مضمون —— سب رس —— مئی، جون ۱۹۵۶ء

—— مثنویات راز الٰہی۔ معارف۔ دسمبر ۱۹۵۵ء

[1] گل زارِ ابرار —— قلمی نسخہ مملوکہ راقم

[2] مراۃ الصفا۔ آصفیہ لائبریری قلمی نسخہ

[3] بزم تیموریہ ص ۲۲۶

[4] بزم تیموریہ ص ۲۳۶

[5] تصانیف شاہ عیسیٰ —— راقم کا مضمون۔ معارف ستمبر ۱۹۵۶ء صفحہ ص ۲۲۵

[6] عین المعانی میں۔ اشعار۔ رباعیات اور ایک مستزاد ملتا ہے —— قلمی نسخہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن

ں خاں رازی نے ثمرات الحیات[1] میں شاہ موصوف کی ایک غزل نقل کی ہے۔ معما گوئی میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ عین المعانی ، وہ اشعار ملتے ہیں۔ ان کے کلام سے ان کے اعلیٰ مرتبہ شعری کا اندازہ ہوتا ہے۔

—— حضرت شاہ عیسیٰ کے جانشیں شیخ سیتقی کی رباعیات عین المعانی میں منقول ہیں۔ حضرت شاہ عیسیٰ کے ملفوظات کے جامع —— محمد عیل فرحی[2] بلند پایہ نثار اور شاعر تھے۔ کشف الحقائق[3] اور مخزنِ دعوت[4] میں ان کے کلام کے نمونے ملتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ حضرت مولوی احکام اللہ صاحب[5] بخاری نے از راہ بندہ نوازی اپنے زشت مخطوطہ ف الحقائق سے ایک خوش خط نسخہ نقل کرکے مطالعہ کے لیے مرحمت فرمایا تھا۔

حضرت شاہ عیسیٰ کی زندگی میں ہی سقوطِ اسیر نے فاروقی سلطنت کی بنیادیں ڈھا دیں۔ اور خاندیس پر مغل پرچم لہرانے لگا۔

مغل دور میں عبد الرحیم خان خاناں کا عہدِ صوبگی "برہان پور کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ جب وہ تسخیر دکن اور خاندیس ، مہم پر مامور ہوکر برہان پور آیا۔ تو راجہ علی خاں فاروقی کو اپنا دوست اور برہان پور کو اپنا مستقر بنالیا۔ وہ یہاں تنہا نہیں یا۔ اس کے ہمراہ علم و ادب کا ایک کارواں بھی آیا۔

فاروقی سلطنت کے استیصال کے بعد وہ یہاں کم و بیش تیس سال تک مختلف حیثیتوں سے رہا۔ اسی سرزمین پر اُسے نتہائی عروج حاصل ہوا۔ اور جب بختِ بد نے برے دن دکھائے تو انتہائی زوال کی ذلتیں بھی یہیں برداشت کیں۔

عمارات کا ایک عظیم الشان مجموعہ تعمیر کرواکے اس نے برہان پور کو رشکِ بہشت بنادیا تھا۔ اس کی فیاضی، دریا دلی ن تدبیر اور کارِ خیر کے آثار کے باقیات نہر خیر[6] صفہ جامع مسجد، تالاب لال باغ، دار الشفا، حمام، عمارات، باغات، محلّے ور سرائیں ہیں۔ ان میں سے چند زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔

خانخاناں کی فیاضی، دریا دلی، حسنِ تدبیر، شجاعت اور کارِ خیر کی سرپرستی کے بے شمار کارنامے اسی سرزمین سے تعلق رکھتے یں۔ مآثر رحیمی کے اوراق میں ان کا ذکر محفوظ ہے۔

تا دہر شکوہِ خان خاناں دید — بر عہد سکندر و سلیمان خندید
از بس کہ نہادند بدرگاہش رو — ایران شد ہند و ہند ایران گردید (عبد الباقی نہاوندی)

اکبری عہد کی اکثر فتوحات —— قلم اور تلوار کے دھنی —— خانخاناں کی فوجی قابلیت اور بہادری کی رہینِ منت ہیں۔ وہ رکی اور فارسی کا بے عدیل شاعر تھا۔ اس کے فارسی رقعات انشاء میں اس کی مہارت کے شاہد ہیں۔ اس نے تزک بابری،

---

[1] ثمرات الحیات —— قلمی نسخہ —— مملوکہ راقم ورق

[2] فرحی —— حالات و کلام —— راقم کا مضمون —— برہان مارچ سنہ ۱۹۵۰ء

[3] کشف الحقائق۔ مملوکہ مولوی سید احکام اللہ صاحب [4] مخزنِ دعوت قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ

[5] حضرت موصوف کے ذاتی کتب خانہ میں قلمی نوادرات کا بیش بہا اور نادر ذخیرہ موجود ہے۔ حضرت موصوف عربی اور فارسی کے جید عالم ہیں۔ اپنے علم و فضل اور نوادرات سے طلبا کی امداد فرماتے رہتے ہیں۔ آپ کی ذات مغتنمات روزگار سے ہے۔

[6] نہر خیر کے لیے دیکھئے راقم کا مضمون —— کاریز نگر بیوبکا (ہندی) ستمبر سنہ ۱۹۵۲ء
نہر خیر۔ حمام وغیرہ کے لیے ملاحظہ کیجئے —— بہارستان —— اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء

کا ترجمہ سلیس فارسی زبان میں کیا تھا۔

سنسکرت اور بھاشا پر بھی اُسے عبور حاصل تھا۔ علم نجوم میں اس نے ایک مثنوی لکھی۔ جس کا ایک مصرعہ سنسکرت میں ہے اور دوسرا فارسی میں۔ اس کا نام "کھیت کوٹکم" ہے۔ اور ہندی ادب کا رحیم تو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

خانخانان کی فیاضی نے علم و ادب کو جلا بخشی۔ اس کی ہمت اور حوصلے کے جوش عطا و انعام کے بہانے ڈھونڈھتے تھے۔ خانخانان کا انعام و کرم شعر گوئی کو قوت بخشتا تھا۔ اور مدح کے قبل صلہ دیتا تھا۔

خانخانانِ عہد کا نعامش   طبع را رخصتِ شگفتن داد
داشت چون اعتماد بر شعرا ،   صلہ پیش از مدیح گفتن داد   (فیضی)

یہی وجہ تھی کہ شعرا، اور اہلِ کمال کا سیلاب امنڈ کر اس کے دامنِ تربیت میں آگیا۔ اس کی عالم گیر شہرت کے باعث ایشیا، عراق اور عرب سے علما، اور فضلا، جوق جوق اس کے دربار کا رخ کرنے لگے۔ مآثرِ رحیمی میں ان باکمالوں کا ذکر موجود ہے۔

اُس کے دربار کے مشہور شعرا نے (جو برہان پور میں تھے) خانخانان کی مدح میں زوردار اور بے شمار قصائد لکھے ایک ممدوح کے لیے اتنے قصائد اور اُن میں سے اکثر کا ایک ہی زمین میں لکھا جانا حیرت خیز بات ہے۔ فارسی ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

خان خانان کی قدردانی سے ہر قسم کا بیش بہا ادب پیدا ہوا۔ قصیدوں، غزلوں، ساقی نامے، مثنویات، رباعیات اور قطعات وغیرہ سے فارسی ادب کا دامن مالا مال ہوگیا۔

شکیبی کی نظمیں، غروری اور نوعی کے ساقی نامے، نہاوندی کے قطعات، اور ظلعہ اسیر کی قید میں غنی بیگ سلاآبادی کے قصائد تابناک جواہر پارے ہیں۔

نوعی کا ساقی نامہ اپنی قسم کا بہترین ساقی نامہ ہے۔ غروری کاشانی کا ساقی نامہ فن کا نادر نمونہ ہے۔

خان خانان کے دور کے ادب کی سرحد یہیں ختم نہیں ہوتی اس کے بیان کے لیے سفینہ چاہیئے۔

ملا محب علی سندھی اور شاہ خلیل اللہ نائب رسول اللہ خان خانان کے عہد میں تھے۔ مگر ان کو دربار سے کوئی ملازمت کا تعلق نہ تھا۔

شاہ فضل اللہ نائب رسول اللہ سے شاہ جہاں کو بے حد عقیدت تھی۔ وہ اُن کو حضرت میاں میر لاہوری کا ہم پایہ بزرگ تصور کرتا تھا۔ انھوں نے شعرا، صلحا، اور انبیا وغیرہ کی تاریخ وفات اور پیدائش کو نظم کیا ہے۔

ملا محب علی سندھی خان خاناں کے ہمراہ برہان پور آئے تھے۔ وہ اُن کے علم و فضل کا معتقد تھا۔ ملا صاحب کی عمر عزیز کے پچاس سے زیادہ سال یہاں گذرے۔ شیخ فضل اللہ سے سعادتِ بیعت اور شرفِ خلافت حاصل کیا۔ شیخ اسمٰعیل فرحی۔ نعمان نقشبندی، خواجہ ہاشم کشمی، جلال الدین اور برہان الدین راز الٰہی سے گہرے مراسم تھے۔ کشف الحقائق کے مؤلف فرحی نے ان کے کمالات اور فضیلت کا اعتراف کیا ہے۔

شاہ جہاں کو بھی ملا صاحب سے خاص عقیدت تھی۔ ایام شہزادگی میں ان ہی کی معرفت شیخ فضل اللہ سے خیر و برکت کا طالب ہوا تھا۔ وہ اکثر شاہ جہاں کے ہمراہ بھی رہے ہیں۔

ملا محب علی ایک بلند پایہ شاعر اور عارف کامل تھے۔ ایک دیوان۔ مثنوی۔ اور ساقی نامہ ان کی یادگار ہیں۔ ساقی نامہ کا لب و لہجہ صوفیانہ ہے۔ خان خانان کو مخاطب کر کے تصوف کے حقائق پر ایک مثنوی لکھی ہے۔ خان خانان کی مدح میں عام ڈگر سے ہٹ کر قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں دنیا سے بیزاری اور جہادِ نفس کی ترغیب دی ہے۔

خواجہ ہاشم کشمی بدخشانی المتخلص بہ ہاشم ــ مکتوبات امام ربانی کے مرتب و زبدۃ المقامات کے مصنف ــ ایک جید بزرگ اور صوفی شاعر تھے۔ ان کا کلیات ــ قصائد، مثنویات اور غزلیات پر مشتمل ــ کتب خانۂ آصفیہ (حیدرآباد) اور کاما لائبریری (بمبئی) میں محفوظ ہے۔ زبدۃ المقامات کے اشعار۔ غزلیں۔ رباعیات وغیرہ خاص خاص واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس کتاب سے موصوف کی زندگی کے متعلق مستند مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ کلام پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔

حضرت برہان الدین راز الہٰی کی تصانیف میں شرح آمنت باللہ وصیت نامہ و رشحِ پیم کہانی کے علاوہ ایک مثنوی بھی ہے۔ جس میں عقائدِ صوفیہ کا بیان ہے۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانۂ پیر محمد شاہ (احمد آباد) میں محفوظ ہے۔ ان کے کچھ اشعار۔ مثنویات اور دوہرے ان کتابوں میں ملتے ہیں۔

عاقل خاں رازی جو شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ عالمگیر کے ہمراہ دکن آیا۔ اور برہان الدین راز الہٰی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔ ان کے ملفوظات کو ترتیب دے کر ثمرات الحیات نام رکھا۔ اس کی دوسری تصانیف ــ ظفر نامہ عالم گیری۔ دیوان۔ مرقع۔ شمع و پروانہ اور مہر و ماہ وغیرہ ہیں۔

شاہ نور اللہ شکر گو بھی کے مرید و خلیفہ ــ علوم ظاہری و باطنی میں کامل ــ شاہ کریم اللہ ابن شیخ عبدالعزیز ابن شاہ برہان الدین راز الہٰی کے چند رسائل سلوک و معرفت میں ان کی یادگار ہیں۔ رسالۂ ہمہ اوست (نثر) کے علاوہ رسالۂ شہودیہ ان کا ایک منظوم رسالہ ہے۔

خان خانان کے عہد میں برہان پور فارسی ادب کا گہوارہ بن گیا تھا۔ اور یہاں کی شعر و سخن کی محفلوں پر اصفہان اور شیراز کی ادبی مجالس کو رشک آتا تھا۔ فارسی کا یہ رچا ہوا مذاق اورنگ زیب کے عہد میں اور اس کے بعد بھی قائم رہا کیونکہ عوام میں علم و ادب کا صحیح ذوق پیدا ہو چکا تھا۔

اس دور کے فارسی شعراء میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سعد اللہ گلشن۔ لالہ خوش حال چند فرحت۔ دولت رائے۔ رفیع خاں باذل دبیر۔ یوسف۔ نگہت۔ عاصی۔ نور محمد۔ محمد قلی سلیم علی نقی ایجاد۔ پروانہ۔ ضیا۔ غلام حسین امداد۔ ممتاز۔ موسوی خاں۔ لالہ رام پرشاد۔ بالاجی تالک زرہ۔ رونق وغیرہ۔

یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اردو کی ترویج و اشاعت میں بھی اس شہر کا خاص حصہ رہا ہے۔ اردو کے کئی نامور شاعر اس سرزمین سے اٹھے۔ سعدی[1] جس نے ریختہ میں الفاظ اور معانی کے موتی بکھا دیئے۔ برہان پور کے ایک نواح ــ شیر پور میں ابدی آرام کے مزے پا رہا ہے۔ اردو کے مرثیہ گویوں میں ــ ہاشم علی برہان پوری کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اردو کے شعراء کا فارسی کلام بھی ملتا ہے۔ غزل گو شعراء بے شمار ہیں۔ ان میں سے اکثر گم نام رہے۔ اکثر کو نامساعد حالات نے ابھرنے کا موقع نہ دیا۔ لیکن علم و ادب کی تاریخ کے صفحات ان کے کارناموں سے روشن ہیں۔

---

[1] سعدی ــ ملاحظہ کیجئے ــ ب۔ رس ــ ستمبر اکتوبر ۱۹۵۵ء ــ معارف اگست ۱۹۵۶ء ــ ہماری زبان اکتوبر ۱۹۵۵ء

ایک مکھی اور کئی مکڑیاں

گجیندر سنگھ

وہ بازار سے ایک غبارہ خرید لایا۔ پلاسٹک کے بڑے غبارے کو کمرہ میں اچھال اچھال کر وہ کود کود کر تکان پیدا کر رہا تھا۔ اس کی عمر گو پچیس برس کی تھی لیکن اس لمحے آپ اس کے قد و قامت اور عمر کو بھول کر محض جذبے کا احساس کر سکتے تھے۔ معصومیت اور اصلی خوشی جیسے دو ڈھائی برس کے بچے میں ہوتی ہے۔

اس کی ماں نے شور سن کر اندر جھانکا۔ اس کے چہرے پر نرمی لیکن افسوس کے آثار ابھرے: "یہ کیا؟ ایک غبارہ —— تم غبارے سے کھیلتے ہو"——

اسے ایسا لگا گویا کسی اجنبی نے جو ہمیشہ اس کی سنجیدگی اور شخصیت سے بہت متاثر ہوا ہو اچانک اسے یوں دیکھ لیا اور یہ لفظ کہے ہوں —— اور وہ جو اس کے جذبات سے پوری طرح واقف تھی۔ وہ جو اس کی ماں تھی۔ ایسے الفاظ اسی انداز سے کہے۔ اور بار بار کہے —— آج غبارہ تھا کل گھر میں بنائی کاغذ کی چڑیا تھی۔ پرسوں کوک والی موٹر تھی جو ساتھ ساتھ انگارے پیدا کرتی تھی اور اس سے پہلے بوجھ لادنے والی کرین تھی۔ اس سے پہلے گڑیا تھی اس سے پہلے آگ بجھانے والا انجن تھا۔ اس سے پہلے سڑک بنانے والا انجن تھا۔ اس سے پہلے اور ——

اور اس کی ماں نے پھر بھی ایسی حیرت سے یہ کہا تھا۔ مانا کہ اس بات میں مخالفت یا نفرت یا حیرت نہ تھی لیکن کہنے کی ضرورت کیا تھی۔

کھیل ختم ہو گیا تھا۔ وہ جوش وہ دو ڈھائی برس والی معصومیت نہ رہی۔ اس نے غبارے کو ہاتھوں سے دبایا اور ایک کونے میں نفاست سے رکھ دیا۔ جیسے بیس بائیس برس بعد بچپن کے کسی لباس کو یا کسی کھلونے کو محبت اور یادگاری کے طور پر چھوتے ہیں۔

جیسا کہ اس نے بارہا اپنی ماں سے باپ سے اور کئی واقف کاروں سے کہا تھا: "کھلونے میں پسند کرتا ہوں۔ یہ میرا بہت پرانا شوق ہے۔ بچپن میں میں نے ضرور کھیلے ہوں گے۔ لیکن بچپن میں یہ آگ بجھانے والا انجن یا فراٹے بھرتی لاری یا لکڑی کاٹتے بڑھئی یا جادہ نگلتی اور چوزوں کو کھلاتی مرغی اتنی اچھی نہیں لگتی۔ ایسا سرور پیدا نہیں ہوتا۔ پوری تمیز اور سمجھ بوجھ نہیں ہو سکتی اور کھلونوں کا سراہنا ناممکن ہو جاتا ہے ——" بچے کھلونوں کے کرتب نہیں دیکھتے تھے وہ توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ کتنی کوک ہونی چاہیئے۔ اور وہ ہر اداہر کرتب کا پورا لطف کیوں کر لے سکتا ہے۔

اور وہ ایک بڑی فرم میں ایک اچھے رتبے کا افسر تھا۔ دفتر میں وہ قاعدے اور حکم کو سختی سے استعمال کرتا تھا۔ وہ ایک رعب باز افسر تھا، چاہے اس کے نیچے زیادہ تر ملازم اس سے بڑی عمروں والے اور زیادہ تجربہ کار ہوتے تھے۔ لیکن اسے ان کی بزرگی، ان کے سفید بال ان کی جھریاں نظر نہیں آتی تھیں۔ چاہے اس جیسے کتنے بیٹے ان کے اپنے ہوتے تھے لیکن وہ اسے افسر ہی سمجھتے تھے وہ محض انہیں ایک کلرک، ایک اسٹینوگرافر ایک مستری، ایک چپراسی ایک چوکیدار ایک مزدور سمجھتا تھا۔ وہ ایک سخت طبیعت اور

کامیاب افسر تھا۔

لیکن وہ دوسری بات تھی۔

وہ اس شیشے کی الماری کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا جہاں چینی، جاپانی، جرمن انگریزی ٹینک، لاریاں، ٹرک، ٹرامیں، ریلوے، لکڑی کاٹتے بڑھئی چکر کاٹتے چھتری کے سائبان والے بچوں سمیت گھوڑے، بچے کو سلاتی ماں، چوزوں والی مرغی اور درجنوں انوکھے کھلونے پڑے تھے۔ اس نے انہیں باری باری لطف لے کر دیکھا اور دراصل وہ پلاسٹک کا غبارہ بڑا دقیانوسی سا دکھائی دیا گو اسے اچھالنا بھی اچھا شغل تھا۔ اس نے سگریٹوں کی ڈبیا لی اور ایک کو سلگا کر باہر نکل گیا۔

یہ ایک عام واقعہ تھا لیکن جب ایک عام سے واقعہ کے بعد کوئی خاص بات ہو جاتی ہے تو اسی معمولی قصے کو دہرا دہرا کر سناتے ہیں۔

یعنی اسی وجہ سے ایسی معمولی وجہ سے وہ کچھ چڑ گیا یا زیادہ سنجیدہ ہوگیا یا اس نے اپنی ایسی فضول یا چھوٹی سی خوشی سے سنبھل کر سگریٹوں کی ڈبیا اٹھائی اور باہر چلا گیا جیسے وہ اکثر شام کو کسی ریستوران میں کافی پینے چلا جاتا تھا۔

یہ کیسے عجیب لوگ ہیں جو محض ایک پیالی کافی یا چائے پینے، زیادہ سے زیادہ ایک دو انڈے اور توس کھانے ریستوران تک جانے کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ دوگنا، تگنا خرچ کرتے ہیں اور پھر خوشی خوشی لوٹتے ہیں۔ جیسے اب اس کی ماں اور اس کا باپ، دونوں بہنیں شام کے وقت چائے پیتے ہیں اور اگر وہ کہے تو اس کے ساتھ کافی بنانے اور پینے میں کتنی خوشی ہو سکتی ہے لیکن اس نے کبھی خیال ہی نہیں کیا کہ گھر میں کھانے سے، گھر میں اپنی چیزوں کی خواہش کرنے سے سب مل جل کر دہی تلے ہوئے آلو، تکیاں، یا انڈے کھا سکتے ہیں اور ایک دل کش گھریلو ماحول بن سکتا ہے۔ لیکن وہ جاکر الگ کھاتا ہے، اس کا باپ کہیں کھڑا پوریاں اور مٹھائی کھا آتا ہے، اس کی بہنیں الگ کھانے کے لیے گھومتی ہیں ــــ وہ سب اکٹھا رہتے تو ہیں، لیکن ایک ریستوران، ایک ہوٹل کے اجنبی ساتھیوں کی طرح ــــ

اب وہ باہر گیا اور قطعی بھول گیا کہ اس کی بہن نے اسے باہر جانے کے لیے صبح تاکید کی تھی اور وعدہ لیا تھا۔ وہ اپنا جہیز تیار کر رہی تھی۔ آدھا جہیز بن چکا تھا، باقی اس شام کو ضروری خریدنا تھا۔ اس کی شادی میں کچھ روز باقی رہ گئے تھے۔ اس کی دونوں بہنیں تیار ہو رہی تھیں۔ جس کی شادی ہونے کو تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا شادی نہیں بلکہ کسی ٹھوکریں کھاتے اور بھاگتے چھپتے شہزادے کی طرح اب ایک سلطنت ہاتھ آ گئی تھی۔ بنا بنایا گھر تھا، معقول آمدنی تھی اور پڑھے لکھے خاوند، بنے بنائے گھر اور معقول آمدنی کو ایک ہی ساتھ جھپٹ کر محض حکومت کرنی تھی۔ ساری دنیا پاؤں پر تھی۔ وہ دونوں بھی کام کرتی تھیں لیکن اب بڑی بہن نے جس کی شادی ہونے کو تھی، استعفٰی دے دیا تھا ــــ

وہ یہ سب باتیں بھول گیا اور ریستوران کے برآمدے میں اسے دفتر کی ایک کلرک لڑکی مل گئی جو دفتری خط و کتابت کو وصول کرنے اور بھیجنے کی ذمہ دار تھی۔ اس نے تکلف کے طور پر اسے بلایا اور ریستوران میں چل کر ایک پیالی کافی پر مدعو کیا اور پوچھا کہ وہ کسی خاص کام سے تو نہیں جا رہی تھی ــــ

"شکریہ میں تو فلم دیکھنے کے ارادے سے نکلی تھی۔"

اور اس نے آنکھیں سکیڑ کر سوچا کہ شام بالکل خالی تھی کوئی ایسی بات نہ تھی جو حائل ہو اور اس نے فلم دیکھنے کی پیش کش کی اور وہ کافی پی کر وہاں چلے گئے۔ یہ حقیقت اسے بڑی عجیب و غریب لگی اور اسے ایک بڑا دھچکہ لگا کہ وہ دفتر کی کلرک لڑکی

اس کی بہنوں کی طرح مہذب، بلند خیال، بلند طبقہ اور شریف تھی۔ اس نے ہمیشہ ان لوگوں سے دور رہنا صحیح سمجھا تھا۔ وہ اسے گھر تک چھوڑ کر واپس کھانے کے وقت پر پہنچا۔ اور اسے کوشش کے باوجود اپنی غفلت اور کم یادداشت پر افسوس یا ملامت نہ ہوئی۔ شام کو اس کے بغیر بھی خرید و فروخت ہو چکی تھی، اس نے بل دیکھ کر چیک لکھ دیئے اور مسکراتا ہوا سونے کے لیے چلا گیا۔

اس کی بہن کی شادی مقررہ روز بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔ وہ ایک بھائی کے طور پر مکمل یک جہتی اور محنت سے کام کرتا رہا اور ہر لمحہ ہر وقت ہر مشورے ہر مشکل اور مسئلے کے لیے موجود رہا۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنی مصروفیت اور اتنے بڑے کاموں میں وہ کیوں کر اور کس طرح اس کلرک لڑکی سے ملتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے شادی کے دو روز بعد صبح ناشتے کے وقت ہنستے کھیلتے کہا "ہاں۔ ہاں۔ میں خود چاہتا ہوں۔ ایک لڑکی گھر سے گئی، ایک لڑکی گھر میں آجائے اور توازن قائم رہے۔"

"اور میرے بعد؟" چھوٹی بہن نے پوچھا۔ "میرے بعد توازن کیسے قائم ہوگا۔ اب تو لڑکی آجائے گی۔ دوبارہ — دوبارہ —"

"پھر کوئی لڑکی یا لڑکا آسکتا ہے۔" اس نے کہا "بڑا نہیں تو چھوٹا —" وہ ہنس ہنس کر پوچھتے رہے لیکن اس نے آخر بتا دیا۔ اجازت لینے یا جھجکنے کے انداز سے نہیں، محض اطلاع دے دی۔

ایک ہنگامہ ہو گیا۔ عام طور پر ایسے معاملوں میں نہیں ہوتا۔ لڑکا برسرِ روزگار ہو، خود پرست ہو اور آزاد خیال ہو تو اکثر نہیں ہوتا لیکن اب ہنگامہ بپا ہو گیا۔ حالانکہ وہ کماتا تھا اور اس کے ماں باپ کھاتے تھے اور اس کے باپ نے ایسی بات کہہ دی۔ اسے دراصل غصے میں قابو نہ رہا اور اس نے کہا "تم شادی کرو گے ایسی جگہ کرو گے تو اس گھر میں وہ نہیں آئے گی میں نہیں آنے دوں گا۔"

اس کی ماں گھبرا گئی۔ اتنے شور و غل میں اس نے سب کے آگے ہاتھ جوڑے، خاموش رہنے کو کہا لیکن بات بہت بڑھ گئی اور وہ ناشتہ چھوڑ کر دفتر چلا گیا۔ دوپہر تک گھر میں سنسناتی خاموشی تھی۔ لیکن جذبات ٹھنڈے نہیں ہو سکے تھے۔ وہ کھانے کے لیے نہیں آیا۔ وہ رات سونے کے لیے بھی نہیں آیا۔ دو ہفتے تک وہ گھر میں نہیں آیا۔ اس کا باپ اپنی اکڑ قائم کیے رہا۔ اس نے دفتر میں ٹیلی فون کرنے یا جا کر ملنے اور صلح صفائی کرنے کی کوئی کوشش نہ کی اس نے بیٹی سے وعدہ لے لیا کہ وہ فون کرنے یا ملنے نہیں جائے گی۔

دو ہفتہ بعد اس نے بہن کو فون کیا اور اپنی شادی کی خبر سنائی۔ اس نے ماں باپ کے بارے میں بھی پوچھا۔ دراصل اسے بھی امید نہ تھی کہ کوئی اسے پوچھنے منانے تک نہ آئے گا۔ اس نے بہن کو شام کے وقت سینما اور کھانے پر بلایا — اور ایک ریستوران پر ملنے کی جگہ مقرر کی۔

وہ ایک لمحہ رکی پھر اس نے کہا "اچھا میں پہنچ جاؤں گی۔" ٹیلی فون بند ہو گئے۔ بعد میں اسے سوجھا کہ اس نے بجائے خود پہنچنے کے اسے کیوں نہ آنے کے لیے کہا۔ اسے بڑا افسوس ہوا۔ اس نے پریشانی سے دوبارہ فون کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ دفتر سے نہیں بول رہا تھا۔ اس نے چھٹی لے رکھی تھی۔ اور اس کا پتہ؟۔ وہی پتہ اس نے سنا تھا جہاں وہ خود رہتی تھی۔ اس نے پتہ تبدیل نہیں کیا تھا۔

اس نے گھر پہنچ کر جب یہ خبر سنائی تو اس کی ماں رو پڑی۔ اس کا باپ سکتے میں آگیا۔ اس کا دم خم، اس کا غصہ، اس کی ضد، اس کی ضد اس کی اکڑ یوں ختم ہو گئی کہ وہ کانپ گئی۔ وہ سب دیر تک بیٹھے روتے رہے۔ اس کی ماں بھی ساتھ جانے اور بیٹے کو منانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ لیکن اس کے باپ نے نفرت سے کہا "اسے شرم نہیں آئی کہ وہ خود دلہن کو لینے کے لیے بھی

نہیں آیا۔ اسے شرم نہیں آئی کہ اس نے ماں اور باپ کو اطلاع تک نہ دی۔ بلایا تک نہیں۔ اس نے چوروں کی طرح شادی کرلی۔ ہمیں جاکر منانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم معافی مانگیں گے؟ یا وہ معافی مانگے گا"۔

وہ خاوند تھا، وہ بیٹا تھا۔

بیٹا روٹھتا تھا تو الگ جاکر رہنے کی دھمکی دیتا تھا۔ نہ ملنے کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ بلانے آنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا اور وہ خاوند ساری عمر وابستہ رہا اور اس نے ہمیشہ اسے اپنا سمجھا۔ وہ اپنا گھر سمجھا۔ ہمیشہ ساتھ رہنا صحیح اور ضروری سمجھا۔ وہ کہتا تھا۔ مت جاؤ۔ بالکل نہ مناؤ۔ وہ رک گئی۔

اس لڑکی کو کسی نے نہ روکا۔ وہ دھڑکتا دل اور کانپتے ہاتھ پاؤں لے کر بھائی کو ملنے گئی جو چند روز پہلے اتنا اپنا تھا اور اب اتنا دور ہو گیا تھا۔

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے منگیتر سے پہلی بار ملنے لگی ہو۔ صرف یہ جانا پہچانا کبھی اس کا اپنا سگا بھائی تھا۔ دو باتیں اس نے اچھی طرح محسوس کیں۔ اس کا بھائی شادی شدہ ہو گیا تھا۔ کئی لوگ اگر شادی کرنے کے بعد ملیں تو گمان تک نہیں ہو سکتا۔ اگر ان کی بیویاں ساتھ بھی ہوں تو آدمی خواہ مخواہ شک کو دور نہیں کرسکتا۔ لیکن بیوی کے بغیر وہ دیکھتی تو فوراً محسوس کرلیتی کہ وہ شادی شدہ ہے۔ دوسری بات اسے بھابی کی اپنے متعلق لاپرواہی، ہچکچاہٹ، کھنچاؤ لگا۔ کم از کم ان دو چار گھنٹوں میں وہ اس پردے کو نہیں ہٹا سکی تھی اور یہ وہ زیادہ مضبوط ہوتا نظر آتا تھا جب وہ اسے گھر پر چھوڑنے کے لیے آئے۔

بہت مجبوری تھی گھر تک آکر اندر نہ جانا ناممکن سی بات تھی۔ لیکن سب بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور اسے کچھ دیر تک دروازے پہ دستک دینی پڑی۔ اس نے کہا "بہت دیر ہو گئی ہے۔ سو رہے ہیں۔ میں پھر مل لوں گا۔ اس وقت بہت دیر ہو گئی ہے اور ہمیں بھی نیند آ رہی ہے"۔

نہ اس نے روکنے کی کوشش کی اور نہ انہوں نے خواہش کی۔ وہ چند ھیائی گھبرائی اندر پہنچی اور ماں باپ کے سوالات کی بوچھاڑ کے جواب دیتی رہی۔ "اس نے کوئی بات کی؟"

"ہاں۔ کی۔ اس نے کہا تھا۔ میرا سامان تیار کردینا۔ میں کل پرسوں تک لے آؤں گا۔ کپڑے بنوائے ہیں لیکن پورے نہیں پڑتے"

وہ بتیاں بجھانے کے بعد دیر تک پہلو بدلتے رہے۔ آخر اس کے باپ نے اپنی طرح ان کے پلنگوں کی چوں چراں سن کر کہا "جہنم میں جائے۔ سو رہو"۔ وہ دونوں سو گئیں۔ لیکن وہ خود نہ سو سکا۔

وہ ایک ہفتہ تک سامان لینے نہیں آیا۔ جب تک سامان ان کے سامنے رہا۔ گو بکسوں میں بند تالے لگے امانت کے طور پر پڑا رہا لیکن انہیں بیٹے کی خفگی، شادی، علیحدگی کا صحیح جائزہ محسوس نہ ہو سکا تھا۔ اور جس روز اس نے دفتر کے چپراسی کو ایک تین انچ کا رقعہ دے کر بھیجا۔ پوری طرح دھاگے ٹوٹ کر الجھ کر بے معنی گتھی سی بن گئے اور اس کا سلجھاؤ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ایسے بیٹے کو نہیں ملنا۔ یہ ایک جذباتی پہلو تھا۔ جوش آدمی کے ارادوں کو مضبوط بنا دیتا ہے۔ محض جب تک جوش کی کھینچ تان میں دم خم رہتا ہے، وزن ہوتا ہے۔ جوش کسی وجہ سے ہو، یہاں دھچکے اور گونج کی وجہ سے ہوا۔

اور دھچکہ ایک زلزلے کی طرح نئی سطح بنا کر ختم ہو گیا۔ گونج کا تجربہ باقی رہ گیا تھا۔

ایسے بیٹے سے قطع تعلق ایسے حالات میں تخیل کی اڑان تھی۔ اور صحیح اڑان تھی۔

ایک روز وہ معمول کی طرح باہر گیا اور اچانک بیٹے کے کمرے میں کرسی پر بیٹھا چونکا۔ وہ جان بوجھ کر وہاں گیا تھا۔ اسے اپنے اٹھتے قدموں اور سوچتے دماغ کی ہر حرکت سے آخر تک پوری واقفیت تھی۔ گلہ اور افسوس اور خفگی اور امیدیں تو اس نے کہی سنیں اور پھر ننگی حقیقت سامنے آکھڑی ہوئی۔ "تین مہینوں کے بل پڑے تھے اور کہاں سے سامان آئے گا۔ ابھی تمھاری چھوٹی بہن کی شادی کرنی ہے جسے باہر جانے کے لیے تم گھر تک نہیں آئے۔" اور اس کا بڑبڑانا۔ "کیا ظلم کر دیا ہم نے تمھیں اتنا کہا کہ بہن تمھاری شادی ایسی جگہ اچھی نہیں تھی"۔۔۔

"تین مہینوں کے بل"۔۔۔ اٹھتے وقت اس نے کہا۔ آخر دفتر تھا اور اسے گھر کا تانا بانا یوں بکھرتا ہوا سنبھالنا تھا۔ گھر۔ جس کے لیے شادی بچے، ماں بہن، باپ بھائی، میکہ سسرال پختگی کے آہنی ستون تھے اور ان سب کے ساتھ صحت، محبت اخوت، ہمدردی، فرائض کی پالش لازمی تھی ۔۔۔ لیکن محض ایک مہینے کی خرچ کی رقم کا ہونا اکسیر تھا۔ محض ایک مہینے کا جیب خرچ کم ہونے سے اس گھر کا تانا بانا یوں بکھرتا تھا۔۔۔ اور یہاں تین مہینوں کے بل جوں کے توں پڑے تھے۔۔۔

ایسی جھڑپ کے بعد اتنی گالیوں، جھڑکوں بحث کے بعد فرائض اور ہمدردی الاپنے کے بعد وہ باہر نکلا تو اس کی جیب میں محض دو سو کا ایک چیک تھا اور تین مہینوں کے بل تھے۔۔۔

وہ بیوی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اگلے مہینے کی تاریخ اچھلتی کودتی آجاتی تھی اور آپ جی بھر کر محنت کرتے تھے، مشقت کرتے تھے، کماتے تھے اور ہانپتے کانپتے ایک مٹھی بھر رقم کے حق دار بنتے تھے اور لوگوں میں بانٹ دیتے تھے اور آپ کے پاس کچھ نہیں رہتا تھا۔ آپ کماتے تھے اور خالی جیب رہتے تھے۔ آپ کماتے تھے ان اجنبی لوگوں کے لیے کیوں کہ زمین نے اناج پیدا کیا تھا، درختوں نے پھول اور پھل دیے تھے، جانوروں نے دودھ دیا تھا اور کپاس کے کھیت ہوتے تھے اور قدرت کے ان تحفوں اور خدا کی اس کائنات کے پھولنے پھلنے کی وجہ سے آپ کو کمائی کرنی پڑتی تھی، مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ اور اگر یہ کمائی خود آپ کی نہیں ہوتی تھی، آپ کے بیٹے کی ہوتی تھی تو آپ محض اسے کہہ سکتے تھے اور وہ تین مہینوں کے خرچ کی خبر سن کر محض دو سو کا ایک چیک کاٹ دیتا تھا اور بیوی اور اپنے گھر اور اپنی ضرورتوں کی فہرست گنواتا تھا۔۔۔ وہ یہ وعدہ نہیں کرتا تھا کہ دو سو روپے ماہوار وظیفہ لگا دیا جائے گا۔ یہی سب کچھ تھا۔ اور باقی وہ مجبور تھا اور آپ مجبور تھے، ایک گھر کرائے پر تھا۔ کھانا، پہننا اور تین آدمیوں کا چلنا پھرنا کرائے پر تھا۔

گھر کا تانا بانا یوں بکھرتا تھا۔۔۔

اور ایسے میں ایک ہمدردی بھرا ہاتھ محبت بھرا ہاتھ آکر کندھے کو دباتا تھا۔ "میں جو ہوں"۔ بیٹی نے کہا۔ "میں کام جو کرتی ہوں۔ میں تنخواہ جو لاتی ہوں۔ ایسے آدمی کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب کیا ضرورت ہو گی۔ ہم تین آدمی دال روٹی نہیں کھا سکیں گے؟"

یہ بیٹی تھی۔ یہ رحمت تھی۔ تین مہینوں اور ہر مہینے کے کرائے کا یہ ایک لاجواب وسیلہ تھا۔ انھوں نے بیٹے کا خود کو حق دار سمجھا تھا۔ اس بیٹی کی شادی کے بعد وہ دونوں بے ٹھکانہ ہو جائیں گے۔ ضروری بات تھی۔ بیٹی کی تنخواہ، بیٹی کی ہمدردی، بیٹی کی مدد بہت تھی لیکن شرم کی بات تھی۔ یوں بیٹا کمائی کرتا ہو تو بیٹی کی آمدنی صورت حال کو ننگا کر کے نہیں رکھ دیتی تھی اور جب محض بیٹی کا سہارا رہ جائے۔۔۔

انوں نے جی بھر کر اسے سینے سے لگایا۔ اسے جی بھر کر پیار کیا جھجکتے جھجکتے اس کی تنخواہ لی اور فی الحال بل لوٹائے نہیں جا رہے تھے اور بیٹے کو پھر کوشش سے سیدھی راہ پر لایا جا سکتا تھا۔

اگلے مہینے اسے جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ جانے کے لیے جی کڑا کر رہا تھا۔ ٹہل ٹہل کر بحث اور فقرے تیار کر رہا تھا۔ لیکن ڈاک سے ایک لفافہ آیا محض ایک چیک پچاس کا تھا ساتھ کوئی رقعہ پرچہ نہیں تھا۔ اس نے لفافہ پھاڑ کر ٹکڑے کر کے دیکھا کہ کوئی خط کوئی چھوٹا سا دو فقروں کا پرزہ ہے لیکن صرف وہ چھوٹا سا چیک ہی تھا۔

وہ زور زور سے چیخا۔ اس کی بیوی نے برا منایا اور لڑکی نے کہا "لوٹا دو — لوٹا دو —

لیکن وہ چیک لوٹایا نہیں جا سکا۔ رقم کی ضرورت تھی اور بیٹے کے دستخط چمکتے ہوئے ڈھارس باندھتے تھے۔

اگلے مہینے اور اس کے بعد ہر مہینے پچاس کا ایک چھوٹا سا چیک اسے ملتا رہا۔ کسی رقعے کے بغیر۔ بذریعہ ڈاک۔

ایسی بیٹی کے لیے چاند سے دولہا کی ضرورت تھی۔

ایسی بیٹی کے لیے سنگ مرمر کے محلوں کی ضرورت تھی۔

ایسی بیٹی کے لیے قارون کے خزانوں کی ضرورت تھی۔

ایسا دولہا، ایسا گھر، ایسی قسمت کا ملنا مشکل تھا۔ لیکن ناممکن نہ تھا۔ دیر ہو سکتی تھی۔ دیر کا حرج نہیں تھا۔ شادی ضروری تھی لیکن ایسی جگہ جو اس کے لائق ہو، ان کی بڑی بیٹی کی طرح نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ وہ پہلے ایک سال تک لکھتی تھی "میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ میں کتنی اچھی جگہ رہتی ہوں۔ آمدنی معمولی ہے اور وہ بھی گھر میں نہیں آتی" — وہ جوا کھیلتا تھا۔ لوگ شراب پی کر گھر میں شور مچاتے تھے۔ لوگ شراب کے نشے میں شرافت، اخلاق اور تمیز تہذیب گنوا بیٹھتے تھے لیکن وہ جوا کھیل کر اسے مارتا بھی تھا اور بے عزتی بھی کرتا تھا۔ اسے اپنے زیورات اتارنے پڑے اور اس کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ سب مجبور تھے — لیکن اب مجبوری کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ایک دولہے کی تلاش تھی جو ان کی ایسی اچھی بیٹی کے قابل ہو۔ اور اس کے بعد — پھر — اس کے بعد — بوڑھی ماں۔ بوڑھا باپ — پچاس روپوں کا حقیر چیک!

یہ —؟ یہ بہترین ہے؟

اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہر لحاظ سے مکمل ہے لیکن کیا یہ بہترین ہے؟ کوئی بھی ایسا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ اور نہ معلوم اس کا اصلی روپ کیا ہوگا۔ کون جانے، اس کا مزاج کیسا ہے۔ کیا پتہ یہ سب باتیں اس کے اچھا کل اور بہترین ہونے کے متعلق صحیح ہیں یا — جیسے بڑی لڑکی لکھا کرتی تھی۔ ایک واقعہ نہ تھا۔ آئے روز سینکڑوں تھے۔ بیٹی! شادی جوا بھی نہ ہو — خوفناک تھی — بیٹی! دلہن چوچست چالاک نہ ہو اکثر دکھی ہو جاتی تھی اور یہ بیٹی کتنی معصوم تھی۔ یہ بیٹی بڑی پیاری تھی۔ اور اکثر لوگ بھیڑیوں کی طرح درندے تھے — اور شادی کے بعد کیا کرتے تھے؟ کیا کہتے تھے؟

نہیں جب تک بہترین نہ ہوگا۔ جب تک پختگی اور اطمینان نہ ہو۔ بالکل نہیں۔

لوگ کہتے تھے کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ اتنے اچھے لڑکے، اتنے بڑے خاندان۔ ایسے بارروزگار لڑکے کہاں اور کسے ملتے ہیں! لوگ ان کی عقل پر پڑے پردے کو کوستے تھے، افسوس کرتے تھے اور لڑکی کے مستقبل کا واسطہ دیتے تھے۔

ایسی زندگی، ایسا ماحول، ایسے خیالات، ایسے حالات، ایسی آمدنی —

اب ایک معیار بن گیا تھا۔ ایک کھلبلی کے بعد اب سکوت ہو گیا تھا۔ دیکھا جائے تو اس میں حرج کیا تھا؟

وہ کھلم کھلا باہر نکلتا تھا۔ لوگ گھر میں آتے تھے اور اس کے بیٹے کی بدسلوکی پر لعنت بھیجتے تھے اور پھر پوچھتے تھے۔ "دفتر گئی ہیں"۔۔۔
"جی"۔ "کب لوٹتی ہیں"۔ "چھ بجے تک"۔۔۔

ایک لمحہ وہ رک کر کہتا تھا۔ "اور آنے کے بعد پھر گھر میں بیٹھی ریڈیو سنتی ہے۔ کشیدہ کاری کرتی ہے۔ کتاب پڑھتی ہے۔ آوارہ باہر ٹکریں نہیں مارتی۔ آفریں کی بات تھی۔ اور لوگ تعریف کرتے تھے۔ "یہ لڑکی ہمارا بیٹا ثابت ہوئی ہے۔ یہ نہ ہوتی تو ہم ٹھوکریں کھاتے ہوتے۔ ہر مہینہ دو سو سے زیادہ لاکر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے"۔

یہ ایک معیار بن گیا تھا۔ اب وہ شام کو تینوں بیٹھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی تھیں۔ کوئی اختلاف نہ تھا۔ کوئی جھگڑا کوئی شور و غل نہ تھا۔ "بیٹی" اس نے کہا۔ "باتوں باتوں میں ہم نے انھیں یہ بھی کہا کہ اچھا لڑکا ہو۔ ہمارے لائق۔ عام لوگوں کی طرح نہیں۔ شادی۔ آج کل کی شادی۔۔۔" اس کی آنکھیں تیزی سے اس کے گالوں، ہونٹوں، نتھنوں، پلکوں، ابروؤں پر گھوم رہی تھیں۔ "چھوڑو"۔۔۔ ایک عزم، ایک فیصلہ، ایک پختگی، وہ لڑکی اس ماحول کو، اس بندوبست کو اب گنوانے سے ڈرتی تھی، اتنے خوف ناک قصے روز سناتے تھے۔۔۔ ٹھیک چل رہا ہے۔ میں بڑی خوش ہوں۔ مفت کا جھنجٹ۔۔۔ شادی! "خیال بہت تھے جذبے تھے، پورے بنے بنائے افسانے تھے لیکن دماغ میں محدود۔ قدم اٹھانے کی کوشش سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ آدمی کانپ جاتا تھا۔۔۔

ایک بڑا جھنجٹ، خوف ناک جھنجٹ۔ ایک بوجھ تھا جو اتر گیا۔ وہ مسکرایا۔ اس نے جیب میں پڑے سکوں کو دبایا۔ مضبوط سکے تھے۔۔۔

آج آلو پنیر کا سالن پکا تھا۔ کل مرغِ مسلم ہوگا۔ کھانے کے لیے اس نے صابن سے ہاتھ دھوئے اور تولیے سے رگڑ کر پونچھے۔

دوڑ صفحہ ۳۳ سے آگے

آپ گھبرایئے نہیں۔۔۔ اب میں آپ کے ساتھ نہیں چلوں گی۔۔۔ معین صاحب ہیں نا۔۔۔ بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔ ڈنڈا گھمانے لگتے ہیں"۔۔۔

"اوہ معاف کرنا۔۔۔ معین صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔۔۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔۔۔ تم میرے ساتھ ضرور چلو۔۔۔"

ہاں ہاں ضرور چلو۔۔۔ دفعتہً بیوی معہ اسباب کے ٹرین سے اتر کر ہمارے سامنے آموجود ہوئی۔۔۔ میرا ذہن ان تمام باتوں سے ہٹ کر یہ سوچ رہا تھا حنت بیوی گھر پہنچ کر مجھ سے یہ سوال کر بیٹھے،

"آپ بنگلور میں بیکار نہیں رہے۔۔۔ کیا جواب دوں۔۔۔"

(طنز آمیز مزاحیہ افسانہ)

دوڑ

(از) صابر کوسگوئی

بیوی کو رخصت کرکے جونہی پلیٹ فارم سے باہر نکلا، ایک اَن جانی عورت مجھ سے آکر ٹکرا گئی،

"میں بھی چلوں گی — آپ کے ساتھ"

"ارے! تم میرے ساتھ، راجہ جی نگر — خوب!!"

"ہاں چلوں گی —"

"کیوں؟ آخر کیوں — چلو گی مرے ساتھ — تم کون ہوتی ہو؟"

"میں بھی اک عورت ہوں، — جوان خوبصورت"

"میں دیکھ رہا ہوں"

"آپ — آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں — میں کھانا کھاتا ہوں، کافی بناتا ہوں — اور پانچ میل کا راستہ ٹہلتا ہوا دفتر جاتا ہوں، ساڑھے پانچ بجے تک موٹی موٹی پرانی فائلیں میز پر پھیلا کر بیٹھے رہتا ہوں، رات میں تھک تھکا کر سو جاتا ہوں — اور اگر نیند نہ آئے، تو شاعری کرنے لگتا ہوں"

"یہ شاعری کیا ہوتی ہے بابوجی —"

"ارے تم نہیں جانتی شاعری سے"

"تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
پھر کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

"اوہ! — میں بھی — گیت لکھتے ہیں آپ"

"تم بھی اک سراپا گیت ہو، — ایک مکمل کہانی —"

"کہانی؟ — میں بھی سناؤں گی — آپ کو اپنی کہانی —"

"نا بابا! مجھ سے تمہاری کہانی نہ سنی جائے گی — میری کہانی خود ادھوری پڑی ہے" —

"تب تو آپ اچھے آدمی نہیں" —

ہاں ٹھیک کہا — تم نے — اگر اچھا آدمی ہوتا تو ۳۹۰ میل سے اِدھر نہ آتا"

"بھاگ آئے ہیں آپ؟"

"ہاں"

"کس جرم میں"

"جرم — کوئی بڑا نہیں — یہ کمبخت پیٹ"

"اوہ — پیٹ — مجھے بھوک لگی ہے —"

"مجھے بھی بھوک لگی ہے — جاؤ تھوڑی سی مٹی پھانک لو" —

"آپ مذاق کرتے ہیں" —

"مذاق؟ تم سے، ایک ان جانی عورت سے — تم کو بھوک لگی ہے نا — بھوک بڑی لذیذ ہوتی ہے — آؤ مرے ساتھ، کیا کھاؤ گی؟" —

"چنے بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں بابوجی — میں تو چھلکا سمیت کھا جاتی ہوں، ایک آنہ میں بہت زیادہ آجاتے ہیں — اور پیٹ بھی بھر جاتا ہے —"

"مگر تمہارا پیٹ تو پھولا پھولا سا معلوم ہوتا ہے کھا گئی ہوگی — خوب چنے، ادھ سیر سے زیادہ — بھوک جو لگی تھی نا" —

"چنے نہیں — بابوجی — اس میں تو گوشت ہے"

"گوشت! بڑی خوش نصیب ہو تم! ہمیں تو یہاں

کئی دنوں سے گوشت ہی نہیں ملا"

"بچہ ہے اس میں"۔۔۔

"اوہ۔۔۔ بچہ! کس نے تمہاری بھوک مٹائی؟"۔۔۔

"آپ نے"۔۔۔

"بیوقوف۔۔۔ میں پوچھتا ہوں۔۔۔ کس کا ہے یہ"

"وہ بھاگ گیا"۔۔۔

"کدھر بھاگ گیا؟۔۔۔ ذرا دکھا دو۔۔۔ شوٹ کر دوں گا"۔۔۔

"بمبئی چلا گیا"

"اچھا ہوا۔۔۔ تم بھی اس کے پیچھے بھاگ جاؤ۔۔۔ دنیا ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی رہتی ہے۔۔۔ ہندوستان پاکستان سب ہی ایک دوسرے کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔۔۔ یہ دیکھو! یہ قلی بے چارہ گاڑی کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ زندگی بھاگ دوڑ کا نام ہے۔۔۔ تم بھی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ کر یہاں آئیں۔۔۔ میں بھی اپنے پیٹ کو لیے بنگلور تک بھاگ آیا۔۔"

"یہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔ آپ۔۔۔ میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ میں ضرور آپ کے ساتھ چلوں گی۔۔۔"

"نہیں چلو گی۔۔۔ اگر چلو گی تو پٹ جاؤ گی۔۔۔ جانتی ہو معین صاحب کو۔۔۔"

"نہیں"۔۔۔

"ارے اتنے مشہور پہلوان اور اسپورٹ میان کو نہیں جانتی۔۔۔ ایک موٹا سا ڈنڈا لیے اپنے مکان کے سامنے میرا انتظار دیکھ رہے ہوں گے، جب کبھی ذرا دیر ہو جاتی ہے، اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکالے سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں، کہاں گیا تھا تم۔۔۔ اتنی دیر کیا کر رہا تھا۔۔۔ اور کبھی کبھی تو اپنا ڈنڈا بھی دکھا دیتے ہیں"۔۔۔

"تب تو بڑی مشکل ہے"۔۔۔

"مشکل کوئی نہیں۔۔۔ میری رائے ہے تم کسی سے شادی کر لو۔۔۔ اور اس زندگی کے بھاگ دوڑ کو ختم کر دو۔۔۔ ویسے یہ میرے پتہ کا کارڈ ہے۔۔۔ جس وقت چاہو، مل سکتی ہو"

"اچھا نمستے"۔۔۔

"نمستے"۔۔۔

بات گئی گذری۔۔۔ مجھے یاد ہی نہ رہا، ایک دفعہ زندگی میں کوئی ان جانی عورت مجھ سے آ کر ٹکرا گئی تھی۔۔۔ بیوی حیدرآباد سے آ رہی تھیں۔۔۔ انھیں لینے اسٹیشن پہنچا۔۔۔ جونہی پلیٹ فارم پر گاڑی رکی۔۔۔ میں زنانہ کمپارٹمنٹ کی طرف بھاگا۔۔۔

"نمستے بابوجی۔۔۔ ایک عورت مجھ سے آ کر ٹکرا گئی۔۔۔ ٹھیریئے کہاں بھاگ رہے ہیں آپ"

میں گرتے گرتے بچا۔۔۔ "ارے تم! کہاں تھی۔۔۔ کدھر تھی۔۔۔ کیا کر رہی ہو"

"زندگی کی دوڑ سے تھک کر بیٹھ گئی ہوں بابوجی۔۔۔ اب میں نے ایک قلی سے شادی کر لی ہے۔۔۔ جو زندگی کے پیچھے ہمیشہ بھاگتا رہتا ہے۔۔۔ اب میری زندگی میں ٹھیراؤ پیدا ہو گیا ہے۔۔۔ یہ میرا پہلا بچہ ہے۔۔۔ بابوجی ایک آنہ میں بہت زیادہ چنے آتے ہیں نا۔۔۔ اور پیٹ بھی بھر جاتا ہے۔۔۔ میں تو چھلکا سمیت کھاتی ہوں"۔۔۔

ارے! آپ کا سانس۔۔۔ کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔۔۔ آپ ہی نے کہا تھا۔۔۔ زندگی ایک میدان ہے جس میں آپ ہم بھاگتے رہتے ہیں۔۔۔ ساری دنیا بھاگتی رہتی ہے۔۔۔ یہ ٹرین، یہ موٹریں، یہ سیکلیں، یہ آدمی، سبھی بھاگتے رہتے ہیں"۔۔۔

"تم سب کیا کہہ رہی ہو؟۔۔۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکتا"۔۔۔

باقی صفحہ ۳۱ پر

نقد و نظر

تنقید اور تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

عکسِ خیال

شاعر: ارشد صدیقی، فن: منظوم ترجمہ، صفحات: ۶۴، سائز: ۱/۱۶ کراؤن، قیمت: دو روپے
ناشر: مکتبۂ دانش کدہ بھوپال۔

اردو زبان میں منظوم تراجم کا فقدان ہے، ایسے میں جناب ارشد صدیقی کا پندرہ انگریزی نظموں کا ترجمہ عکسِ خیال کے عنوان سے پیش کرنا مستحسن ہے۔ اس ترجمہ کے مطالعہ سے انگریزی ادب کے ممتاز شاعروں کی فکری و نظری بلندیوں کا پتہ چلتا ہے۔ مانوس بحروں سے کام تو لیا گیا ہے مگر ترجمے کی لفظی پابندی آورد کا موجب بن گئی ہے، البتہ کہیں کہیں بے ساختگی بھی ہے ؎

میرا دل فرطِ مسرت سے اچھل پڑتا ہے
آسماں پر نظر آتی ہے دھنک جب مجھ کو (دھنک)

اگر آزاد ترجمہ کیا جاتا تو کیا عجب تھا کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا؟ پھر بھی "سنہری پھول" "بسنت کا آخری پھول" "فطرتِ معصوم" "عالم" "بجنے پائے نہ کلیسا کا گجر آج کی رات" اور "ترانۂ زندگی" کامیاب ترجمے کہے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان میں کہیں کہیں جھول اور فنی نقائص بھی ہیں جو شاعر کے تساہل کا پتہ دیتے ہیں۔ چنانچہ "سنہری پھول" کے اس مصرع میں تعقید ہے ؎

پڑی نگاہ یکایک ہجومِ گل پہ مری

اگر شاعر چاہتا تو مصرع اس طرح بدل سکتا ؎

ہجومِ گل پہ یکایک مری نگاہ پڑی

اس تبدیلی کی وجہ سے مصرعہ کا دامن تعقید کے داغ سے پاک ہو گیا۔

یوں ہی وہ پھول بھی لاانتہا قطاروں میں
جیسے خلیج کے آغوش میں تھے بکھرے ہوئے
بہ یک نگاہ ہزاروں مجھے نظر آئے
کہ محوِ رقص تھے جو سرخوشی کے عالم میں
پھر ایسی صحبتِ دل آفریں میں اک شاعر
خوشی سے جھوم نہ اٹھتا تو اور کیا کرتا
اب اپنے صوفے پہ جب بھی دراز ہوتا ہوں
تفکرات کے لمحوں میں یا کہ مہلت میں

مندرجہ بالا شعروں میں "لاانتہا" ثقیل ترکیب ہے اور "دل آفریں" بے معنی۔ جب کہ کافِ بیانیہ "کہ" کے معنی "جو" اور "یا" کے ہیں تو ایسے میں "جو" اور "یا" کا استعمال محض حشو ہے اگر شاعر قدرے جگر کاوی سے کام لیتا تو معنوی حسن کے ساتھ صوری حسن بھی دوبالا ہو جاتا ؎

وہ پھول بھی یوں ہی بے انتہا قطاروں میں
جیسے خلیج کے آغوش میں تھے بکھرے ہوئے
بہ یک نگاہ ہزاروں مجھے نظر آئے
سرور و لطف کے عالم میں رقص کرتے ہوئے

پھر ایسی صحبتِ کیف آفریں میں اک شاعر
خوشی سے جھوم نہ اٹھتا تو اور کیا کرتا

اب اپنے صوفے پہ جب بھی دراز ہوتا ہوں	تفکرات کے لمحات میں کہ ~~مہلت~~ فرصت کے میں
	تفکرات کے لمحوں میں یا فراغت میں

غزلیں

مرتب: شاہد علی خاں، فن: نظم، صفحات: ۱۷۶، سائز: ۱/۱۶ کراؤن، قیمت: دو روپئے پچیس نئے پیسے، ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

اردو شاعری کی جان غزل ہے اس لیے جناب شاہ علی خاں نے "غزلیں" کے عنوان سے (ولی اورنگ آبادی سے لے کر شیر بھنجانوی تک) ایک سو اتالیس شاعروں کی غزلیں شایع کی ہیں، مشہور و ممتاز شاعروں کی دو دو، تین تین غزلیں منتخب کی گئی ہیں اور دوسروں کی ایک ایک غزل ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں دورِ حاضر کے بہت سے شاعر چھوٹ گئے ہیں اور بعض غیر معروف اور نومشق شاعروں کو بھی لیا گیا ہے۔

میخانہ

شاعر: کشن دت طوفاں، فن: نظم، صفحات: ۱۴۴، سائز: ۱/۱۶ کراؤن، قیمت: دو روپئے پچیس نئے پیسے، ناشر: مکتبۂ قصر اردو، اردو بازار، دہلی۔

جناب کشن دت طوفاں دہلوی نے اپنی نظموں، غزلوں اور قطعوں کا مجموعہ "میخانہ" کے نام سے شایع کیا ہے، کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے اور شاعر کے "حسنِ سلیقہ" کی مظہر ــــ ابتدا میں خود نوشتہ پیش لفظ درج ہے اور پھر شاعر کے استاد جناب انور صابری کا لکھا ہوا دیباچہ اور ساتھ ہی ساتھ جناب ہیرا لعل فلک کا دعائیہ قطعہ بھی ــــ

"میخانہ" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر نومشق ہے، اس کے کلام میں نہ تو فن کی عظمتیں ہیں اور نہ ہی خیال و فکر کی رفعتیں ــــ بلکہ باعتبار معنی و صورت سیدھے سادھے شعر ہیں، البتہ بعض شعروں میں شعری معائب اور فنی غلطیاں بھی ہیں، مثال کے طور پر یہ شعر پیش کیا جاتا ہے جس میں "آسمان" کی نون چمک رہی ہے ؎

غیر اس سرزمیں کو کیا پائیں؟	رشکِ صد آسمان ہے کشمیر

طوفاں کے مجموعہ کی پہلی نظم "میخانہ" بشکلِ قطعات ہے، جس میں کوئی تسلسل معنی نہیں اور ساتھ ہی ساتھ قوافی اور مضمون کی تکرار ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے، البتہ "جشنِ جمہوریت" میں خیال کا ربط و ضبط پایا جاتا ہے، اور غزلوں اور قطعوں کے کچھ شعر بشرطِ ریاضت کامیاب مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہیں ــــ

جو اشکوں نے لوٹا تو مارا ہنسی نے	تماشا بنایا ہے دل کی لگی نے
عشق میں دونوں پر بیتی ہے	اپنا کروں یا دل کا ماتم
میں وہ طائر ہوں، جسے ہے اعتمادِ بال و پر	جب کبھی اڑتا ہوں تو اڑتا چلا جاتا ہوں میں

محمد سعادت اللہ خاں (ایم اے)

جدید یسرنا القرآن"

مولفہ: غلام رسول صاحب، سائز: ۱/۱۶ کراؤن، صفحات: ۷۲، قیمت: ۳۷ نئے پیسے، ملنے کا پتہ: نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان حیدر آباد-۲

پیش نظر کتاب قرآنی قاعدہ ہے جو بچوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یہ قاعدہ قدیم یسرنا القران" کی طرز پر لکھا گیا ہے اور خوب ہے۔ کتابت، طباعت کی خوب صورتی اور صفائی ترتیب میں مزید حسن کا باعث ہے۔ اس قاعدے کو پڑھانے

کے متعلق ہدایتیں اور دیگر تفصیلات مرتب نے بڑی عمدگی کے ساتھ قلم بند کی ہیں۔ یہ قاعدہ چونتیس ۳۴ سبقوں پر مشتمل ہے اور ہر سبق کے شروع میں مختصر مفید نوٹس بھی لکھے گئے ہیں۔ آج جبکہ مدرسوں سے دینی تعلیم ختم ہو چکی ہے۔ مسلمان گھرانوں کے بچوں کے لیے اس قسم کے قاعدے مفید ہوں گے اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔

جغرافیہ (آندھرا پردیش) | مرتبہ: مرزا خورشید علی بیگ اور محمد عبدالقادر قریشی، سائیز: ۱/۱۶ کراؤن، صفحات ۲۲۴
قیمت: ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے، ناشر: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد۔

جغرافیہ آندھرا پردیش کے تاریخی پس منظر اور محلِ وقوع سے متعلق ایک دلچسپ اور معلوماتی درسی کتاب ہے جسے محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش نے مدارس کے لیے منظور کیا ہے۔ آندھرا پردیش کے وجود میں آنے کے بعد ہی سے ایک ایسی کتاب کی واقعی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ جسے فاضل ماہرین جغرافیہ نے پوری عمدگی، محنت اور صلاحیت سے مرتب کر کے بروقت شایع کیا ہے۔ جغرافیہ کے مضمون کی وسعت کے پیشِ نظر ریاست کے عام حالات معدنی ذخائر، موجودہ ترقیات اور آئندہ اسکیمیں، ہر ضلع کے متعلق تفصیلی اعداد و شمار اور خاکے اس میں پیش کیے گئے ہیں۔ جس کے سبب یہ کتاب طالب علموں اور استادوں کے علاوہ ہر عام و خاص کے لیے یکساں مفید ہے۔ ابتدا میں پروفیسر سید احمد صدر شعبۂ جغرافیہ عثمانیہ یونیورسٹی نے پیش لفظ لکھا ہے۔ جس میں اس کتاب کی افادیت پر عالمانہ روشنی ڈالی ہے اور مرتب کرنے والوں کو مبارک باد دی ہے۔

(وقار خلیل)

"آب و تاب" از: سعادت نظیر صاحب (ایم۔اے) | جامعہ عثمانیہ کے جن شاعروں کے کلام کے مجموعے شایع ہوئے ہیں، میرے علم میں وہ

چند ہی ہیں، مخدوم، میکش اور وجد، لیکن اب انھیں شاعروں کی صف میں ایک اور کا اضافہ ہوا ہے، اور وہ ہے جامعہ کا ہونہار اور جواں سال شاعر سعادت نظیر (ایم۔اے) اور اس کے مجموعے کا نام ہے "آب و تاب" جو نہ صرف ظاہری بلکہ معنوی "آب و تاب" کے ساتھ ۱۵ اگسٹ ۱۹۵۸ء کے مبارک دن شایع ہوا ہے۔ ویسے نظیر کا نام اردو کے معیاری جرائد اور رسائل پڑھنے والوں کے لیے قطعاً نیا نہیں، کیونکہ ان کی بیشتر نظمیں اور غزلیں ملک کے نامور رسائل میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔

نظیر کی شاعری کی عمر، جہاں تک میرا خیال ہے، بارہ پندرہ سال ہوگی، لیکن خیالات کی ندرت، فکر کی بلندی، تاثرات کے اچھوتے پن، الفاظ کی نشست، ذاتی تجربے، درد، تڑپ، اور زندگی سے بھرپور خلوص نے نظیر کی شاعری میں ہزار جادو جگا دیئے ہیں اور یہی وہ قدریں ہیں، جو اُسے ممتاز شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔

نظیر کے پاس عام نوجوان شعرا کی طرح نعرہ بازی نہیں، مصلحت نہیں، یا نظیر کی شاعری صحافتی اور ہنگامی شاعری نہیں بلکہ اسکی شاعری میں وہ گمبھیرتا بھی ہے جو فکر کی بلندی اور نظر کی وسعت سے حاصل ہوتی ہے، وہ پختگی اور کلاسکی رچاؤ بھی ہے جو مشقِ سخن اور اکتسابِ فن کا عطیہ ہوتی ہے۔

"آب و تاب" میں نظمیں بھی ہیں اور ان نظموں میں جہاں ایک قسم کا سلجھاؤ اور بناؤ ہے، فکر کی ہمالیائی بلندیاں اور نظر کی رعنائیاں ہیں، وہیں غزلوں میں نور و نکہت ہے، رنگینیاں ہیں ـــــ برنائیاں ہیں اور غزلوں کے وہ صحت مند اور زندگی دوست رجحانات بھی ہیں جو آج کل کے نوجوان شعرا کے پاس نہیں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن اس سے

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ نظیرؔ نے صرف نئے رجحانات ہی سے استفادہ کیا ہے بلکہ پرانی انسانیت ساز قدروں اور روایتوں سے بھی پوری پوری طرح اکتساب کیا ہے۔

نظیرؔ کے پاس اگر غمِ جاناں کا اضطراب ہے تو غمِ دوراں کی تڑپ بھی۔ ماضی کا غم ہے تو بہ نگاہِ حال مستقبل کے لیے خوش آئند خواب بھی ــــ نہ صرف خواب بلکہ ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جوان اُمنگیں، بلند حوصلے اور دلولے بھی ــــ "آب وتاب" کی نظم "ولولے" شاعر کے ان ہی عزائم کی آئینہ دار ہے۔

"آب وتاب" کی شاعری میں جو ایک بات خاص طور پر محسوس کی جاسکتی ہے، وہ یہ کہ نظیرؔ کی شاعری سیاسی دھڑے بندیوں سے بہت دور ہے، جس کسی موضوع پر ہمیں نظمیں ملیں گی، وہ صرف انسانی نقطۂ نظر سے چاہے وہ "سرمایہ داری" کا عنوان ہو یا "اندھیرے سے اجالے تک" یا چاہے "جنگ آزادی کے شہید ولی اللہ کے نام نذرِ عقیدت" اور یہ ایسی خصوصیت ہے، جو ہماری نئی پود کے شاعروں میں شاذ ہی نظر آتی ہے اور اگر اسے نظیرؔ کی انفرادیت سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

نظیرؔ کے پاس اگر فن کی بلندی ہے تو افکار کا حسن بھی۔ خود نظیرؔ کے الفاظ میں ؎

وہ شعر کہہ! جو دل میں اُتر جائے، اے نظیرؔ ! ــ جس میں نکاتِ فکر بھی ہوں حسنِ فن کے ساتھ

"آب وتاب" کے مطالعے کے بعد یقیناً ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اس کی بعض نظمیں اور غزلیں "اردو ادب" میں ایک قابلِ قدر اضافہ ضرور ہیں۔ چند نظموں کے شعر درج ذیل ہیں:

تم نے قطرے قطرے کو ہم شکلِ دریا کر دیا ــ ذرّے ذرّے کو ہم آغوشِ ثریا کر دیا

یعنی ذوقِ ارتقا ہر دل میں پیدا کر دیا

• شامِ غم کو صبحِ خنداں کا ستارہ مل گیا ــ جاں بلب دنیا کو جینے کا سہارا مل گیا (نذرِ عقیدت)

سخن وروں نے بہاروں کی زندگی پائی ــ ہنروروں نے ستاروں کی روشنی پائی

کمال وفن کے گلوں نے شگفتگی پائی

ترے زمانے میں رنگِ ہنر نکھر کے رہا ــ تمام گلشنِ فکر و نظر سنور کے رہا

(محمد قلی قطب شاہ)

نقشِ نو دکھلائے تیری شوخیٔ تحریر نے ــ آگ سینوں میں لگا دی گرمیٔ تقریر نے

تیرا ہر اک کارنامہ نقشِ دائم ہو گیا ــ رفعتِ کردار کا معیار قائم ہو گیا (مولانا ابوالکلام آزاد)

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں نغمے لکھوں ــ غمِ دوراں جو بھلا دیں، وہ ترانے لکھوں (آرزو)

آزادیٔ جمہور کا یوں چمکے گا تارا ــ جیسے کسی رنگین تبسم کا شرارا

جب رات ہوئی ہے تو سحر ہو کے رہے گی (سرمایہ داری)

"آب وتاب" جیسا کہ میں شروع ہی میں لکھ چکا ہوں، اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں سے بھرپور ہے، سرِورق یم۔ اے غفار کے فن کا اچھوتا نمونہ ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ سب ہی نفیس اور معیاری ہیں۔ غزلوں کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے!

چلا ہے لے کے مجھ کو ذوقِ سجدہ ــ کشش دیکھی کسی کے آستاں کی

تڑپ اٹھا ہے غم نا آشنا بھی — کچھ اِس انداز سے میں نے فغاں کی
زمیں والوں کی عظمت! اللہ! اللہ! — کمر خم ہو گئی ہے آسماں کی

رہائی ہے یارب! یہ کیسی رہائی! — قفس سے چلے آشیاں تک نہ پہنچے
کئی منزلوں سے گذر بھی گئے ہم — مگر اک ترے آستاں تک نہ پہنچے

مزہ تو جب ہے کہ کچھ سوز بھی ہو ساز کے ساتھ — وہ زندگی ہی نہیں جس میں آہ واہ نہیں

تری نظروں نے وہاں زخم دل دیئے کچھ اور — تری نظر سے جہاں آرزوئے مرہم تھی

تری جفائے مسلسل میں فرق کیوں آیا؟ — مری وفاؤں میں اے دوست! کچھ کمی تو نہیں

جو ٹوٹ جائے مرا جام بھی تو کیا غم ہے — تمہاری ایک نگاہ اور ہزار پیمانے!

پھول، پتیاں، کلیاں سب کی سب پریشاں ہیں — یہ بہار کی رت ہے یا خزاں؟ نہیں معلوم!

تمہیں انصاف سے کہدو تمہاری انجمن سے ہم — جو اٹھ جاتے تو اُٹھ کر ٹھوکریں کھانے کہاں جاتے؟

کل یہی صورتِ گل رونقِ گلشن ہوں گے — آج جن لوگوں کی کانٹوں پہ بسر ہوتی ہے

(سلیمان اطہر)

تلامذۂ غالب - از: مالک رام | ناشر: مرکز تصنیف و تالیف نکودر، پنجاب - صفحات: ۴۳۱ - دیسی سائیز - مجلد، قیمت ۱۲ روپے کاغذ، کتابت، طباعت وغیرہ نہایت پاکیزہ اور ٹائٹیل غالب اور ان کے تلامذہ کی تصاویر سے مزین۔

یہ تازہ تصنیف ذکرِ غالب کے بعد مالک رام کی دوسری کوشش ہے۔ ذکرِ غالب غالبیات میں ایک اہم اضافہ تھا۔ اور جناب مالک رام صاحب نے غالبیات میں جو نمایاں مقام حاصل کیا ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں غالب کے ۱۴۴ تلامذہ کے حالات اور ان کا نمونہ کلام درج ہے ان میں چند ایسے بھی ہیں جو پہلی دفعہ منظرِ عام پر آرہے ہیں۔ بعض تلامذہ کے حالات خود ان کے اخلاف نے مرتب کو فراہم کر دیئے ہیں جس سے کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ضمنی طور پر جن لوگوں کا ذکر آگیا ہے۔ ان کے حالات حاشیہ پر دے دیئے گئے ہیں۔ ان کی تعداد ۲۹ ہے۔ بہت سی نئی تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔ اس کتاب کی تیاری میں جن سوا سو کتابوں اور ۲۵ رسائل سے مدد لی گئی ہے۔ آخر میں ان کی فہرست موجود ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ مرتب نے کتنی محنت اور زحمت اٹھائی ہے۔ غالب اور غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور کتب خانوں کے لیے گراں بہا تحفہ۔

ساغرِ و مینا - سلام سندیلوی (ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی) | $\frac{1}{16}$ کراؤن سائیز، صفحات ۱۲۰، مجلد گرد پوش، قیمت: ۲ روپے

سلام سندیلوی صاحب کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ سرور صاحب نے پیش لفظ لکھا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے مقدمہ۔ اس کے بعد تقریظ اور پھر تعارف ہے۔ آخر میں سلام صاحب نے اپنا کلام جاری فرمایا ہے۔

سلام کی زندگی کے حالات کا مطالعہ ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے ضروری بھی ہے۔ کلام میں جو درد و غم اور گراختگی نظر آتی ہے وہ ان کی زندگی کا عکس ہے۔ وہ جن مختلف موقعوں پر متاثر ہوتے ہیں انھیں اثرات کو زیبِ قلم کرتے ہیں۔ اور یہ

اثرات قاری کے دل میں بھی کسک پیدا کر دیتے ہیں۔ سلام صاحب نے جہاں غم کی ترجمانی کی ہے، وہیں منظر نگاری اور معاملات کو بھی پیش کیا ہے۔ بہت دن ہوئے جب "ہندوستانی ادب" میں میں نے ان کی نظم "پاگل کوے" پڑھی تھی۔ ایک خاص کیفیت اور رقت پیدا ہو گئی تھی۔ اب دوبارہ "ساغر و مینا" میں اس نظم کو پڑھنے کا موقع ملا اور رنج و غم کی وہی کیفیات پیدا ہو گئیں۔ "اے عمر ذرا آہستہ چل"، "اس بستی کے رہنے والے"، "محرومیاں" اور "آنکھ مچولی" پاکیزہ اور نفیس نظمیں ہیں۔ جہاں وہ افسردگی کا اظہار کرتے ہیں قاری کے بربط دل کے تار بھی جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ غزلوں سے دو چار شعر سنیئے ؎

نہیں تکمیل سوز عشق ان دو چار آہوں پر — بھڑکتی بعد میں ہے آگ اٹھتا ہے دھواں پہلے
سیہ زلف میں وہ دمکتی سی افشاں — میں تاروں بھری رات سے کھیلتا ہوں
کر قلت گناہ پہ رحمت نہ اعتراض — پہلے یہ کر شمار کہ کب تک جواں رہے
کیوں پھینکتے ہو جسم جو بے روح ہو گیا — خالی ہوا ہے جام تو پھر سے بھرے کوئی
کرنوں سے اور دل کی چوٹیں ابھر رہی ہیں — کلیاں چٹک رہی ہیں پر کیف چاندنی میں

چاند تارے

مرتبہ: وفا راشدی، بزم ریاض الادب کوٹری حیدرآباد (سندھ)

یہ کتاب کوٹری کے دور افتادہ علاقے کے ارکان بزم ریاض الادب کی ادبی کوششوں کا مجموعہ ہے اس میں کامل صدیقی کی غزلیں اور نظمیں وفا راشدی کے تنقیدی مضامین افضل سرور ٹی کے افسانے، جلیل احمد کے افسانوی ترجمے اور رشاد کا مزاحیہ کلام شامل ہے۔ ریگستانی علاقہ میں رہنے والوں نے اپنے لیے ایک ادبی گلزار کی تخلیق کی ہے اور اردو کی خدمت کر رہے ہیں ان کا یہ کام لائق صد ستائش ہے۔

محشر خیال

سجاد انصاری، ناشر: آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی، مرتبہ: پروفیسر خواجہ منظور حسین، مجلد مع خوب صورت گرد پوش، قیمت: ۳۰=۳

یہ کتاب جواں مرگ سجاد مرحوم کے مقالات، ڈراموں اور کلام کا مجموعہ ہے، جو آزاد کتاب گھر نے تیسری دفعہ شایع کیا ہے۔ مرحوم اپنے نئے انداز فکر اور جدت اسلوب کی بنا پر ادب میں کافی بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔ تیسرا ایڈیشن ناشر نے نہایت سلیقہ اور طباعت کی خوبیوں سے آراستہ کر کے شایع کیا ہے۔ (محمد اکبر الدین صدیقی)

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ۱۲۰۴ء تا ۱۸۵۷ء

از: اختر اورینوی ایم۔ اے، صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی، سائیز۔۔۔۔ کاغذ۔۔۔۔۔۔

مطبوعہ لیبل لیتھو پریس۔ رمنہ روڈ۔ پٹنہ۔ ۴

یہ مقالہ ڈاکٹر آف لٹریچر (شعبۂ اردو) کی ڈگری کے لیے پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ سے منظور کیا گیا۔ اس مقالہ میں سب سے پہلے (۸۰) صفحات پر مشتمل ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں "فلسفۂ زبان و اقوام"، "اردو زبان کے آغاز کا پس منظر" اور "اردو زبان کا ارتقا" خاتمہ پر اس موضوع کی مستند کتابوں کے حوالوں سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس مقدمہ کے خاتمہ پہ ایک سوال کہ "ہماری اردو زبان کی اصل قماش اور اس کا انفرادی سانچہ نئے ہند آریائی دور کی کس بھاشا سے زیادہ قریب ہے" ؟ کے جواب میں کہتے ہیں کہ "میری رائے میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی کھڑی بولی معیاری اردو کا خاص تنا ہے۔ مگر کھڑی بولی کی اصل کا دو ٹوک تعین بہت مشکل اور مشتبہ ہے۔" دوسرے سوال کہ "قدیم ترین ریختہ کس بھاشا سے بنی ؟" کے جواب میں فرماتے ہیں "اس

"اب تک کی تحقیقات کے لحاظ سے اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا اور غالباً جواب ملنا ممکن بھی نہیں" لیکن خاتمہ کلام پر دوٹوک بات کہتے ہیں کہ "علاقائی خصوصیات کے ساتھ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قدیم اردو کے قدیم ترین نمونے جو اب تک ملے ہیں ان کے بیشتر حصہ کو "پنجابی، ہریانی ہندوستانی" آمیختہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ ہندوستانی (کھڑی) ریختہ سب پر غالب آیا۔" ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ "اس موضوع پر ہنوز بہت سا تحقیقاتی کام باقی ہے۔ قطعیت تک کوئی بھی نہیں پہنچا۔"

مقالہ کے باب اوّل میں 'بہار میں اردو زبان' کے مختلف ادوار دکھائے گئے ہیں۔ باب دوم میں "بہار میں اردو ادب" کے تحت بہار میں اردو شاعری' 'بہار کے تذکرہ نگار شعرا' اور 'بہار میں اردو نثر نگاری' پر تحقیقاتی مباحث کے بعد بہاری شعرا' تذکرہ نگار اور نثر نگاروں کا ایک وسیع تذکرہ دیا گیا ہے جو تاریخی، ادبی اور لسانیاتی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے' سب سے آخر میں 'بہار میں اردو ادب کے عام میلانات' بھی ایک اچھا تجزیہ ہے۔

ہماری زبان میں مقالہ زیر نقد ایک اچھی علمی، ادبی اور لسانی تحقیقات ہے جو ڈاکٹریٹ کی اردو ڈگری کا معیار رکھتی ہے۔ یوں تو اس مقالہ کے عنوان ہی سے صوبہ واریت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور نصیرالدین ہاشمی کی 'دکن میں اردو' محمود شیرانی کی 'پنجاب میں اردو'...... کے سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے لیکن خود اختر صاحب کا قول ہے کہ

"جب دکن، دہلی اور لکھنؤ میں نوبت بہ نوبت اردو کا طوطی بولا تو عظیم آباد میں بھی اس کے ہم صفیر موجود تھے۔ عین ممکن ہے کہ دکن کے دور اولی کے متوازی بھی ادب قدیم کے نمونے بہار میں مل جائیں، لیکن اب تک تو دکن کا قدیم ادبی سرمایہ سب پر بھاری ہے...... کیونکہ خاص تاریخی، تہذیبی و سیاسی وجوہ کی بنا پر وہاں 'ریختہ' کا باغ سب سے پہلے لہلہایا۔ یکا دُکا پیڑ پودے تو سارے برصغیر ہند میں سرسبز ہوئے۔ بہرکیف تحقیقات اور انکشافات کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ علم اور تحقیق کی دنیا میں صوبائی عصبیت قطعیت اور کٹرپن کی کوئی جگہ نہیں"

(سید رشید الحسن (ایم۔ اے) لکچرار انوار العلوم کالج)

ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

جلد ۲۱ شمارہ ۱۱، ۱۲ — نومبر و ڈسمبر ۱۹۵۸ء

نگران

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

جانکی پرشاد

چندہ سالانہ چھ روپے سکہ ہند
ششماہی تین " "

قیمت: پچاس پیسے

مہتم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

فہرست

حصہ نظم

غزل — نظیر حیدر آبادی، سید علی حیدر نیر — ۳
غزل — نکہت بریلوی، مہیش چندر نقش — ۴
غزل — علی جواد زیدی، حیدر علی کرمڑی — ۵
غزل — اصغر کاشی پوری، ماجد ادیب بریلوی — ۶
غزل — حباب ترمذی، سیدہ مجیدہ — ۷
رباعیات — اختر رضوانی — ۸

حصہ نثر

مقالے:-

رباعیات اکبر — از ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب — ۱۷
غالب کا قیام آگرہ — " پروفیسر خواجہ محمد حامد صاحب — ۹

افسانہ:-

آگ — جناب رحمٰن ساجد صاحب — ۳۳

تنقید و تبصرہ

کلام بے نظیر، جواہر لال نہرو کی تقریریں، یاترا، لینن، سویت نظام کی جھلکیاں، پنڈت نہرو سے بات چیت، اردو ڈرامہ اور اسٹیج — از وقار خلیل صاحب و سعادت نظیر صاحب — ۳۷

نظر حیدرآبادی

یہ بزمِ شعر ہے یہ ہے دیارِ سوز و گداز
نگاہ روبرو! اے مطربانِ خوش آواز

نہ گردنوں میں وہ خم ہے نہ وہ سلامِ نیاز
بدل گئے ہیں نگارانِ شہر کے انداز

اڑا چکے ہیں بہت ہم بھی اے بتِ طنّاز
سلونے سانولے مکھڑوں کا رنگِ نو آغاز

چراغِ بزم! خبر ہے ہمارے پہلو میں
رہے ہیں جلوہ فگن کتنے مہرِ ذرّہ نواز

بریدہ زلف میں خم ہی کہاں کہ دل کو رہیں
شبانِ روز وہ "اندیشہ ہائے دور دراز"

خیالِ دوست سلامت! سفر تمام ہوا
ہماری راہ گذر میں نہ تھے نشیب و فراز

نظر جمالِ اجنتا یہ ختم ہے شاید
ادائے چشمِ محبت، فسونِ زلفِ دراز

سید علی حیدر تیر

ہیں دل فسردہ کہ سینے ناتوں میں کوئی رنگ اثر نہیں ہے
وہ دل ہی دل میں ہیں خوش کہ اب تک مری فغاں کارگر نہیں ہے

پکار کر کہہ رہا ہے اب تک دیارِ سینا کا ذرہ ذرہ
وہ کیوں طلبگارِ حسنِ جلوہ ہو جس کو تابِ نظر نہیں ہے

فقیہہ بھی ہیں، امام بھی ہیں، حکیم بھی، فیلسوف بھی ہیں
ہیں اگرچہ صاحبِ خبر ہزاروں پر ایک صاحبِ نظر نہیں ہے

عبث ہے نالہ، عبث ہی شیون، عبث تری آہِ صبح گاہی
ہے دل ترا سوزِ غم سے خالی، اگر تری چشم تر نہیں ہے

تمہیں خبر کیا کسی کے دل کی، کسی پہ کیسی گذر رہی ہے
بہے کچھ اس طرح بن کے آنسو، نشانِ قلب و جگر نہیں ہے

کھلے ہیں اوراقِ زندگی کے، ہیں رازِ ہستی سب آشکارا
جو کور بیں ہیں وہ کیسے جانیں کہ ان کو ذوقِ نظر نہیں ہے

بلا سے ہم خوار ہیں، زبوں ہیں، ملا ٹھکانہ تو ان کے در پر
رہینِ منت ہیں ان کے تیر کہ دل مرا در بدر نہیں ہے

نکہت بریلوی

وفورِ تیرگیِ شب سے یوں نہ گھبراؤ
اٹھو چراغ کی لو کو کچھ اور اکساؤ

افق کی دھند میں ڈھونڈو نہ منزلِ مقصود
زمیں پہ چاند ستاروں کو توڑ کر لاؤ

غمِ حیات کے تیور نہیں بدل پائے
ابھی کچھ اور فضاؤں میں تازگی لاؤ

ابھی تو گرد میں کارواں بھی اوجھل ہے
مرے عظیم ارادو ابھی بڑھے جاؤ

نہ بھول پاؤ گے تم بھی مری سیاہ کاری
مجھے بھی یاد رہے گا تمہارا برتاؤ

کہیں غروب نہ ہو جائے صبح کا تارا
مرا یقین بھٹکنے لگا ہے آ جاؤ

خدا صفت تو بہت سے ملیں گے اے نکہت
بقدرِ آدمیت آدمی ہی بن جاؤ

مہیش چندر نقش

دھوم گلشن میں مچی جب سے بہار آنے کی
وحشتیں اور بڑھیں آپ کے دیوانے کی

اف یہ ہنگامۂ زنداں ہے کہ شورِ محشر
ساقیا! خیر چھلکتے ہوئے پیمانے کی

ذکر کاکل کے سوا اور بھلا کیا ہوگی
کوئی تدبیر دلِ زار کے بہلانے کی

دوست ہم بادہ پرستوں کے سبب زندہ ہیں
عظمتیں آج بھی اجڑے ہوئے میخانے کی

آگ سینے میں تو رہ رہ کے بھڑک اٹھتی ہے
یہی تمہید نہ ہو عشق کے افسانے کی

شورِ آلام سے اے دل تو ہراساں کیوں ہے
ان ہواؤں کو تو عادت ہے گزر جانے کی

لوگ کہتے ہیں جنھیں آج گلستاں اے نقش
یہ بھی اک بدلی ہوئی شکل ہے ویرانے کی

علی جواد زیدی

کم ظرف، احتیاط کی منزل سے آئے ہیں
ہم زندگی کے جادۂ مشکل سے آئے ہیں

طوفاں سنا رہا ہے انھیں نغمۂ شباب
جو اشتیاقِ موج میں ساحل سے آئے ہیں

دل اک اداس صبح، نظر اک اداس شام
کیسے کہیں کہ دوست کی محفل سے آئے ہیں

دل کا لہو نگاہ سے ٹپکا ہے بارہا
ہم راہِ غم میں ایسی بھی منزل سے آئے ہیں

خود ہم کو اپنے زخمِ جبیں کا پتہ نہیں
کہتے ہیں لوگ، کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

آنکھوں کا سوز، دل کی کسک تو نہیں ملی
مانا کہ آپ بھی اسی محفل سے آئے ہیں

یہ وجہِ ضبطِ شوق کہ دل جل بجھا مگر
شکوے زباں پہ آج بھی مشکل سے آئے ہیں

کچھ مضمحل ہیں جادۂ و زنداں و دار بھی
سب تنگ میرے حوصلۂ دل سے آئے ہیں

چھیڑے جو نوکِ خار نے چھالے، گماں ہوا
تازہ پیام پردۂ محمل سے آئے ہیں

حیدر علی کرمانی

مجھ پہ بارِ حیات بھاری ہے
کیا یہی تیری دوست داری ہے

روشنی کے نقیب کچھ تو بتا
کیوں یہ اندھیر پھر بھی طاری ہے

کیوں ستارے بجھے بجھے سے ہیں
کیوں پریشان رات ساری ہے

کیوں یہ زمیں ہوئی ہے تنگ
کوئی لوری ہے کوئی ناری ہے

مئے و مینا کی بات رہنے دو
میکدے میں اندھیر تاری ہے

ہم اسیروں کو آشیاں ہو کہ قید
بے قراری ہی بے قراری ہے

جانے کس کی تلاش ہے دل کو
جانے منزل کہاں ہماری ہے

آگے آگے ترے تری منزل
تیرے عزم و عمل کی خواری ہے

جن کے دم سے ہیں میکدے قائم
ان کی مستی بھی ہوشیاری ہے

احقر کاشی پوری

محبت اس قدر شائستہ آلام ہو جائے
کہ ہر لمحہ برائے زندگی دشنام ہو جائے

تعطر ہی نہیں انفاس میں شعلے بھی ہیں ہمدم
اشارا کر کہ تدفین رواج خام ہو جائے

ٹھہر اے کیف و مستی کے ترانے چھیڑنے والے
زمانہ اور کچھ شائستہ آلام ہو جائے

نظام میکدہ تبدیل ہو سکتا ہے میخوارو
اگر بھرپور اک شغل شکست جام ہو جائے

یقیں جب زندگی پر رائگاں ہونے کا ہی تک
معاشی الجھنیں مٹ جائیں تو انعام ہو جائے

شکست عشق کیا؟ تصویر ہی اک ایسے راہی کی
جسے نزدیک منزل آتے آتے شام ہو جائے

مجھے اندوہ و غم پر مسکرانے کا سلیقہ ہے
مخالف جتنا چاہے گردش ایام ہو جائے

مذاق عاشقی سے زندگی تک آ گئی دنیا
بس اب تو ختم ہی ذکر سبو و جام ہو جائے

شیاطین جہاں اس آس پر زندہ ہیں اے احقر
کہ صبح حریت محکومیت کی شام ہو جائے

ماجد ادیب بریلوی

دل کو تری یادوں سے ارم ہم نے بنایا
بت خانۂ عالم کو حرم ہم نے بنایا

آرائش گیتی ہی پہ موقوف نہیں ہے
تجھ کو بھی حسیں تیری قسم ہم نے بنایا

ہر منزل ہستی میں چراغاں کیا ہم نے
ہر گام پہ اک نقش قدم ہم نے بنایا

شاہد ہیں ترے حسن فرزاں کی بہاریں
دنیا کو گلستان ارم ہم نے بنایا

ہر دل میں محبت کے دیئے ہم نے جلائے
انسان کو شائستہ غم ہم نے بنایا

غیروں کی طرح وہ بھی ہمیں بھول گئے ہیں
اپنا جنھیں دنیا کی قسم ہم نے بنایا

اے گریۂ شبنم ترے افسانے سنا کر
ہر پھول کو بادیدہ نم ہم نے بنایا

وہ دل جو گرفتار غم عشق بتاں تھا
اس دل کو بھی پابند حرم ہم نے بنایا

افسانۂ ہستی ہے ادیب آج بھی رنگیں
جاں دے کے بھی معیار قلم ہم نے بنایا

حجاب ترمذی

دل گرفتہ نگہ یار ہوئی جاتی ہے
زندگی اور بھی دشوار ہوئی جاتی ہے

اب بھی آغاز جوانی کا نہیں جوش ابھی
موج مے مستی رفتار ہوئی جاتی ہے

اپنے جلووں کے مدد اور بڑھا دے کوئی
مطمئن حسرت دیدار ہوئی جاتی ہے

اللہ اللہ تری مست نگاہی کا اثر
زندگی بے پئے سرشار ہوئی جاتی ہے

تو نہیں ساتھ تو اے جان چمن روح چمن
نکہت گل، خلش خار ہوئی جاتی ہے

وہ نگہ دل میں جو چبھتی تھی خلش بن بن کر
وجہ تسکین دل زار ہوئی جاتی ہے

لب نازک پہ ہے ایک موج تبسم رقصاں
دور تک بارش انوار ہوئی جاتی ہے

جتنا جتنا کوئی کھنچتا ہے مری جانب سے
زندگی اور مزیدار ہوئی جاتی ہے

اے غم عشق کوئی بات تو ہے اس میں ضرور
یاد محبوب بھی بے راز ہوئی جاتی ہے

مرحبا جذبۂ بیباک و خود شناس کار جنوں
ہمتسم نگہ یار ہوئی جاتی ہے

دیکھنا حسن گریزاں کی مسیحا نفسی
زندگی مستقل آزار ہوئی جاتی ہے

کیا غضب ہے کہ الٹتے ہیں جو وہ رخ سے نقاب
نگہ شوق خطا کار ہوئی جاتی ہے

جب سے ہیں عقل و خرد مائل شرح و تفصیل
آگہی، فتنہ بیدار ہوئی جاتی ہے

ہر نفس دام رہ شوق بنا جاتا ہے
جو نظر ہے وہ گرفتار ہوئی جاتی ہے

نخوت حسن کو دنیا ہے برابر کا جواب
فطرت عشق طرحدار ہوئی جاتی ہے

دیکھ اے ساقی رعنا مجھے اتنی نہ پلا
بیخودی محرم اسرار ہوئی جاتی ہے

تمام عمر عالم احساس جدائی توبہ!
سانس چلتی ہوئی تلوار ہوئی جاتی ہے

عرصۂ عشق میں اب دہ مری ہستی ہے حجاب
خاک ساحل جیسے منجدھار ہوئی جاتی ہے

سیدہ مجیدہ

دماغ وقف غم طوق و دار ہے اب بھی
رخ حیات پہ گرد و غبار ہے اب بھی

وفور رنج سے دامن فگار ہے اب بھی
ہر ایک سمت سے غم کا حصار ہے اب بھی

خیال منزل مقصود تک پہنچ ہی گیا
مگر حیات سر راہگذار ہے اب بھی

زبان لالہ و گل برگی ہوئی ہے مگر
ہوائے صحن و چمن سوگوار ہے اب بھی

خزاں میں جل چکا سو بار گلستاں لیکن
گلوں کی خاک میں لپٹے بہار ہے اب بھی

مری نوائے صداقت پہ لاکھ تیر چلے
مگر زبان صداقت شعار ہے اب بھی

لگے ہوئے ہیں ہر اک سمت رات کے پہرے
مگر سحر کا مجھے انتظار ہے اب بھی

رباعیات

○

ہر آن میں طوفاں سے لپٹ جاتے ہیں
اکثر غمِ دوراں سے لپٹ جاتے ہیں
یاد آتی ہے تنہائی میں جب صبحِ وطن
ہم شامِ غریباں سے لپٹ جاتے ہیں

○

آنکھوں میں مئے شوق گھٹا شانوں پر
یہ جلوۂ صد ہوشربا شانوں پر
رہ جائے نہ کچھ تشنہ لبی کا شکوہ
بکھرائیے گا زلف دوتا شانوں پر

○

چلتے ہیں تو ہیرے کی کنی رلتی ہے
پلکوں کے ترازو میں حیا تلتی ہے
وہ جب کبھی ہوتے ہیں تبسم فرما
غنچوں کی طرح دل کی گرہ کھلتی ہے

○

احباب کو ملتا ہے بہانہ کیا کیا
کرتے ہیں مرتب یہ فسانہ کیا کیا
الزام تراشی کے علاوہ دیکھیں
گل اور کھلاتا ہے زمانہ کیا کیا

○

فاقوں پہ گزارہ ہے ہمارا کیا ہے
کیا خوب سہارا ہے ہمارا کیا ہے
تم وقت کے حاکم ہو تہی دست ہیں ہم
جو کچھ ہے تمہارا ہے ہمارا کیا ہے

اختر رضوانی

غالب کا قیام آگرہ اور سن ولادت

از: پروفیسر خواجہ محمد حامد مہا ودیالیہ ناگپور

غالب کے سوانح حیات کی چھان بین کرنے والے تمام محققین متفق ہیں کہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کسی زمانے میں وہ مستقلاً آگرہ چھوڑ کر دلی چلے گئے ہیں۔[1] اس سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا مقالہ "غالب کا قیام آگرہ اور تذکرہ سرور"[2] بہت قابل قدر ہے۔ فاضل محقق نے غالب کے خطوط اور نواب اعظم الدولہ کے معاصرانہ تذکرے سے ان کی نقل سکونت کے زمانے کا تعین کرنا چاہا ہے۔ اس ضمن میں چند باتیں محل نظر ہیں۔

فی زمانہ تصور زماں کا انحصار عیسوی سنین پر ہے۔ جب زمانے کی کسی مدت کا حساب کرنا ہوتا ہے تو دو عیسوی سن لیے جاتے ہیں اور ان کے حاصل تفریق سے مطلوبہ مدت معلوم کی جاتی ہے۔ لیکن غالب کے عہد میں یہ بات نہ تھی۔ ان کے عصر میں مسلمان خالص اسلامی معاشرت کے پابند تھے۔ زمانے کا حساب کرتے وقت عادتاً ان کے ذہن میں ہجری سنین ہی ابھرتے تھے اور ہجری سنین ہی سے وہ تعین زماں کے عادی تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں لوگ ضرورتاً عیسوی سن استعمال کرنے لگے تھے مگر اس کے استعمال میں انھیں اتنا ہی تکلف ہوتا تھا جتنا کہ آج ہمیں ہجری سن کے استعمال کرنے میں ہوتا ہے۔ غالب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ جب کبھی وہ اپنی عمر بیان کرتے تھے تو اس کا حساب ہجری سالوں کے مطابق ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ غالب کی مصنفات میں اس کی متعدد مثالیں ہیں۔ ایک ملاحظہ ہو۔ نواب انوار الدولہ شفق کو ایک مکتوب مرقومہ سہ شنبہ ۲۲ اکتوبر (۱۸۶۱ء) میں لکھتے ہیں۔

"...... میرا ہم قوم تو سراسر قلم رو ہند میں نہیں، سمرقند میں دو چار یا دشت خفچاق میں سو دو سو ہوں گے مگر ہاں اقربائے سببی پانچ برس کی عمر سے اون کے دام میں اسیر ہوں، اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں۔

گرد ہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد"[3]

اگر اکسٹھ اور پانچ چھیاسٹھ ۱۸۶۱ء میں سے وضع کیے جائیں تو غالب کا سن ولادت ۱۷۹۵ء نکلے گا۔ لیکن سن ہجری کے مطابق حساب کیا جائے تو ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء مطابق ہے ۱۳ ربیع الآخر ۱۲۷۸ھ کے۔ لہذا سن ولادت ۱۲۱۲ ہجری برآمد ہوتا ہے جو مشہور و معروف ہے۔

اپنے مقالے میں جناب فاروقی صاحب نے غالب کے چار خطوط کا حوالہ حسب ذیل دیا ہے:-

(۱)- "مرزا غالب نے نواب علاؤ الدین خاں کے نام خط میں جو ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا ہے اپنا دلی کا قیام اکیاون

ص۱ آثار غالب طبع چہارم صفحہ ۳۵

ص۲ مطبوعہ آج کل دہلی، فروری ۱۹۵۶ء

ص۳ خطوط غالب از مہیش پرشاد صفحہ ۱۴۸

برس سے بتایا ہے" پھر اصل خط کا حصہ تحریر کرنے کے بعد نتیجہ نکالا ہے کہ "اس خط کی رو سے غالب کے ورود دہلی کا سن ۱۸۱۱ء ہونا چاہئے۔

اگر اب سنین ہجری کے اعتبار سے حساب لگایا جائے تو ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء مطابق ہے ۱۶ شعبان ۱۲۷۸ھ سے۔ اس طرح غالب کے ورود دہلی کا سن ۱۲۲۷ ہجری مطابق ۱۸۱۲ء ہوا۔

(۲)۔ "نواب کلب علی خاں کو یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں..... کہ باون ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں... اس حساب سے غالب نے دہلی کا مستقل قیام ۱۸۱۲-۱۳ء میں اختیار کیا۔"

یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کو ۲۲ ربیع الآخر ۱۲۸۳ھ تھی۔ ۵۲-۵۳ گھٹانے پر ۱۲۳۰-۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵-۱۶ء ہوئی۔

(۳)۔ اس خط میں فاروقی صاحب ۱۸۳۵ء سے ۲۰ گھٹا کر ۱۸۱۵ء نکالتے ہیں۔ جبکہ متذکرہ بالا اصول کے مطابق صحیح سن ۱۸۱۶ء ہوگا۔ لیکن یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ "مرزا غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس آئے ہیں۔ اپنے سفر کی کیفیت اور مالی پریشانیوں کا حال بیان کرتے ہوئے میر اعظم علی مدرس مدرسہ اکبرآباد کو لکھتے ہیں ـــ اکنوں ششمیں سال است کہ خانماں بباد دادہ و دل بہ مرگ ناگاہ نہادہ بہ کنجے نشستہ ام ـــ اس طرح یہ خط ۱۸۳۵ء کا مکتوبہ ہونا چاہیے۔"

غالب کے اس مکتوب کا پورا متعلقہ حصہ یوں ہے "....... درازی زماں فراق کہ بہ گمان مخدوم تا نزدہ سال است و بہ برداشت نامہ نگار کم از بست سال نیست....... چوں گورنر جنرل آہنگ ہندوستاں کرد چنانچہ پیش ازیں بہ دہلی رسیدم روزگار برگشت و کار ساختہ شدہ صورت تباہی گرفت اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں بباد دادہ و دل بمرگ ناگاہ نہادہ بکنجے نشستہ ام......."[1] فاروقی صاحب نے "ششمیں سال" کو "بہ دہلی رسیدم" سے متعلق کرکے اس مکتوب کی تاریخ ۱۸۳۵ء متعین کی ہے لیکن بدیہی ہے کہ "ششمیں سال" کا رشتہ "روزگار برگشت و کار ساختہ شدہ صورت تباہی گرفت" سے ہے جس سے مراد ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء ہونی چاہیے۔ جب لارڈ ولیم بینٹنگ نے مرزا کے خلاف فیصلہ دیا۔[2] تقویم سے ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء ۱۳ شعبان ۱۲۴۶ھ کے مطابق ہے۔ اس لیے تاریخ مکتوب ۱۲۵۲ھ ہوئی اس سے کم از کم بیس سال قبل غالب نے آگرہ چھوڑا تو نقل سکونت ۱۲۳۲ھ کے لگ بھگ ہوئی یعنی ۱۸۱۷ء میں یا اس کے قبل۔

(۴)۔ لیکن اس سلسلہ میں غالباً سب سے زیادہ اہم وہ خط ہے جو غالب نے منشی شیو نارائن کے نام ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو لکھا ہے ـــ "میں اور وہ ہم عمر تھے شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی ـــ"

یہاں صاحب مضمون نے غالب کی تاریخ ولادت میں ۱۹، ۲۰ جوڑ کر یہ نتیجہ مستنبط کیا کہ دہلی کا مستقل قیام ۱۸۱۶ء کے بعد پیش آیا۔ ہجری سنین کے حساب سے بھی ۱۸۱۶-۱۷ء قرار پاتا ہے۔

---

[1] کلیات نثر غالب ۱۸۶۸ء صفحہ ۱۰۳
[2] آثار غالب طبع چہارم صفحہ ۸۱

بے محل نہ ہوگا اگر غالب کے خطوط کے اس سلسلے میں ایک کڑی کا اور اضافہ کر دیا جائے۔ یہ ایک فارسی مکتوب ہے بنام سلطان زادہ بشیر الدین میسوری۔ ضمناً مرقوم ہے کہ "نامہ نگار خود از دیر باز سر سخن سنجی ندارد، نہ گہر در تراز و ست و نہ زور در بازو نشست دشتش مرحلہ از مسیر عمر بیک سے بیہودہ آمد۔ پنجاہ سال ہنگامہ بہروزری و عشقبازی بانکو محضران دہلی گرم داشت "[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے قیام آگرہ سولہ برس کی عمر میں ترک کیا یعنی ۱۸۱۳ء میں۔

اگر نفسیاتی اصولوں پر ان خطوط[2] کو پرکھا جائے، تو سب سے زیادہ وقیع خط نمبر ۳ کی شہادت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے میر اعظم علی نے غالب کو لکھا کہ درازی زمان فراق سوا سال ہے۔ اس کی تردید کرنے کے لیے غالب کو ضرور حساب لگانا پڑا ہوگا اور وہ فکر و تامل کے بعد ہی اس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ یہ زمانہ بیس سال سے کم نہیں۔ اس کے بعد خط نمبر ۱ کی اہمیت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خط اور فارسی مکتوب، بنام سلطان زادہ بشیر الدین میسوری ایک ہی سن یعنی ۱۲۷۸ھ میں لکھے گئے ہیں[3] فارسی مکتوب میں تو ان کا قلم اپنی جبلی شوخی اور روانی سے لکھ گیا کہ میں پچاس برس سے دہلی میں لہو و لعب میں مشغول ہوں۔ لیکن اردو خط میں انھوں نے حساب لگا کر لکھا کہ میں دہلی میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک ہی سال کے مرقومہ خطوط میں سے ایک میں پچاس اور دوسرے میں اکیاون برس لکھنا معنی خیز ہے۔ "پچاس" روزمرہ ہے بلکہ "اکیاون" غور و تامل پر دلالت کرتا ہے۔ اس تمام بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غالب نے آگرہ کی مستقل سکونت ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۷ء کے درمیان ترک کی اور گمان غالب یہ ہے کہ یہ تاریخ ۱۸۱۷ء سے بہت قریب ہونی چاہیئے جیسا کہ آگے کی سطور سے واضح ہوگا۔

فاروقی صاحب کے اس نظریے سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ "غالب کی سیرت اور شخصیت کا اولین نقش آگرہ ہی میں صورت پذیر ہوا تھا۔ اس لیے اکبر آباد کے قیام کی روداد اور اس زمانے کے کلام کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے۔ لیکن مستند معاصرانہ شہادتوں کی عدم موجودگی میں اس قیام کی تفصیل پیش کرنا یا اس کی کوئی قطعی اور فیصلہ کن تاریخ مقرر کرنا دشواری سے خالی نہیں۔"

معاصرانہ تذکروں میں عمدہ منتخبہ یا تذکرہ سرور مرتبہ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں بہادر اہم ترین ہے۔ فاروقی صاحب نے اس تذکرے کی داخلی شہادتوں کی تنقیح کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطہ کی

---

[1] کلیات نثر غالب ۱۸۸۸ء صفحہ ۱۰۳

[2] مولانا مہر نے اپنی کتاب "غالب" کے چوتھے باب "موسومہ دہلی میں سکونت، اور مکان" میں غالب کے قیام آگرہ پر بحث کی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب نے جن خطوط کے حوالے دیئے ہیں ان میں سے پہلے، تیسرے اور چوتھے سے مولانا مہر نے بھی استفادہ کیا ہے۔ چوتھا خط جو میر اعظم علی کے نام ہے۔ اس سے حساب لگانے میں نیز ہجری کے بجائے عیسوی سنین اختیار کرنے میں ان سے بھی وہی سہو ہوا ہے جو بعد میں فاروقی صاحب سے ہوا

[3] یہ خط غالب نے ۶۶ برس کی عمر میں تحریر کیا۔ اور ان کا معروف سن پیدائش ۱۲۱۲ ہجری ہے۔

تاریخ تالیف ۹۸-۱۷۹۷ء سے ۱۸۰۹ء تک۔ ہے[۱] اور انہوں نے اعظم الدولہ سرور کے اس بیان کی تائید فرمائی ہے کہ "ایں نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) صورت اختتام پذیرفت"

اگر تذکرہ کی اس تاریخ اختتام کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے ترجمۂ غالب کو دیکھا جائے تو بعض غور طلب امور سامنے آتے ہیں۔ ترجمۂ غالب یہ ہے۔

"اسد تخلص اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اصلش از سمرقند مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد جوان قابل و یارباش و دردمند ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن، غم ہای عشق مجاز تربیت یافتہ خم کذ نیاز در فن سخن سنجی تتبع محاورات مرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمۃ در ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ بمضامین نازک موزوں گشتہ، رویہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد"

فاروقی صاحب فاضلانہ تحقیق و تنقیح کے بعد یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ "سرور کے بیان اور عمدۂ منتخبہ کی اندرونی شہادتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۸۰۹ء میں ہو چکی تھی" یا بالالفاظ دیگر یہ کہ مزبورہ ترجمۂ غالب نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ ہجری کے قبل لکھا گیا جبکہ غالب کی عمر ساڑھے گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ شیخ محمد اکرام بھی ترجمہ

---

[۱] فاضل مقالہ نگار نے تحریر کیا ہے کہ "شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ انڈیا آفس کے اس قلمی تذکرے پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے اور یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ نواب اعظم الدولہ کا ترجمہ غالب کس زمانے کا ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں اس لیے کہ .... اس نسخہ کے خاتمہ پر ایک چھوڑ تین تین تاریخیں درج ہیں۔ تذکرۂ سرور کے آخر میں نظام الدین خاں ممنون کی تاریخ دی ہے۔

جو تاریخ پوچھی تو ممنون نے کہا "یہ ہے معیار نقد سخن" ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء

بھولا ناتھ عاشق نے "باغ و بہار" سے تاریخ نکالی ہے

مری بلبل طبع نے دیکھ عاشق　　　کہی اس کی تاریخ "باغ و بہار"

اس سے ۱۲۱۷ ہجری (جو مطابق ہے ۱۸۰۲ء) نکلتی ہے۔ اعظم الدولہ کا بیان ہے کہ "ایں نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ ہجری (۱۸۰۹ء) صورت اختتام پذیرفت" شیخ محمد اکرام پر یہ اعتراض درست نہیں ان کے محولہ الفاظ یوں ہیں:۔

"انڈیا آفس لائبریری میں اردو شعرا کے دو تذکرے ہیں۔ تذکرۂ سرور اور عیار الشعرا جن میں غالب کو اکبر آباد کا ساکن بتایا گیا ہے لیکن ان قلمی نسخوں پر تاریخ کتابت درج نہیں اور چونکہ تذکرۂ سرور کے مصنف سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی اس لیے ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لیے گئے ہوں" (آثار غالب ص ۲۲ طبع چہارم)

اور دوسرا متعلقہ اقتباس یہ ہے:۔ "جن میں دو اندراجات (نواب اعظم الدولہ کا بیان اور منشی شیونارائن کے نام مرزا کا خط) کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ ضرور اہم ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ نواب اعظم الدولہ کا بیان کس زمانے کا ہے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد 'خوش معاشی' کی حالت نہ رہی ہو" (ص ۲۶)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے اندراج کی بابت تذبذب کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ صرف مندرجہ اشعار کے متعلق کہتے ہیں کہ "ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لیے گئے ہوں"۔

ترجمہ میں غالب کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ جوان قابل و یار باش و دردمند ہیں، ہمیشہ خوش معاشی سے بسر کرتے رہے ہیں اور راقم کے ساتھ رابطۂ یک جہتی مستحکم رکھتے ہیں۔ ان الفاظ پر رائے زنی کرنا تفصیل حاصل ہوگی۔ بدیہی ہے کہ غالب کو ان صفات سے متصف کرنے کے لیے ان کی عمر (گیارہ سال) میں آٹھ دس سال کا اضافہ کرنا ہوگا۔ پھر ان کے کلام پر جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے۔ کسی لفظ سے غالب کی غیر معمولی کم سنی پر اظہار حیرت مترشح نہیں ہوتا۔ اس مشکل مسئلے کے صرف دو حل ہو سکتے ہیں۔

ایک تو یہ مان لیا جائے کہ تذکرہ کے ختم ہونے کے آٹھ دس سال کے بعد اس میں محض غالب کے بعض اشعار ہی نہیں بلکہ ان کا پورا ترجمہ اضافہ کیا گیا۔ یہ ملحوظ رہے کہ جب کبھی بھی یہ ترجمہ درج کیا گیا غالب کا مستقر آگرہ ہی تھا اور اس وقت تک انھوں نے نقل سکونت نہ کی تھی[1] اس موضوع پر بہت بحث ہو چکی ہے۔ اور محققین کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ غالب نے کب قیام آگرہ مستقلاً ترک کیا۔

دوسرا حل یہ ہے کہ غور کیا جائے کہ غالب کی ولادت مسلمہ تاریخ پیدائش سے چند سال پیشتر تو نہیں۔ لہٰذا

---

[1] اسی کے پیش نظر مقالۂ ہذا میں اوپر لکھا گیا ہے کہ غالب کے آگرہ کی مستقل سکونت ترک کرنے کی تاریخ ۱۸۱۷ء سے بہت قریب ہونی چاہیے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

ظاہر ہے کہ شیخ صاحب کا وہ مفہوم نہیں جو فاروقی صاحب نے لیا ہے۔ چونکہ تذکرہ مطبوعہ نہیں کہ تاریخ طباعت کا تعین ہو سکے۔ اس لیے وہ تاریخ کتابت چاہتے ہیں، ممنون و عاشق کی کہی ہوئی تاریخیں نہیں۔ اگر یہ معلوم ہو سکتا کہ یہ تذکرہ کس سن میں کاتب نے تحریر کیا تھا تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی کہ مندرجہ واقعات اس سن سے قبل کے ہیں۔ نواب اعظم الدولہ کے متذکرہ بیان سے یہ مدعا حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ان سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی اس لیے ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لیے گئے ہوں۔"
چنانچہ غالب ایک فارسی رقعے میں جو نواب مصطفیٰ خاں بہادر کے نام ہے مرزا احمد بیگ خاں تپاں کی بابت لکھتے ہیں کہ "ہنگامی کہ من بہ کلکتہ بودم چوں از من شنود کہ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور تخلص تذکرۂ ریختہ گویاں انشا می کند جزوی از نتائج طبع خود بمن می دہد تا چوں بہ دہلی رسم بہ نامہ گرد آورینی نواب میر محمد خاں سرور بدہم۔ من ہم چناں می کنم و چوں اعظم الدولہ بدیدن من می آید آں سفینہ پیش می کشم و پیام آشنا می گزارم" (کلیات نثر غالب صفحہ ۱۰۱-۱۰۹)

اس خط سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب اعظم الدولہ سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی بلکہ یہ بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ تذکرۂ سرور کے قلمی نسخہ میں نواب صاحب موصوف کا بیان متذکرہ صدر "ایں نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ ہجری صورت اختتام پذیرفت" شاید کوئی خاص معنی نہیں رکھتا جبکہ اس تاریخ کے بائیس تیئس برس کے بعد بھی وہ اپنے تذکرے کے لیے مواد فراہم کرنے میں مشغول نظر آتے ہیں۔

یہاں غالب کے سن ولادت کے مآخذ کا جائزہ لینا اور اس کے متعلق داخلی اور خارجی شواہد پر تبصرہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔

حالی رقمطراز ہیں کہ "مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ، شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے" (یادگار غالب)

حالی کے بعد کے محققین نے بھی غالب کی یہی تاریخ ولادت تسلیم کی ہے۔ اس کے مآخذ خود غالب کے بیانات ہیں جن سے صراحتاً یا کنایتاً یہ تاریخ مستنبط ہوتی ہے۔ سب سے پہلا بیان وہ ہے جو خاتمہ دیوان فارسی کے تحت کلیات نثر میں ملتا ہے[1]

"...... از روزی کہ شمارہ سنین عمر از آحاد فرا ترک رفعت و رشتہ حساب زحمت یاز دہمیں گرہ بخود برگرفت، اندیشہ در رواروگام فراخ برداشت دگریوہ دمغاک بادیہ سخن پیمودن آغاز نہاد تا امروز کہ از ہجرت خاتم الانبیا علیہ التحیۃ والثنا یک ہزار و دوصد و پنجاہ وسہ سال گذشتہ و رصد نگار طالع من باندازہ خراش پیک آسمانی در مشاہدۂ آثار سال چہل و یکم ست ہنوز شخص اندیشہ کیفیت این جام و افلاطون این خم ست۔ رباعی

غالب بچو نارسائی فرجام نصیب	ہم یم عدد دارم و ہم ذوق حبیب
تاریخ ولادت از عالم قدس	ہم شورش شوق آمد و ہم لفظ غریب

کیست تا از من پرسد واگر ناپرسیدہ گویم در دلش فرود آید کہ درین سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہا روی دادہ ......"[2]

یہ تحریر ۱۲۵۳ ہجری مطابق ۳۸-۱۸۳۷ء کی ہے۔ اس میں "شورش شوق" اور "غریب" سے تاریخ ولادت (۱۲۱۲ھ) بھی نکالی ہے۔ اس کے بعد غالب کے اردو اور فارسی مکتوبات میں متعدد جگہ ان کا سن پیدائش مذکور ہے۔ چنانچہ ایک تو وہ لطیفہ ہے جہاں انھوں نے صاحب عالم مارہروی کی تاریخ ولادت "تاریخ" (۱۲۱۱ ہجری) کے مقابلے میں اپنی

---

[1] کلیات نثر غالب مطبوعہ ۱۸۶۸ء صفحات ۶۸-۶۷

[2] کلیات نثر غالب میں جو "دیباچہ دیوان فارسی" اور "خاتمہ دیوان فارسی" مرقوم ہیں یہ وہ ہیں جو غالب نے اپنے دیوان فارسی موسومہ "میخانہ آرزو" کے لیے لکھے تھے۔ یہی دیباچہ اور خاتمہ انھوں نے اپنی کلیات نظم مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں بھی شامل کیے۔ البتہ مذکورہ اقتباس میں امتداد زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے انھوں نے "یک ہزار و دوصد و پنجاہ و سہ" کو کلیات نظم (۱۸۶۳ء) میں "یک ہزار و دوصد و ہفتاد و ہشت" سے اور "آثار سال چہل و یکم" کو "آثار سال شصت و ششم" سے تبدیل کر دیا۔ اس اقتباس میں آگے مذکور ہے کہ "درین سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہا روی دادہ" یہاں انھیں "سی سال" کو "پنجاہ و پنج" بدلنے کا خیال نہ رہا اور موجودہ صورت میں "سی سال" بے معنی ہو کر رہ گیا۔

پیدائش کی تاریخ "تاریخ" قرار دی ہے اور دوسرا ان کا وہ خط[1] ہے جس میں نواب علاؤالدین احمد کو ۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں :-

"... ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں، چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ ہجری میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا......"
یہاں سن کے ساتھ ماہ و تاریخ کا بھی ذکر ہے[2]

اس سلسلے میں سب سے اہم کڑی وہ تحریر ہے جو ان کے کلیات نظم مطبوعہ ۱۸۶۳ء کے صفحہ ۱۹۰ پر ان کے زائچہ طالع کے اوپر بطور عنوان مرقوم ہے یعنی "زائچہ طالع ولادت سعادت مطالع جناب غالب مدظلہ العالی کہ بوقت شب چار گھڑی پیش از طلوع صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب سنہ ۱۲۱۲ھ مطابق آغاز سنہ ۱۷۹۸ عیسوی روی دادہ" اس میں پیدائش کے سن و ماہ و تاریخ کے ساتھ دن اور وقت بھی مذکور ہے[3]

اب اس مسئلہ کا دوسرا پہلو ملاحظہ کرنا چاہیئے۔ غالب کی تاریخ ولادت کی تائید میں غالب کے بیان کے علاوہ کوئی ایسی معاصرانہ شہادت نہیں ملتی جس کا ماخذ خود غالب کا بیان نہ ہو البتہ ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے مذکورہ تاریخ پیدائش کی صحت میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں :

(۱) مولانا مہر غالب کی تاریخ پیدائش تحریر کرنے کے بعد ذیل کا حاشیہ لکھتے ہیں :

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی ولادت "بوقت شب چار گھڑی پیش از طلوع صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب سنہ ۱۲۱۲ھ مطابق آغاز سنہ ۱۷۹۸ء ہوئی" حساب کے مطابق ۸ رجب سنہ ۱۲۱۲ھ کی عیسوی تاریخ ۲۷ دسمبر سنہ ۱۷۹۷ء تھی۔ نیز اس دن یکشنبہ نہ تھا بلکہ چہارشنبہ تھا۔ یعنی غالب نے وقت اور قمری تاریخ درست لکھی لیکن دن اور عیسوی تاریخ کی غلطی ظاہر ہے[4]

(۲) یادگار غالب میں حالی نے لکھا ہے "خود مرزا غالب کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے۔ ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ حاشیہ میں مرقوم ہے کہ مرزا کے اشعار ان کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں نے میر تقی کو دکھائے تھے[5]

حالی کے اس بیان پر بحث کرتے ہوئے مولانا مہر جو لکھتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حسام الدین حیدر خاں عمر میں غالب

---

[1] خطوط غالب از مہیش پرشاد صفحہ ۳۲۷

[2] مالک رام نے تصریح کی ہے کہ ان کا ماخذ یہی خط ہے (ذکر غالب طبع سوم صفحہ ۲۳)

[3] حالی نے "یادگار غالب" میں اور اکرام نے "آثار غالب" میں غالب کی ولادت کے ضمن میں "شب ہشتم رجب" تحریر کیا ہے لیکن اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ چونکہ "شب" کا ذکر اور کہیں پایا نہیں جاتا اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا ماخذ یہی تحریر ہے۔ مولانا مہر نے "غالب" میں اسی تحریر سے استفادہ کیا ہے اور تشریح کر دی ہے۔ (غالب طبع چہارم صفحہ ۱)

[4] "غالب" از مہر طبع چہارم صفحہ ۱

[5] مہر کا مضمون "مرزا غالب اور میر تقی" مطبوعہ ماہ نو کراچی، فروری ۱۹۴۹ء

سے بہت بڑے تھے ان کے دو بیٹے مظفر الدولہ اور حسین مرزا غالب کے ہم عمر اور عزیز دوست تھے۔ یہ کیوں کر مان لیا جائے کہ جب غالب گیارہ برس کے تھے اور آگرہ میں رہتے تھے تو نواب حسام الدین حیدر خاں نے آگرہ جا کر ان کے منتخب اشعار لیے اور لکھنؤ پہنچ کر انھیں میر تقی کے ملاحظہ میں پیش کیا؟ یہ معلوم ہے کہ غالب کی ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی اور میر تقی نے ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ کو وفات پائی۔ گویا میر کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف ۱۳ برس ایک مہینہ اور بارہ دن کی تھی۔ اگر گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کر دیئے تو سمجھنا چاہیئے کہ ان کی شاعری کا آغاز ۱۲۲۳ھ میں ہوا۔ یہ معلوم ہے کہ میر عمر کے آخری حصہ میں ضعف بصارت اور بعض دوسرے امراض مزمنہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ غرض جس بزرگ کی زندگی کے آخری دو تین برس وارفتگی حواس اور ہجوم امراض میں گذرے اس کے متعلق یہ روایت کیوں کر قابل یقین ہو سکتی ہے کہ آگرہ سے گیارہ بارہ برس کے بچے کے اشعار اس کے ملاحظے کے لیے لکھنؤ بھیجے گئے اس نے اشعار دیکھے اور وہ رائے ظاہر کی جو حالی نے لکھی ہے ص[1]

(۲) نواب اعظم الدولہ کے معاصرانہ تذکرہ عمدہ منتخبہ میں جو ۱۸۰۹ء میں تکمیل پا چکا تھا غالب کے متعلق لکھا ہے کہ جوان قابل یار باش و درد مند ہیں، ہمیشہ خوش معاشی سے بسر کرتے رہے ہیں اور راقم کے ساتھ رابطۂ یک جہتی مستحکم رکھتے ہیں ص[2]

(۴) غالب نے خدادا دخاں صاحب و ولی داد خاں صاحب ساہوکاران آگرہ کے نام ایک خط لکھا تھا جس پر تاریخ سی ام جنوری ۱۸۰۴ء مرقوم ہے۔ اس خط کا عکس پہلے علی گڑھ میگزین غالب نمبر میں اور پھر آج کل دہلی فروری ۱۹۵۲ء میں شایع ہوا صرف عرشی صاحب کا یہ خیال ہے کہ یہ خط غالب کی تحریر نہیں بعض دوسرے محققین کی رائے میں سنہ ۱۸۰۲ء غالباً سنہ ۱۸۲۲ء کے عوض لکھا گیا ہے۔ مالک رام کے خیال میں یہ خط سنہ ۱۸۲۲ء کا ہے ص[3] مہر اور مالک رام نے اس خط کو مستند مانتے ہوئے (سوائے تاریخ کتابت کے) اس کے مضامین سے استفادہ کیا ہے ص[4]

(۵) خواجہ حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے "کہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جبکہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے" ص[5]

مولانا مہر اس بیان پر چیں بہ جبیں ہو کر لکھتے ہیں: "اگر خواجہ صاحب نے سفر کلکتہ کے متعلق ۱۸۳۰ء والے بیان ہی کو صحیح قرار دے لیا تھا تو اس حالت میں غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ تینتیس برس کی ماننی چاہیئے تھی اور سیر و سوانح کی کتاب میں تینتیس برس کی مدت کو کچھ کم چالیس برس سے تعبیر کرنا محتاط طریق بیان نہیں" ص[6]

(باقی آئندہ)

ص[1] مہر کا مضمون "میرزا غالب اور میر تقی" مطبوعہ ماہ نو کراچی، فروری ۱۹۴۹ء

ص[2] اس مضمون میں اوپر اس مسئلہ پر کسی قدر بحث کی جا چکی ہے۔

ص[3] ذکر غالب تیسرا ایڈیشن، صفحہ ۲۰ حاشیہ

ص[4] ذکر غالب "تیسرا ایڈیشن صفحہ ۲۰ اور" غالب" از مہر طبع چہارم صفحہ ۲۰

ص[5] اردوئے معلیٰ ۱۸۹۹ء صفحہ ۲۹۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں، "۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا"

ص[6] غالب از مہر طبع چہارم صفحہ ۹۲

غالب کا قیام آگرہ اور سن ولادت

از: پروفیسر خواجہ محمد حامد، مہاودیالیہ ناگپور

غالب کے سوانح حیات کی چھان بین کرنے والے تمام محققین متفق ہیں کہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کسی زمانے میں وہ مستقلاً آگرہ چھوڑ کر دلی چلے گئے[ص۱]۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کا مقالہ "غالب کا قیام آگرہ اور تذکرہ سرور"[ص۲] بہت قابل قدر ہے۔ فاضل محقق نے غالب کے خطوط اور نواب اعظم الدولہ کے معاصرانہ تذکرے سے ان کی نقل سکونت کے زمانے کا تعین کرنا چاہا ہے۔ اس ضمن میں چند باتیں محل نظر ہیں۔

فی زمانہ تصور زماں کا انحصار عیسوی سنین پر ہے۔ جب زمانے کی کسی مدت کا حساب کرنا ہوتا ہے تو دو عیسوی سن لیے جاتے ہیں اور ان کے حاصل تفریق سے مطلوبہ مدت معلوم کی جاتی ہے۔ لیکن غالب کے عہد میں یہ بات نہ تھی۔ ان کے عصر میں مسلمان خالص اسلامی معاشرت کے پابند تھے۔ زمانے کا حساب کرتے وقت عادتاً ان کے ذہن میں ہجری سنین ہی ابھرتے تھے اور ہجری سنین ہی سے وہ تعین زماں کے عادی تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں لوگ ضرورتاً عیسوی سن استعمال کرنے لگے تھے مگر اس کے استعمال میں انھیں اتنا ہی تکلف ہوتا تھا جتنا کہ آج ہمیں ہجری سن کے استعمال کرنے میں ہوتا ہے۔ غالب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ جب کبھی وہ اپنی عمر بیان کرتے تھے تو اس کا حساب ہجری سالوں کے مطابق ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ غالب کی مصنفات میں اس کی متعدد مثالیں ہیں۔ ایک ملاحظہ ہو۔ نواب انوار الدولہ شفق کو ایک مکتوب مرقومہ سہ شنبہ ۲۲ اکتوبر (۱۸۶۱ء) میں لکھتے ہیں۔

"...... میرا ہم قوم تو سراسر قلم رو ہند میں نہیں، سمرقند میں دو چار یا دشت خفچاق میں سو دو سو ہوں گے مگر ہاں اقربائے سببی پانچ برس کی عمر سے اون کے دام میں اسیر ہوں، اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں۔

گرد ہم شرح ستمہائے عـــزیزاں غالب　　　رسم امید ہمانا ز جہـــاں برخیزد"[ص۳]

اگر اکسٹھ اور پانچ چھیاسٹھ ۱۸۶۱ء میں سے وضع کیے جائیں تو غالب کا سن ولادت ۱۷۹۵ء نکلے گا۔ لیکن سن ہجری کے مطابق حساب کیا جائے تو ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء مطابق ہے ۱۳ ربیع الآخر ۱۲۷۸ھ کے۔ لہذا سن ولادت ۱۲۱۲ ہجری برآمد ہوتا ہے جو مشہور و معروف ہے۔

اپنے مقالے میں جناب فاروقی صاحب نے غالب کے چار خطوط کا حوالہ حسب ذیل دیا ہے:۔

(۱)۔ "مرزا غالب نے نواب علاؤالدین خاں کے نام خط میں جو ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا ہے اپنا دلی کا قیام اکیاون

ص۱ آثار غالب طبع چہارم صفحہ ۳۵

ص۲ مطبوعہ آج کل دہلی، فروری، ۱۹۵۶ء

ص۳ خطوط غالب از مہیش پرشاد صفحہ ۱۴۸

برس سے بتایا ہے" پھر اصل خط کا حصہ تحریر کرنے کے بعد نتیجہ نکالا ہے کہ "اس خط کی رو سے غالب کے ورود دہلی کا سن ۱۸۱۱ء ہونا چاہیے۔"

اگر اب سنین ہجری کے اعتبار سے حساب لگایا جائے تو ۱۴ فروری ۱۸۶۲ء مطابق ہے ۱۶ شعبان ۱۲۷۸ھ سے۔ اس طرح غالب کے ورود دہلی کا سن ۱۲۲۷ ہجری مطابق ۱۸۱۲ء ہوا۔

(۲) "نواب کلب علی خاں کو یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں ..... کہ باون ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں... اس حساب سے غالب نے دہلی کا مستقل قیام ۱۲-۱۸۱۳ء میں اختیار کیا۔"

یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کو ۲۲ ربیع الآخر ۱۲۸۳ھ تھی۔ ۵۲-۵۳ گھٹانے پر ۳۱-۱۲۳۰ھ مطابق ۱۶-۱۸۱۵ء ہوئی۔

(۳) - اس خط میں فاروقی صاحب ۱۸۳۵ء سے ۲۰ گھٹا کر ۱۸۱۵ء نکالتے ہیں۔ جبکہ متذکرہ بالا اصول کے مطابق صحیح سن ۱۸۱۶ء ہوگا۔ لیکن یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ "مرزا غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس آئے ہیں۔ اپنے سفر کی کیفیت اور مالی پریشانیوں کا حال بیان کرتے ہوئے میر اعظم علی مدرس مدرسہ اکبر آباد کو لکھتے ہیں — اکنوں بستمیں سال است کہ خانماں بباد دادہ و دل بہ مرگ ناگاہ نہادہ بہ کنجے نشستہ ام — اس طرح یہ خط ۱۸۳۵ء کا مکتوبہ ہونا چاہیے۔"

غالب کے اس مکتوب کا پورا متعلقہ حصہ یوں ہے: "...... درازیٔ زماں فراق کہ بہ گمان مخدوم شانزدہ سال است و بدانست نامہ نگار کم از بست سال نیست ...... چوں گورنر جنرل آہنگ ہندوستاں کرد پیشاپیش دویدم بہ دہلی رسیدم روزگار برگشت و کار ساختہ شدہ صورت تباہی گرفت اکنوں بستمیں سال ست کہ خانماں بباد دادہ دل بر مرگ ناگاہ نہادہ بکنجی نشستہ ام ......" ۱؎ فاروقی صاحب نے "بستمیں سال" کو "بہ دہلی رسیدم" سے متعلق کرکے اس مکتوب کی تاریخ ۱۸۳۵ء متعین کی ہے لیکن بدیہی ہے کہ "بستمیں سال" کا رشتہ "روزگار برگشت و کار ساختہ شدہ صورت تباہی گرفت" سے ہے جس سے مراد ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء ہونی چاہیے۔ جب لارڈ ولیم بینٹنگ نے مرزا کے خلاف فیصلہ دیا ۲؎ تقویم سے ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء ۱۳ شعبان ۱۲۴۶ھ کے مطابق ہے۔ اس لیے تاریخ مکتوب ۱۲۵۲ھ ہوئی اس سے کم از کم بیس سال قبل غالب نے آگرہ چھوڑا تو نقل سکونت ۱۲۳۲ھ کے لگ بھگ ہوئی یعنی ۱۸۱۷ء میں یا اس کے قبل۔

(۴) "لیکن اس سلسلہ میں غالباً سب سے زیادہ اہم وہ خط ہے جو غالب نے منشی شیو نارائن کے نام ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو لکھا ہے — میں اور وہ ہم عصر تھے شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی —"

یہاں صاحب مضمون نے غالب کی تاریخ ولادت میں ۱۹، ۲۰ جوڑ کر یہ نتیجہ مستنبط کیا کہ دہلی کا مستقل قیام ۱۸۱۶ء کے بعد پیش آیا۔ ہجری سنین کے حساب سے بھی ۱۷-۱۸۱۶ء قرار پاتا ہے۔

۱؎ کلیات نثر غالب ۱۸۶۸ء صفحہ ۱۰۳

۲؎ آثار غالب طبع چہارم صفحہ ۸۱

بے محل نہ ہوگا اگر غالب کے خطوط کے اس سلسلے میں ایک کڑی کا اور اضافہ کر دیا جائے۔ یہ ایک فارسی مکتوب ہے بنام سلطان زادہ بشیر الدین میسوری۔ ضمناً مرقوم ہے کہ "نامہ نگار خود از دیر باز سر سخن سنجی ندارد، نہ گہر در تراز دست و نہ زور در بازو شست، و شش مرحلہ از مسیر عمر سبک سپہ پیمودہ آمد، پنجاہ سال ہنگامہ مہرورزی و عشقبازی با نکو محضران دہلی گرم داشتہ" حـ۱ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے قیام آگرہ سولہ برس کی عمر میں ترک کیا یعنی ۱۸۱۲ء میں۔

اگر نفسیاتی اصولوں پر ان خطوط حـ۲ کو پرکھا جائے تو سب سے زیادہ وقیع خط نمبر ۳ کی شہادت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے میر اعظم علی نے غالب کو لکھا کہ درازی زمان فراق سولہ سال ہے۔ اس کی تردید کرنے کے لیے غالب کو ضرور حساب لگانا پڑا ہوگا اور وہ فکر و تامل کے بعد ہی اس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ یہ زمانہ بیس سال سے کم نہیں۔ اس کے بعد خط نمبر ۱ کی اہمیت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خط اور فارسی مکتوب بنام سلطان زادہ بشیر الدین میسوری ایک ہی سن یعنی ۱۲۷۸ھ میں لکھے گئے ہیں حـ۳ فارسی مکتوب میں تو ان کا قلم اپنی جبلی شوخی اور روانی سے لکھ گیا کہ میں پچاس برس سے دہلی میں لہو و لعب میں مشغول ہوں۔ لیکن اردو خط میں انھوں نے حساب لگا کر لکھا کہ میں دہلی میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک ہی سال کے مرقومہ خطوط میں سے ایک میں پچاس اور دوسرے میں اکیاون برس لکھنا معنی خیز ہے۔ "پچاس" روزمرہ ہے جبکہ "اکیاون" غور و تامل پر دلالت کرتا ہے۔ اس تمام بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غالب نے آگرہ کی مستقل سکونت ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۷ء کے درمیان ترک کی اور گمان غالب یہ ہے کہ یہ تاریخ ۱۸۱۷ء سے بہت قریب ہونی چاہیے جیسا کہ آگے کی سطور سے واضح ہوگا۔

فاروقی صاحب کے اس نظریے سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ "غالب کی سیرت اور شخصیت کا اولین نقش آگرہ ہی میں صورت پذیر ہوا تھا۔ اس لیے اکبرآباد کے قیام کی روداد اور اس زمانے کے کلام کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے۔ لیکن مستند معاصرانہ شہادتوں کی عدم موجودگی میں اس قیام کی تفصیل پیش کرنا یا اس کی کوئی قطعی اور فیصلہ کن تاریخ مقرر کرنا دشواری سے خالی نہیں۔"

معاصرانہ تذکروں میں عمدہ منتخبہ یا تذکرہ سرور مرتبہ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں بہادر اہم ترین ہے۔ فاروقی صاحب نے اس تذکرے کی داخلی شہادتوں کی تنقیح کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انڈیا آفس لائبریری کے مخطوطے کی

حـ۱ کلیات نثر غالب ۱۸۶۸ء صفحہ ۱۰۳

حـ۲ مولانا مہر نے اپنی کتاب "غالب" کے چوتھے باب موسومہ "دہلی میں سکونت، اور مکان" میں غالب کے قیام آگرہ پر بحث کی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب نے جن خطوط کے حوالے دیے ہیں ان میں سے پہلے، تیسرے اور چوتھے سے مولانا مہر نے بھی استفادہ کیا ہے ــــ چوتھا خط جو میر اعظم علی کے نام ہے۔ اس سے حساب لگانے میں ہجری کے بجائے عیسوی سنین اختیار کرنے میں ان سے بھی وہی سہو ہوا ہے جو بعد میں فاروقی صاحب سے ہوا

حـ۳ یہ خط غالب نے ۶۶ برس کی عمر میں تحریر کیا۔ اور ان کا معروف سن پیدائش ۱۲۱۲ ہجری ہے۔

تاریخ تالیف ۹۸-۱۷۹۷ء سے ۱۸۰۹ء تک ہے [1] اور انہوں نے اعظم الدولہ سرور کے اس بیان کی تائید فرمائی ہے کہ

"ایں نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) صورت اختتام پذیرفت"۔

اگر تذکرہ کی اس تاریخ اختتام کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے ترجمۂ غالب کو دیکھا جائے تو بعض غور طلب امور سامنے آتے ہیں۔ ترجمۂ غالب یہ ہے۔

"اسد تخلص اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، اصلش از سمرقند مولدش مستقر الخلافہ اکبرآباد، جوان قابل و یارباش و دردمند، ہمیشہ بخوش معاشی بسر بردہ، ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن، غم ہای عشق مجاز تربیت یافتۂ کم نیاز، در فن سخن سنجی تبع محاورات مرزا عبد القادر بیدل علیہ الرحمۃ در ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ بمضامین نازک موزوں گشتہ، رویہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد"۔

فاروقی صاحب فاضلانہ تحقیق و تنقیح کے بعد یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ "سرور کے بیان اور عمدہ منتخبہ کی اندرونی شہادتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۸۰۹ء میں ہو چکی تھی" یا بالالفاظ دیگر یہ کہ مزبورہ ترجمۂ غالب نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ ہجری کے قبل لکھا گیا جبکہ غالب کی عمر ساڑھے گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ شیخ محمد اکرام بھی ترجمہ

---

[1] فاضل مقالہ نگار نے تحریر کیا ہے کہ "شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ انڈیا آفس کے اس قلمی تذکرے پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے اور یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ نواب اعظم الدولہ کا ترجمۂ غالب کس زمانے کا ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں اس لیے کہ .... اس نسخہ کے خاتمہ پر ایک چھوڑ تین تین تاریخیں درج ہیں۔ تذکرۂ سرور کے آخر میں نظام الدین خاں ممنون کی تاریخ دی ہے۔

جو تاریخ پوچھی تو ممنون نے کہا "یہ ہے معیار نقد سخن" ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰

بھولاناتھ عاشق نے "باغ وبہار" سے تاریخ نکالی ہے

مری بلبل طبع نے دیکھ عاشق　　　　کہی اس کی تاریخ "باغ وبہار"

اس سے ۱۲۱۷ ہجری (جو مطابق ہے ۱۸۰۲ء) نکلتی ہے۔ اعظم الدولہ کا بیان ہے کہ "ایں نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ ہجری (۱۸۰۹ء) صورت اختتام پذیرفت"۔ شیخ محمد اکرام پر یہ اعتراض درست نہیں ان کے محولہ الفاظ یوں ہیں:۔

"انڈیا آفس لائبریری میں اردو شعرا کے دو تذکرے ہیں۔ تذکرۂ سرور اور عیار الشعرا جن میں غالب کو اکبرآباد کا ساکن بتایا گیا ہے لیکن ان قلمی نسخوں پر تاریخ کتابت درج نہیں اور چونکہ تذکرۂ سرور کے مصنف سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی اس لیے ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لیے گئے ہوں"۔ (آثار غالب ص ۲۲ طبع چہارم)

اور دوسرا متعلقہ اقتباس یہ ہے: "جن میں دو اندراجات (نواب اعظم الدولہ کا بیان اور منشی شیونارائن کے نام مرزا کا خط) کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ ضرور اہم ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ نواب اعظم الدولہ کا بیان کس زمانے کا ہے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد 'خوش معاشی' کی حالت نہ رہی ہو"۔ (ص ۲۶)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے اندراج کی بابت تذبذب کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ صرف مندرجہ اشعار کے متعلق کہتے ہیں کہ "ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لیے گئے ہوں۔"

ترجمہ میں غالب کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ جوان قابل و یار باش و دردمند ہیں، ہمیشہ خوش معاشی سے بسر کرتے رہے ہیں اور راقم کے ساتھ رابطۂ یک جہتی مستحکم رکھتے ہیں۔ ان الفاظ پر رائے زنی کرنا تفصیل حاصل ہوگی۔ بدیہی ہے کہ غالب کو ان صفات سے متصف کرنے کے لیے ان کی عمر (گیارہ سال) میں آٹھ دس سال کا اضافہ کرنا ہوگا۔ پھر ان کے کلام پر جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے۔ کسی لفظ سے غالب کی غیر معمولی کم سنی پر اظہار حیرت مترشح نہیں ہوتا۔ اس مشکل مسئلے کے صرف دو حل ہو سکتے ہیں۔

ایک تو یہ مان لیا جائے کہ تذکرہ کے ختم ہونے کے آٹھ دس سال کے بعد اس میں محض غالب کے بعض اشعار ہی نہیں بلکہ ان کا پورا ترجمہ اضافہ کیا گیا۔ یہ ملحوظ ہے کہ جب کبھی بھی یہ ترجمہ درج کیا گیا غالب کا مستقر آگرہ ہی تھا اور اس وقت تک انھوں نے نقل سکونت نہ کی تھی ؎۱ اس موضوع پر بہت بحث ہو چکی ہے۔ اور محققین کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ غالب نے کب قیام آگرہ مستقلاً ترک کیا۔

دوسرا حل یہ ہے کہ غور کیا جائے کہ غالب کی ولادت مسلمہ تاریخ پیدائش سے چند سال پیشتر تو نہیں۔ لہذا

؎۱ اسی کے پیش نظر مقالۂ ہذا میں اوپر لکھا گیا ہے کہ غالب کے آگرہ کی مستقل سکونت ترک کرنے کی تاریخ ۱۸۱۷ء سے بہت قریب ہونی چاہیے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

ظاہر ہے کہ شیخ صاحب کا وہ مفہوم نہیں جو فاروقی صاحب نے لیا ہے۔ چونکہ تذکرہ مطبوعہ نہیں کہ تاریخ طباعت کا تعین ہو سکے۔ اس لیے وہ تاریخ کتابت چاہتے ہیں، ممنون و عاشق کی کہی ہوئی تاریخیں نہیں۔ اگر یہ معلوم ہو سکتا کہ یہ تذکرہ کس سن میں کاتب نے تحریر کیا تھا تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی کہ مندرجہ واقعات اس سن سے قبل کے ہیں۔ نواب اعظم الدولہ کے متذکرہ بیان سے یہ مدعا حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ان سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی اس لیے ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لیے گئے ہوں۔" چنانچہ غالب ایک فارسی رقعے میں جو نواب مصطفیٰ خاں بہادر کے نام ہے مرزا احمد بیگ خاں تپاں کی بابت لکھتے ہیں کہ "ہنگامی کہ من بہ کلکتہ بودم چوں از من شنود کہ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور تخلص تذکرۂ ریختہ گویاں انشاء می کند جزوی از نتائج طبع خود بمن می دہد تا چوں بہ دہلی رسم بہ نامہ گرد آور یعنی نواب میر محمد خاں سرور رسد ہم۔ من ہم چناں می کنم و چوں اعظم الدولہ بدیدن من می آید آں سفینہ پیش می کشم و پیام آشنامی گزارم" (کلیات نثر غالب صفحہ ۱۰۹-۱۱۰)

اس خط سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب اعظم الدولہ سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی بلکہ یہ بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ تذکرۂ سرور کے قلمی نسخہ میں نواب صاحب موصوف کا بیان متذکرہ صدر "ایں نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ ہجری صورت اختتام پذیرفت" شاید کوئی خاص معنی نہیں رکھتا جبکہ اس تاریخ کے بائیس تیئس برس کے بعد بھی وہ اپنے تذکرے کے لیے مواد فراہم کرنے میں مشغول نظر آتے ہیں۔

یہاں غالب کے سن ولادت کے مآخذ کا جائزہ لینا اور اس کے متعلق داخلی اور خارجی شواہد پر تبصرہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔

حالی رقم طراز ہیں کہ "مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ، شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے" (یادگار غالب)

حالی کے بعد کے محققین نے بھی غالب کی یہی تاریخ ولادت تسلیم کی ہے۔ اس کے مآخذ خود غالب کے بیانات ہیں جن سے صراحتاً یا کنایتاً یہ تاریخ مستنبط ہوتی ہے۔ سب سے پہلا بیان وہ ہے جو خاتمہ دیوان فارسی کے تحت کلیات نثر میں ملتا ہے[1]

"...... از روزی کہ شمارہ سنین عمر از احاد فرا ترک رفعت و رشتہ حساب زحمت یاز دہمیں گرہ بخود برگرفت، اندیشہ در رو ارو گام فراخ برداشت و گریوہ و مغاک باد بہ سخن بیمودن آغاز نہاد تا امروز کہ از ہجرت خاتم الانبیا علیہ التحیۃ والثنا یک ہزار و دو صد و پنجاہ و سہ سال گذشتہ و رصد نگار طالع من باندازہ خرامش پیک آسمانی در مشاہدۂ آثار سال چہل و یکم است ہنوز شخص اندیشہ تیخمہ ایں جام و افلاطون ایں خم است۔ رباعی۔

غالب چو ز تار سانی فرجام نصیب — ہم بیم عدو دارم و ہم ذوق حبیب
تاریخ ولادت از عالم قدس — ہم شورش شوق آمد و ہم لفظ غریب

کیست تا از من پرسد و اگر نا پرسیدہ گویم در دلش فرود آید کہ دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہا روی دادہ ......"[2]

یہ تحریر ۱۲۵۳ ہجری مطابق ۳۸-۱۸۳۷ء کی ہے۔ اس میں "شورش شوق" اور "غریب" سے تاریخ ولادت (۱۲۱۲ھ) بھی نکالی ہے۔ اس کے بعد غالب کے اردو اور فارسی مکتوبات میں متعدد جگہ ان کا سن پیدائش مذکور ہے۔ چنانچہ ایک تو وہ لطیفہ ہے۔ جہاں انھوں نے صاحب عالم مارہروی کی تاریخ ولادت "تاریخ" (۱۲۱۱ ہجری) کے مقابلے میں اپنی

---

[1] کلیات نثر غالب مطبوعہ ۱۸۶۸ء صفحات ۶۸-۶۷

[2] کلیات نثر غالب میں جو "دیباچہ دیوان فارسی" اور "خاتمہ دیوان فارسی" مرقوم ہیں یہ وہ ہیں جو غالب نے اپنے دیوان فارسی موسومہ "میخانۂ آرزو" کے لیے لکھے تھے۔ یہی دیباچہ اور خاتمہ انھوں نے اپنی کلیات نظم مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں بھی شامل کیے۔ البتہ مذکورہ اقتباس میں امتداد زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے انھوں نے "یک ہزار و دو صد و پنجاہ و سہ" کو کلیات نظم (۱۸۶۳ء) میں "یک ہزار و دو صد و ہفتاد و ہشت" سے اور "آثار سال چہل و یکم" کو "آثار سال شصت و ششم" سے تبدیل کر دیا۔ اس اقتباس میں آگے مذکور ہے کہ "دریں سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہا روی دادہ" یہاں انھیں "سی سال" کو "پنجاہ و پنج" بدلنے کا خیال نہ رہا اور موجودہ صورت میں "سی سال" بے معنی ہو کر رہ گیا۔

پیدائش کی تاریخ "تاریخا" قرار دی ہے اور دوسرا ان کا وہ خط[1] ہے جس میں نواب علاؤالدین احمد کو ۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں :-

"...ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں' چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ ہجری میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا......"

یہاں سن کے ساتھ ماہ و تاریخ کا بھی ذکر ہے[2]

اس سلسلے میں سب سے اہم کڑی وہ تحریر ہے جو ان کے کلیات نظم مطبوعہ ۱۸۶۳ء کے صفحہ ۱۹۰ پر ان کے زائچہ طالع کے اوپر بطور عنوان مرقوم ہے یعنی "زائچہ طالع ولادت سعادت مطالع جناب غالب مدظلہ العالی کہ بوقت شب چار گھڑی پیش از طلوع صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۲ھ مطابق آغاز ۱۷۹۸ء عیسوی روی دادہ" اس میں پیدائش کے سن و ماہ و تاریخ کے ساتھ دن اور وقت بھی مذکور ہے[3]

اب اس مسئلہ کا دوسرا پہلو ملاحظہ کرنا چاہیئے۔ غالب کی تاریخ ولادت کی تائید میں غالب کے بیان کے علاوہ کوئی ایسی معاصرانہ شہادت نہیں ملتی جس کا ماخذ خود غالب کا بیان نہ ہو البتہ ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے مذکورہ تاریخ پیدائش کی صحت میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں :

(۱) مولانا مہر غالب کی تاریخ پیدائش تحریر کرنے کے بعد ذیل کا حاشیہ لکھتے ہیں :

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی ولادت "بوقت شب چار گھڑی پیش از طلوع صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۲ھ مطابق آغاز ۱۷۹۸ء ہوئی" حساب کے مطابق ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی عیسوی تاریخ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء تھی۔ نیز اس دن یکشنبہ نہ تھا بلکہ چہارشنبہ تھا۔ یعنی غالب نے وقت اور قمری تاریخ درست لکھی لیکن دن اور عیسوی تاریخ کی غلطی ظاہر ہے[4]

(۲) یادگار غالب میں حالی نے لکھا ہے " خود مرزا غالب کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے۔ ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ حاشیہ میں مرقوم ہے کہ مرزا کے اشعار ان کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں نے میر تقی کو دکھائے تھے[5]

حالی کے اس بیان پر بحث کرتے ہوئے مولانا مہر جو لکھتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حسام الدین حیدر خاں عمر میں غالب

---

[1] خطوط غالب از مہیش پرشاد صفحہ ۳۲۷

[2] مالک رام نے تصریح کی ہے کہ ان کا ماخذ یہی خط ہے (ذکر غالب طبع سوم صفحہ ۲۳)

[3] حالی نے "یادگار غالب" میں اور اکرام نے "آثار غالب" میں غالب کی ولادت کے ضمن میں "شب ہشتم رجب" تحریر کیا ہے لیکن اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ چونکہ "شب" کا ذکر اور کہیں پایا نہیں جاتا اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا ماخذ یہی تحریر ہے۔ مولانا مہر نے "غالب" میں اسی تحریر سے استفادہ کیا ہے اور تشریح کر دی ہے۔ (غالب طبع چہارم صفحہ ۱)

[4] "غالب" از مہر طبع چہارم صفحہ ۱

[5] مہر کا مضمون "میرزا غالب اور میر تقی" مطبوعہ ماہ نو کراچی' فروری ۱۹۴۹ء

سے بہت بڑے تھے ان کے دو بیٹے مظفر الدولہ اور حسین مرزا غالب کے ہم عمر اور عزیز دوست تھے۔ یہ کیوں کر مان لیا جائے کہ جب غالب گیارہ برس کے تھے اور آگرہ میں رہتے تھے تو نواب حسام الدین حیدر خاں نے آگرہ جا کر ان کے منتخب اشعار لیے اور لکھنؤ پہنچ کر انھیں میر تقی کے ملاحظہ میں پیش کیا؟ یہ معلوم ہے کہ غالب کی ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی اور میر تقی نے ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ کو وفات پائی۔ گویا میر کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف ۱۳ برس ایک مہینہ اور بارہ دن کی تھی۔ اگر گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کر دیئے تو سمجھنا چاہیئے کہ ان کی شاعری کا آغاز ۱۲۲۳ھ میں ہوا۔ یہ معلوم ہے کہ میر عمر کے آخری حصہ میں ضعف بصر اور بعض دوسرے امراض مزمنہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ غرض جس بزرگ کی زندگی کے آخری دو تین برس وارفتگی حواس اور ہجوم امراض میں گذرے اس کے متعلق یہ روایت کیوں کر قابل یقین ہو سکتی ہے کہ آگرہ سے گیارہ بارہ برس کے بچے کے اشعار اس کے ملاحظے کے لیے لکھنؤ بھیجے گئے اس نے اشعار دیکھے اور وہ رائے ظاہر کی جو حالی نے لکھی ہے ص۱

(۳) نواب اعظم الدولہ کے معاصرانہ تذکرہ عمدۂ منتخبہ میں جو ۱۸۰۹ء میں تکمیل پا چکا تھا غالب کے متعلق لکھا ہے کہ جوان قابل یار باش و درد مند ہیں، ہمیشہ خوش معاشی سے بسر کرتے رہے ہیں اور راقم کے ساتھ رابطۂ یک جہتی مستحکم رکھتے ہیں ص۲

(۴) غالب نے خداداد خاں صاحب و ولی داد خاں صاحب ساہوکاران آگرہ کے نام ایک خط لکھا تھا جس پر تاریخ سی ام جنوری ۱۸۰۴ء مرقوم ہے۔ اس خط کا عکس پہلے علی گڑھ میگزین غالب نمبر میں اور پھر آج کل دہلی فروری ۱۹۵۲ء میں شایع ہوا۔ صرف عرشی صاحب کا یہ خیال ہے کہ یہ خط غالب کی تحریر نہیں بعض دوسرے محققین کی رائے میں ۱۸۰۴ء غالباً ۱۸۲۴ء کے عوض لکھا گیا ہے۔ مالک رام کے خیال میں یہ خط ۱۸۴۰ء کا ہے ص۳ مہر اور مالک رام نے اس خط کو مستند مانتے ہوئے (سوائے تاریخ کتابت کے) اس کے مضامین سے استفادہ کیا ہے ص۴

(۵) خواجہ حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے "کہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جبکہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے" مولانا مہر اس بیان پر جیں بجبیں ہو کر لکھتے ہیں "اگر خواجہ صاحب نے سفر کلکتہ کے متعلق ۱۸۳۰ء والے بیان ہی کو صحیح قرار دے لیا تھا تو اس حالت میں غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ تینتیس برس کی ماننی چاہیئے تھی اور سیر و سوانح کی کتاب میں تینتیس برس کی مدت کو کچھ کم چالیس برس سے تعبیر کرنا محتاط طریق بیان نہیں" ص۶

(باقی آئندہ)

ص۱ مہر کا مضمون "میرزا غالب اور میر تقی" مطبوعہ ماہ نو کراچی، فروری ۱۹۴۹ء

ص۲ اس مضمون میں اوپر اس مسئلہ پر کسی قدر بحث کی جا چکی ہے۔

ص۳ ذکر غالب تیسرا ایڈیشن، صفحہ ۲۰ حاشیہ

ص۴ ذکر غالب" تیسرا ایڈیشن صفحہ ۲۰ اور" غالب "از مہر طبع چہارم صفحہ ۲۰

ص۵ اردوئے معلی ۱۸۹۹ء صفحہ ۲۹۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں، "۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا"

ص۶ غالب از مہر طبع چہارم صفحہ ۹۳

رباعیات اکبر

از: سلام سندیلوی

حالی کی طرح اکبر بھی اس دور کی پیداوار ہیں جو ایک نئی آواز، نئے شعور اور نئے ماحول سے ہم آغوش ہو رہا تھا یہ آواز، یہ شعور اور یہ ماحول اکبر کو قطعاً پسند نہیں تھا۔ اس ماحول سے ان کو سخت نفرت تھی۔ حالی اور اکبر میں یہی فرق تھا حالی نے اپنے کو زمانے کے نئے مزاج کے مطابق ڈھال لیا اور ہر نئی چیز کو لبیک کہا۔ اکبر نے ہر نئی چیز کو ٹھکرا یا اور قدامت پرستی کا دامن مضبوطی سے پکڑا اکبر کو نئی فضا میں بے دینی، گمرہی اور پستی کے زہریلے جراثیم اڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان جراثیم کو مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم نے جنم دیا تھا۔ مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں مشرقیت کے محل بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اکبر نے اپنے کلام سے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔ اس طرح سے اکبر کا کلام ایک باندھ کا کام کرتا ہے۔

اکبر کی خدمات کو ڈاکٹر عابد حسین نے "اقبال کا تصور خودی" میں سراہا ہے۔ ساتھ ہی اکبر اور حالی کے نظریات کا فرق بھی بتایا ہے۔ ان کا قول ہے کہ

"دو آدمیوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی مایوسی کو توڑا ایک حالی نے سوز دروں کے لہجے میں ملت اسلامی کو اس کے عروج و زوال کی داستان سنا کر گزشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ کر دی اور موجودہ پستی و نکبت پر غیرت دلائی، دوسرے اکبر جس نے ظرافت کے پیرایے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کیا اور ان کی نظر میں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کر دیا۔ حالی جدت پسند تھے۔ قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے۔ اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اکبر قدامت پسند تھے نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے۔ اور پرانی روشنی کی ہر چیز کو سراہتے تھے۔ مگر دونوں نے مسلمانوں میں عزت قومی کے جذبے کو ابھارا۔ اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دیا اور یاس کی تاریکی میں امید کی ایک جھلک دکھائی ہے[۱]"

اکبر کی قدامت پسندی میں کوئی کلام نہیں ہے۔ انھوں نے چند لمحات کے لیے بھی کبھی یہ نہیں سوچا کہ مغربی تہذیب و تعلیم ملک کے لیے کچھ مفید بھی ہو سکتی ہے۔ ان کی اس تنگ نظری کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور نے "تنقیدی اشارے" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"اکبر نیک نیت بھی تھے اور تھوڑے تنگ نظر بھی طوفان آتے دیکھا تو سمجھے کہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ یہ بھول گئے کہ اس کے اثر سے زمین زرخیز بھی ہو جائے گی[۲]"

اگرچہ اکبر کے زمانے میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو نئی تہذیب کا مبلغ تھا مگر اکبر کی پیشانی پر کسی کی مخالفت سے

۱؎ اقبال کا تصور خودی، ڈاکٹر عابد حسین ص۵ اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۶۲ء، ۲؎ تنقیدی اشارے، پروفیسر آل احمد سرور ص۹۴

شکن تک نہ آئی۔ اور وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے مزاحیہ شاعری کی طرف رجوع کیا۔ کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ چاہے جتنی مفید بات کہی جائے اگر اصلاحی رنگ میں پیش کی جائے گی تو بے اثر ثابت ہوگی۔ اسی لیے انھوں نے طنز و مزاح کا حربہ استعمال کیا۔ اور طعنوں سے کام نکالنا چاہا۔ دراصل اسی ظریفانہ رنگ نے اکبر کو حیات جاوداں بخشی۔ ان کی ظرافت کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"اکبر کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی ظرافت تھی۔ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا۔ ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ قوم نے ان کو جانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ملک نے ان کو پہچانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں"۔[1]

روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دینا اور مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دینا اکبر کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور یہی خصوصیت اکبر کی بیشتر رباعیات میں بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے ظاہر میں تو اپنی رباعیات سے ہنسنے اور ہنسانے کا کام لیا ہے مگر ان کے ان قہقہوں میں روتی ہوئی قوم کی سسکیاں اور کراہتے ہوئے ملک کے آنسو موجود ہیں۔ دراصل ہر رباعی میں ان کا کوئی خاص پیام ہوتا ہے۔ جس کو وہ ظرافت کے رنگ میں پیش کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے ایک جگہ خود اشارہ کیا ہے

سرد موسم تھا، ہوائیں چل رہی تھیں برف بار　　　　شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اکبر کی ظرافت کے لحاف میں ہمیشہ شاہد معنی روپوش رہتا ہے۔ ان کی ہر رباعی کسی نہ کسی اصلاحی مقصد کی تکمیل کرتی ہے ان کی رباعیات کی سب سے بڑی خوبی ان کی مقصدیت ہے۔ مگر یہ مقصدیت کبھی شعریت پر غالب نہیں آتی۔ اس لیے اکبر انداز بیان کی شگفتگی کو بھی برقرار رکھتے ہیں یہ اکبر کے آرٹ کا کمال ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ حالی پر فوقیت رکھتے ہیں۔

درحقیقت انگریزی تہذیب سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا طبقہ نوجوانوں کا تھا اس لیے اکبر نے نوجوانوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ کیونکہ وہی قومی تعمیر کی بنیاد ہیں۔ ایک رباعی میں انھوں نے پردہ کی موافقت کی ہے۔ مشرقی تہذیب میں پردہ کا رواج ہے اس لیے عشق بازی علی الاعلان نہیں ہوسکتی ہے۔ مغربی تہذیب میں پردہ ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔ اس لیے اس زمانے میں نوجوانوں کو انگریزی پریوں سے دل بہلانے کا موقع مکمل طور سے ملتا تھا۔ اسی پردہ کے سلسلے میں اکبر نے مس اور میڈم وغیرہ انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں اور اس طرح رباعیات میں ظرافت کا رنگ بھر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی ملاحظہ ہو۔

ہیں لیمپ عزیز، شمع بیگانہ ہے　　　　جلتا ہے چراغ سے جو فرزانہ ہے
سب کی ہے مسوں کے روئے روشن پہ نگاہ　　　　جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

انگریزی تہذیب کے اثر سے انگریزی میں خطوط لکھنے یا اردو خطوط میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کا عام رواج ہو چلا تھا جیسے ڈیر فادر، ڈیر سسٹر وغیرہ لوگ بے تکلفی سے لکھتے تھے اور بولتے بھی تھے۔ اکبر نے اس رواج پر طنز کیا ہے۔

---

[1] "اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں" از مولانا عبدالماجد دریابادی مطبوعہ ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۲

چٹھی اس مس کی ہے کہ یہ چارہ ہے دل جوش مفاخرت سے بے قابو ہے
اسپی پری اور مجھ کو پیارا لکھے القاب میں دیکھئے ڈیر کلو ہے

ایک رباعی میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے اور تحصیل علم سے قبل شادی کرنے کی شدید مخالفت کی ہے۔ اس رباعی کے تینوں قافیے انگریزی کے ہیں، اس لیے رباعی نہایت لطف دے رہی ہے۔

علم و حکمت میں ہو اگر خواہش فہم سرکار کی نوکری کو ہرگز نہ کر ایم
شادی نہ کر اپنی قبل تحصیل علوم بت ہو کہ پری ہو خواہ وہ ہو کوئی میم

اکبر اس طالب علم کی بھی مذمت کرتے ہیں جو اپنے ماں باپ کی گاڑھی کمائی کو پھونکنے کے لیے لندن جا رہا ہے۔

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر بنیا بیٹھا ہے موٹھ موٹھی لے کر
سودا اس کو ہے جو سدھارا لندن وہ دولت و جنس گھر میں جو تھی لے کر

اکبر کی نگاہ میں لندن جانا اتنا معیوب نہ تھا جتنا کہ وہاں جا کر اپنے دل کو آسودہ کر لینا تھا۔ اسی لیے وہ لندن جانے والوں کو اس بات کی نصیحت کرتے ہیں کہ جب وہ وہاں سے واپس آئیں تو دل صحیح و سلامت لائیں۔

رسوا وہ ہوا جو مست پیمانہ ہوا لپکا جو سا یہ پردہ دیوانہ ہوا
انگلینڈ سے اپنا دل جو لایا نہ درست محروم ادھر، اُدھر سے بیگانہ ہوا

مندرجہ ذیل رباعی میں انگریزی خورد و نوش اور لباس کا مضحکہ اڑایا ہے۔

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی چاہی تھی شئے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

انگریزی معاشرت کا اثر امراء و روسا پر اس حد تک پڑا کہ وہ اپنے نوکروں کو بھی انگریزی میں گفتگو کرنے کی تلقین کرنے لگے۔

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کا فرماں
مقصود نہیں میاں کی سی عقل و تمیز اس نکتے کو کیا وہ سمجھیں جو ہیں ناداں

اکبر کے عہد میں مغربی تہذیب نے صرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ پر اثر نہیں ڈالا بلکہ علما اور مشرقی و اسلامی تہذیب کے علم بردار بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اکبر نے اس کایا پلٹ کو اپنی مندرجہ ذیل رباعی میں ظاہر کیا ہے۔

وحشت نئی روشنی سے آخر کو ہٹی فکر روزی میں شیخ کی طبع ڈٹی
کرکٹ، جمناسٹک ٹرینگ کالج مولانا سیکھتے ہیں بالفعل نئی

مولانا اکبر اور سرسید ہم عصر تھے مگر ہم خیال نہ تھے۔ اکبر مغربیت کے سخت مخالف اور سرسید مغربیت کے مکمل حامی۔ اسی تصادم کی بنا پر اکبر کے قلم سے مختلف رباعیاں سرسید کے خلاف نکل گئیں۔ اکبر نے سرسید کی ذات پر چندہ کی وصولیابی، علی گڑھ، انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب پر متعدد وار کیے ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

سید کی طرف تو چندہ لانے کی ہے پیخ اور شیخ کے گھر میں بجگانے کی ہے پیخ
بہتر ہے یہی کہ بت پرستی کیجئے گو اس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے پیخ

اعزاز سلف کے مٹتے جاتے ہیں نشاں — اگلے سے خیالات ہند میں اب وہ کہاں
سید بننا ہو تو بنو سرسید — ہونا ہے جو خواں تو بنو انگریزی خواں
سنتا نہیں کچھ کسی سے بڑھ بڑھ کے سوا — کہتا نہیں کوئی کچھ بھی پڑھ پڑھ کے سوا
پڑھنے کا نہ ٹھیک اصول پڑھنے کی نہ راہ — اور قبلہ کوئی نہیں علی گڑھ کے سوا

الغرض اس زمانے میں ایک جماعت سرسید کی تھی جو ترقی پسند تھی۔ دوسری طرف اکبر کا ایک حلقہ تھا جو رجعت پسند تھا۔ ان دونوں کے متضاد خیالات سے بعض وقت عوام گھبرا جاتے تھے۔ اور ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا کہ کون صحیح راستے پر ہے۔ اور کون قابل تقلید ہے اکبر نے اسی کشمکش و تذبذب کے عالم کی ایک تصویر کھینچی ہے۔

ہر اک کو خوش کروں میں کیوں کر صاحب — اپنی ہی طرف بلاتے ہیں ہر صاحب
آسائش عمر کے لیے ہے کافی — بی بی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب

غرض کہ اکبر کی نگاہ میں مغربی تعلیم و تہذیب کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس کے علاوہ مغربی تعلیم کے حصول کا مقصد بھی غلط تھا۔ کیونکہ ہر اک حصول تعلیم کے بعد نوکری کی خواہش کرتا تھا۔ اور ہر اک کو نوکری سے فیض یاب ہونا بہت مشکل تھا۔ اکبر کی دوربین نگاہوں نے اس بات کو تاڑ لیا اور انھوں نے نوجوانوں کو سمجھایا کہ نس سرکاری نوکری ہی حصول معاش کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ زراعت اور صنعت و حرفت کے ذریعہ بھی روزی کمائی جا سکتی ہے۔ اس طرح سے انھوں نے ہندوستان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا۔

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی — ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ — عزت کے لیے کافی ہے اے دل نیکی

اکبر نے ان لوگوں کو بھی نشانۂ طنز بنایا جو "پدرم سلطان بود" کے مرض میں گرفتار تھے اور ان کو سمجھایا کہ عظمت دیرینہ کو ہر وقت رٹنا بیکار ہے بلکہ اب زمینوں کو جوتو اور روزی کماؤ۔

اے جد بزرگ کے نواسو پوتو — تزئین کو تہ کرو، زمینیں جوتو
کیا رٹتے ہو اپنی ہسٹری کو ہر وقت — اللہ مدد کرے گا دل سے ہو تو

مختصر یہ ہے کہ اکبر نے ایک ماہر حکیم کی حیثیت سے اہل قوم کے مرض کی تشخیص کی اور ساتھ ہی اس کا علاج بھی بتایا اس طرح سے انھوں نے قوم کو پستی سے ابھارنے کی کوشش کی۔

اکبر کی رباعیات اپنے دور کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی رباعیات میں ہم کو غدر کے بعد کا ہندوستان صاف نظر آتا ہے۔ انگریز ایک تاجر قوم تھی۔ حکومت کرنے کو بھی وہ تجارت ہی سمجھتی تھی۔ اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ مال و دولت کو سمندر پار کھینچنے میں مصروف تھی۔ انگریزوں کی یہ ذہنیت اور پالیسی ہندوستان کے لیے بہت مضر تھی۔ جس سے ہندوستان روز بروز کنگال ہوتا جا رہا تھا۔ اکبر کی ایک رباعی انگریزوں کی اسی نوچ کھسوٹ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

یہ بات غلط کہ دار الاسلام ہے ہند — یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش — یورپ کے لیے بس ایک گودام ہے ہند

اکبر کے عہد میں اگرچہ مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کو کچھ حقوق قانون سازی مل گئے تھے۔ مگر پھر بھی گورنر

اور گورنر کو کافی اختیارات خصوصی حاصل تھے۔ اس لیے وہ ہندوستان کے بل کو رد کرسکتے تھے اور اس طرح سے ان کی آزادی کو مجروح کرسکتے تھے۔ اکبر نے ایک رباعی میں اس جھوٹی آزادی کے رخ سے نقاب اٹھائی ہے۔

ہمدرد ہوں سب یہ لطف آبادی ہے — ہم سایہ بھی ہو شریک تب شادی ہے
تسکین ہے جب کہ ہو خدا پر تکیہ — قانون بنا سکیں، تب آزادی ہے

اکبر کی رباعیات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو ہندی کے جھگڑے کی بنیاد ان کے دور میں پڑ چکی تھی۔ اکبر دراصل ایک ہندوستانی زبان کے قائل تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں نہ عربی رائج ہوسکتی ہے اور نہ سنسکرت بلکہ ایسی زبان مقبول ہوسکتی ہے جس میں عربی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ نہ ہوں۔ انھیں نظریات کا عکس بعد میں ہم کو گاندھی جی کے یہاں زیادہ واضح طور پر ملتا ہے۔ اکبر نے مندرجہ ذیل چند رباعیات میں اردو ہندی کے مسائل پر طنزیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ پہلے ایک رباعی ملاحظہ کیجئے اور "نسخۂ گاؤ زبان" کی ترکیب کی داد دیجئے۔

وہ لطف اب ہندو و مسلمان میں کہاں — اغیار ان پہ گزرتے ہیں اب خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا، زباں کی کبھی بحث — ہے سخت مضر یہ "نسخۂ گاؤ زباں"

دو رباعیاں اور اسی مضمون کی پیش ہیں:

اردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں — اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امراؤ القیس بنیں — پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

سرحد پہ باغیوں کو سکھ ماریں گے — گردن اردو کی رام رکھ ماریں گے
قائم رہے البشر کا یہ پرچہ — ہم بھی مضمون کوئی لکھ ماریں گے

اکبر کی رباعیات سے اردو کی مخالفت کے علاوہ عربی کی بے قدری بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس مضمون کی دو رباعیاں درج ذیل ہیں:

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں — اور تیرے بیان کی دلآویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بے خوف — لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

تم نے جو سنا صحیح ہے ہاں صاحب — عربی سے گریز کرتے ہیں خاں صاحب
سچ کہتے ہیں کہ ہم کو اس سے کیا کام — ہیں کیمپ میں تو خانساماں صاحب

مغربی تہذیب نے لباس، خوراک، گفتگو اور طرز معاشرت کو ہی نہیں بدلا بلکہ مذہبی خیالات میں بھی انقلاب برپا کردیا۔ سائنس کی ترقی نے خدا کے وجود پر بھی حملہ کیا۔ ایک طبقہ کا خیال تھا کہ خدا کا وجود ہی نہیں ہے بلکہ دنیا اپنی تخلیق و تنظیم کے لیے نیچر کی زیر منت ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ روح کی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ مختلف عناصر کے توازن سے جسم برقرار رہتا ہے۔ اور جب یہ توازن ختم ہو جاتا ہے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو نیچریہ کہا جاتا تھا۔ اکبر نیچریوں کے سخت خلاف تھے۔ کیونکہ ان کے عقائد اسلام کے منافی تھے۔ اکبر نے نیچریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اور ان کا مضحکہ اڑایا۔

مندرجہ ذیل دو رباعیوں میں اکبر کی صدائے بازگشت موجود ہے۔

عینک آنکھوں میں، منہ میں مصنوعی دانت   نیچر نے سکھا کے کر دیا جسم کو تانت
اب تک ہے مگر وہی ہوس حضرت کی   ہے طول امل ہنوز شیطان کی آنت
پردے کا کیا ہے خود اڑنگا پیدا   خود ہم نے کیا ازار اور انگا پیدا
کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے   نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

نیچریوں کی آواز کو دبانے کے لیے اکبر نے اسلام کی اشاعت و تبلیغ کی کوشش کی۔ وہ کسی صورت میں بھی اسلام کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ ان کی اسلام پرستی کا ایک واقعہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"جولائی ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں نیاز حاصل ہوا (آہ کہ وہی ملاقات آخری تھی) اپنے اوپر وقت کے اکثر نوجوانوں کی طرح نشۂ تحریک خلافت اور ترک موالات کا سوار تھا۔ مہاتما گاندھی کی روحانیت تقدس کے تذکرے ورد زبان تھے۔ بات بات پر ان کی بزرگی اور روحانیت کا حوالہ۔ دل میں آرزو کہ حضرت اکبر پر بھی یہ جادو چل جائے اور وہ بھی نان کوآپریشن کی کمیٹی کے باضابطہ ممبر بن جائیں۔ حضرت نے دو چار منٹ توجہ کی۔ اس کے بعد یک بیک پوچھ بیٹھے "اچھا صاحب! آپ کے بیان سے تو معلوم ہوا کہ گاندھی جی بڑے موحد اور روحانیت کے علمبردار ہیں۔ اپنی کمیٹی میں انھوں نے داخلے کی پہلی شرط لا الٰہ الا اللہ تو ضرور رکھی ہوگی؟" میں ساری چوکڑی بھول گیا۔ مری ہوئی آواز سے جواب دیا کہ "جی نہیں ایسا تو نہیں"۔ بولے "بس تو مجھے بھی آگے کچھ پوچھنا نہیں۔ ایک سیاسی انجمن ہے جیسی اور بہت سی انجمنیں آج کل ہیں"

الغرض اکبر کو سب سے زیادہ عزیز اسلام تھا۔ وہ مذہبیت کو وطنیت پر ترجیح دیتے تھے۔ اور اسلامی اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل رباعی میں انھوں نے قرآن مجید کی برتری کا ذکر کیا ہے۔

حق نے جنھیں دی ہے فہم قرآن مجید   ہونے کے نہیں وہ پیر گردوں کے مرید
بدلے سو رنگ انقلاب دنیا   ہر حال میں ان کو ہے خدا سے امید

ایک رباعی میں ماہ صیام کی عظمت کو واضح کیا ہے۔

ہے ماہ صیام کی نہایت تعریف   بے شبہ یہ ہے مہذب و پاک و لطیف
نااہلوں کو یہ کبھی لگاتا نہیں منہ   کہتے ہیں اسی سبب سے رمضان کو شریف

اسلام کے خلاف کوئی قدم اٹھانا عقل کی کمی کی دلیل ہے

اسلام ہی کو بس اپنی ملت سمجھو   بیگانہ روش میں اپنی ذلت سمجھو
جو اس کے خلاف رائے رکھے اکبر   خاموش رہو، سمجھ کی قلت سمجھو

غرض کہ اکبر ہر حال میں اسلام کی موافقت کرتے تھے۔ انھوں نے اسلامی عقائد کو قائم رکھنے میں مسلمانوں کی کافی مدد کی۔ اور ان کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

اکبر نے یہ بھی محسوس کیا کہ مغربی تہذیب کے بھوت نے ہندوستانیوں کے اخلاق پر بھی برا اثر ڈالا۔ لہٰذا انھوں نے ان کے اخلاق و عادات کو بھی سنوارنے کی کوشش کی۔ اور مختلف رباعیوں کے ذریعہ انھوں نے اپنا پیغام ان

تک پہنچایا۔ انھوں نے ہم کو اپنی نیت درست کرنے اور دل صاف رکھنے کی تلقین کی اور یہ بھی بتایا کہ اگرچہ غصہ کرنا بہت برا ہے مگر دل میں کینہ رکھنا اس سے بھی زیادہ برا ہے ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

اونچا نیت کا اپنی زینا رکھنا — احباب سے صاف اپنا سینا رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر — لیکن ہے شدید عیب کینا رکھنا

ایک رباعی میں رشوت، عیاشی، خوشامد اور گستاخی کی مذمت کی ہے۔

رشوت ہے گلوئے نیک نامی کا چھرا — عیاش ہے بدی کے پہیئے کا دھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بری — گستاخ مگر خوشامدی سے بھی برا

دیگر مصلحین کی طرح اکبر بھی اس خیال کے حامی نظر آتے ہیں کہ اگر گناہگار اپنے دل میں شرمندہ ہو جائے تو پھر شان کریمی کے حوصلے دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ اگر گناہ بھی کرے اور پھر بے حیا بھی بن جائے تو اس سے بڑا اور کوئی عصیاں کار نہیں ہو سکتا۔

آزاد سے دین کا گرفتار اچھا — شرمندہ ہو دل میں وہ گنہ گار اچھا
ہر چند کہ زور بھی ہے اک خصلت بد — واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

ایک اور رباعی میں وہ حرص و ہوس کی مذمت کرتے ہیں۔

تھا سر میں کمال وہ سلطان بنا — تھا دل میں جمال وہ مسلمان بنا
لذت طلبی سے نفس رندی پہ جھکا — تھا پیٹ بہت حریص شیطان بنا

مندرجہ ذیل رباعی میں مال و دولت کی تحقیر کی گئی ہے اور علم کی سربلندی ظاہر کی گئی ہے۔

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش — ذلت ہے دراصل جاہ و شوکت کی تلاش
اکبر تو سرور طبع کو علم میں ڈھونڈھ — محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

اکبر نے اپنی رباعیات کے ذریعہ شراب نوشی کی بھی مذمت کی ہے اور اس کے مضر نتائج سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل دو رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

پاکیزگیٔ نفس کی دشمن مے ہے — انسان کو خراب کرنے والی شے ہے
شیطان کی ہے پرائیوٹ سکریٹری — مسلم اور اس کو منہ لگائے ہے ہے

جو عقل کھری تھی کی وہ کھوٹی اس نے — اچھے اچھوں سے چھینی روٹی اس نے
مستوں پہ شراب فاقہ مستی لائی — پتلون کو کر دیا لنگوٹی اس نے

اکبر والدین کی عزت کرنا اولاد کا سب سے بڑا فرض سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نگاہ میں ایسی تمام کتابیں قابل ضبطی ہیں جن کو پڑھ کر بیٹا اپنے باپ کو "خبطی" سمجھنے لگے۔ اسی چیز کی تلقین انھوں نے ایک رباعی میں بھی کی ہے۔

کہہ دو کہ میں خوش ہوں رکھوں گر آپ کو خوش — بجلی چمکاؤں اور کروں بھاپ کو خوش
سیکھوں ہر علم و فن مگر فرض یہ ہے — ہر حال میں رکھوں اپنے ماں باپ کو خوش

اکبر نے ہندو مسلم اتحاد کی بھی کوشش کی۔ انھوں نے بتایا کہ آپس میں موجوں کی طرح اگر کبھی لڑ بیٹھو تو کوئی

ہرج نہیں۔ مگر انگریزوں کے مقابلہ میں ہمیشہ ایک ہو جاؤ۔

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی　　　اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر، پانی بن جاؤ　　　موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

غرضیکہ اکبر کی اخلاقی رباعیاں ہندوستانیوں کے کردار کو بلند کرنے میں کافی معین و مددگار ثابت ہوئیں۔ ان رباعیوں میں خاص بات یہ ہے کہ ناصحانہ ہوتے ہوئے بھی شاعرانہ ہیں۔ اسی لیے دل کو گرویدہ کر لیتی ہیں۔

اخلاقی رباعیات کے علاوہ اکبر نے متصوفانہ و فلسفیانہ رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا قول ہے کہ اکبر کا جب جوشِ شباب ٹھنڈا ہو گیا تو انھوں نے ظرافت کے زعفران زار کو ترک کر دیا اور معرفت کے چمن زار کی سیر میں محو ہو گئے۔ ان کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

"جب تک خود جوان رہے، شوخ طبعی بھی جوان رہی۔ عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اس کی جگہ آفتابِ معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی اور صبحِ پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں۔ اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔ جمالِ حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشمِ بصیرت کو محوِ نظارہ بنایا۔ سوزشِ عشق نے سینہ کو گرمایا۔ ذوقِ عرفاں نے دل کو تڑپایا اور معرفت کی شعاعیں ان کے مطلعِ قلب سے اس نورانیت کے ساتھ پھوٹیں کہ تماشائیوں کی آنکھوں کو قریب تھا کہ چکا چوند لگ جائے۔"[1]

یہ عبارت اکبر کی رباعیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ اگرچہ اکبر کے یہاں معرفت کی رباعیاں بہت کم ہیں مگر جو کچھ بھی ہیں وہ ایامِ پیری کی تخلیق معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان میں ان کی عارفانہ غزلوں کی طرح "حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ" موجود ہے۔ ان کی دو متصوفانہ رباعیاں ملاحظہ کیجیے۔

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیا پایا　　　غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن　　　کم تھیں بخدا کہ جنھیں بینا پایا

کھولی ہے زباں خوش بیانی کے لیے　　　اٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لیے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبر　　　نظارۂ شاہدِ معانی کے لیے

اگرچہ متصوفانہ رباعیاں اکبر نے کم کہی ہیں۔ مگر ان کے یہاں فلسفیانہ رباعیوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ یہ رباعیاں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی پر کہی گئی ہیں اور ان میں انسانوں کو آسودگیٔ دنیا سے دور کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

فرمانِ اجل کا آگیا وقت صدور　　　ہوں گے کوئی دم میں شاملِ اہلِ قبور
دیکھیں منکر نکیر کیا کہتے ہیں　　　یاں سب مجھے کہتے ہیں خداوند و حضور

مسکین گدا ہو یا بادشاہ ذی جاہ　　　بیماری و موت سے ہے کہاں کس کو پناہ
آ ہی جاتا ہے زندگی میں اک وقت　　　کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ

---

[1] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں از مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۱۲

ادارۂ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن